

حدیث کے اصلاحی مَضامین

جلد نہم

حاکموں کی اطاعت کے احکام

اصحاب اقتدار کا لوگوں سے نرمی کرنا

حیا اور شرم

منصف حکمران۔ طلب عہدہ کی ممانعت

وعدہ وفا کی۔ خوش کلامی

راز کی حفاظت

وعظ کے آداب۔ سنجیدگی اور وقار

نیک کاموں کی عادت باقی رکھنا

مبارک بادی دینا۔ استخارہ اور مشورہ

مہمان کا اکرام۔ رخصتی کے موقع پر نصیحت و دعا

کھانے پینے کے آداب

اچھے کام میں داہنی طرف سے ابتدا کرنا

عید کی نماز کے لیے مختلف راستوں
سے آنا جانا

إفادہ

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد رضا خان پوری صاحب دابر کاہم

شیخ الحدیث، صدر مفتی جامعہ اسلامیہ نعیمیہ الدین ڈابھیل

ناشر

مکتبہ محمودیہ

محمود نگر، ڈابھیل، گجرات

حدیث کے اصلاحی مضامین

جلد نہم

افادات

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خاں پوری دامت برکاتہم

شیخ الحدیث و صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل

ناشر

مکتبہ محمودیہ، محمود نگر، ڈابھیل

تفصیلات

- کتاب کا نام:..... حدیث کے اصلاحی مضامین (جلد نہم)
- افادات:..... حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم
- بہ اہتمام:..... خدام حضرت اقدس دامت برکاتہم
- صفحات:..... ۴۹۶
- ناشر:..... مکتبہ محمودی، محمود نگر، ڈابھیل، گجرات

ملنے کے پتے

- شعبہ فیض محمود، سورت 99988,31838
- ادارۃ الصدیق ڈابھیل، 9913319190
- مفتی سلیمان شاہوی (دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر) 88666,21229
- مکتبہ انور (مفتی عبدالقیوم راجکوٹی) جامعہ ڈابھیل 99246,93470
- کتب خانہ نعیمیہ دیوبند 97562,02118
- مکتبۃ الاتحاد دیوبند 9897296985
- حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب مدظلہ (دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ کشمیر)
- مدینہ ایجنسی جھانپا بازار سورت
- قاضی، نزد مرکز مسجد رانی تالاب سورت
- اسلامی کتب خانہ چوک بازار سورت

اجمالی فہرست مضامین جلد نہم

نمبر شمار	عناوین	صفحہ
۱	بَابُ أَمْرِ وَلَاةِ الْأُمُورِ بِالرِّفْقِ بِرِ عَايَاهُمْ وَنَصِيحَتِهِمْ، وَالشَّفَقَةِ عَلَيْهِمْ وَالنَّهْيِ عَنْ غَشِّهِمْ، وَالتَّشْدِيدِ عَلَيْهِمْ وَإِهْمَالِ مَصَالِحِهِمْ وَالْعَفْلَةِ عَنْهُمْ وَعَنْ حَوَائِجِهِمْ اصحابِ اقتدار اپنے ماتحتوں کے ساتھ نرمی اختیار کریں، ان کی خیر خواہی اور ان کے ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ کریں، ان کو دھوکہ نہ دیں، بے جا سختی نہ کریں، ان کی مصالح سے پہلو تہی نہ کریں	۳۷
۲	الوالی العادل انصاف سے پیش آنے والا حکمران	۶۱
۳	وَجُوبُ طَاعَةِ وَلَاةِ الْأُمُورِ فِي غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ حاکموں کی اطاعت کے احکام	۷۵
۴	النَّهْيُ عَنْ سُؤَالِ الْأِمَارَةِ وَإِخْتِيَارِ تَرْكِ الْوَلَايَاتِ إِذَا لَمْ يَتَّعَيْنَ عَلَيْهِ عہدہ طلب کرنے کی ممانعت اور اختیاری صورت میں عہدہ قبول نہ کرنا	۱۱۳
۵	حَثُّ السُّلْطَانِ وَالْقَاضِي وَغَيْرِهِمَا مِنْ وَلَاةِ الْأُمُورِ عَلَى إِتِّخَاذِ وَزِيرٍ صَالِحٍ وَتَحْذِيرِهِمْ مِنْ قَرْنَاءِ الشُّوْءِ بادشاہ اور قاضی وغیرہ حکمرانوں کو اپنے لئے صالح مشیر رکھنے کی ترغیب اور برے ساتھیوں سے بچنے کی تاکید	۱۲۵

۶	کتاب الادب باب الحیاء وفضله والحث علی التخلق به شرم کا بیان اور اس کی فضیلت اور شرم اختیار کرنے کی ترغیب	۱۳۵
۷	باب حفظ السر کسی کے بھید کی حفاظت کرنا، رازداری سے کام لینا	۱۴۵
۸	الوفاء بالعہد وإنجاز الوعد عہد و پیمان اور وعدہ پورا کرنا	۱۶۵
۹	الامر فی المحافظة علی ما اعتاده من الخیر نیک کاموں کی عادت کو باقی رکھنا	۱۸۷
۱۰	استحباب طیب الکلام وطلاقة الوجه عند اللقاء خوش کلامی اور ملاقات کے وقت چہرے کو مسکراتا ہوا رکھنے کا پسندیدہ ہونا	۲۰۵
۱۱	استحباب بیان الکلام وإيضاحه للمخاطب تکریرہ لیفہم إذا لم یفہم إلا بذلك بات کو مخاطب کے سامنے صاف اور واضح انداز میں کرنا اور اگر بغیر تکرار کے نہ سمجھتا ہو، تو مکرر کرنا	۲۱۷
۱۲	باب إصغاء المجلس لحديث جليسه الذي ليس بحرام وإستنصات العالم والواعظ حاضري مجلسه اپنے ہم نشین کی بات کی طرف دھیان دینا اور عالم و واعظ کا حاضرین کو اپنی بات سنانے کے لئے خاموش کرنا	۲۲۲
۱۳	باب الوعظ والاقتصاد فيه وعظ ونصيحت میں میانہ روی	۲۲۵

۲۳۵	باب الوقار والسکينة سنجیدگی اور اطمینان کی عادت	۱۴
۲۳۷	باب إكرام الضيف مہمان کا اعزاز و اکرام کرنا	۱۵
۲۷۹	باب وداع صاحب و وصيته عند فراقه للسفر وغيره والدعاء له وطلب الدعاء مِنْهُ اپنے کسی ساتھی اور دوست کو رخصت کرتے وقت نصیحت کرنا اس کے لیے دعا کرنا اور اس سے دعا کی درخواست کرنا	۱۶
۲۹۵	الاستِخارة والمشاورة استخارہ اور مشورہ کرنا	۱۷
۳۲۵	استحباب الذهاب الى العيد الخ عید کی نماز کے لیے مختلف راستوں سے آنا جانا	۱۸
۳۳۵	استحباب تقديم اليمين في كل ما هو من باب التكريم ہر اچھے کام میں دائیں طرف سے شروع کرنا مستحب ہے	۱۹
۳۵۱	كتاب آداب الطعام کھانے کے آداب	۲۰
۴۵۹	باب أدب الشرب پینے کے آداب	۲۱

تفصیلی فہرست مضامین جلد نہم

نمبر شمار	عناوین	صفحہ
	تقاریظ	۳۱
	اداریہ	۳۶

بَابُ أَمْرِ وَلَاةِ الْأُمُورِ بِالرَّفْقِ بِرِعَايَاهُمْ وَنَصِيحَتِهِمْ، وَالشَّفَقَةِ عَلَيْهِمْ وَالنَّهْيِ عَنْ غَشِّهِمْ، وَالتَّشْدِيدِ عَلَيْهِمْ وَإِهْمَالِ مَصَالِحِهِمْ وَالْغَفْلَةِ عَنْهُمْ وَعَنْ حَوَائِجِهِمْ
 اصحاب اقتدار اپنے ماتحتوں کے ساتھ نرمی اختیار کریں، ان کی خیر خواہی اور ان کے ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ کریں، ان کو دھوکہ نہ دیں، بے جا سختی نہ کریں، ان کی مصالح سے پہلو تہی نہ کریں

۱	اسلام نام ہی حقوق کی ادائیگی کا ہے	۴۳
۲	حکمرانوں کا پورا سلسلہ	۴۳
۳	جیتے جی جنت کا نمونہ بنانے کا نسخہ	۴۵
۴	عنوان کا خلاصہ	۴۶
۵	بے توجہی اور غفلت سے منع کیا گیا	۴۷
۶	مصلحت اور حاجت کا فرق	۴۷
۷	ایک مثال	۴۸
۸	موت کی گھڑی میں رعایا کی اصلاح کی فکر	۴۹
۹	جامع آیت	۴۹
۱۰	آیت کا اثر پوری قوم پر	۴۹

۵۱	میرا ایمان پختہ ہو گیا	۱۱
۵۲	عدل	۱۲
۵۲	احسان	۱۳
۵۲	إِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ	۱۴
۵۳	فحش، منکر، سرکشی	۱۵
۵۳	ہر ایک ذمہ دار ہے	۱۶
۵۴	ماتحتوں کے بدخواہ کی سزا	۱۷
۵۴	جن کے رتبے ہیں سوا.....	۱۸
۵۸	جیسا برتاؤ؛ ویسی دعا	۱۹
۵۹	خرد کا نام جنوں رکھ دیا.....	۲۰
۵۹	حاکموں سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرو	۲۱
۶۱	جہاں کہیں فتنے رونما ہوتے ہیں	۲۲
۶۱	آج کل کی سب سے بڑی گڑبڑ	۲۳
۶۲	وہاں دیر تو ہے، اندھیر نہیں	۲۴
۶۳	بدترین ذمہ دار کی نشانی	۲۵
۶۳	ایسے حاکم کی طرف اللہ تعالیٰ توجہ نہیں فرمائیں گے	۲۶

الوالی العادل

انصاف سے پیش آنے والا حکمران

۶۷	باب کا عنوان	۲۷
۶۸	دشمنوں کے معاملہ میں بھی انصاف	۲۸

۶۸	سایہ دار سات گروہ..... پہلا گروہ	۲۹
۷۰	دوسرا گروہ	۳۰
۷۰	تیسرا گروہ	۳۱
۷۱	چوتھا گروہ	۳۲
۷۱	پانچواں گروہ	۳۳
۷۱	چھٹا گروہ	۳۴
۷۲	ساتواں گروہ	۳۵
۷۳	نور کے منبروں پر ہوں گے	۳۶
۷۴	بہترین اور بدترین حکمرانوں کی علامت	۳۷
۷۶	نظام سلطنت کے بقاء کی اہمیت	۳۸
۷۷	تین جنتی	۳۹

وَجُوبُ طَاعَةِ وَلَائَةِ الْأُمُورِ فِي غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ

حاکموں کی اطاعت کے احکام (۱)

۸۱	حاکم کے حکم دینے کی وجہ سے جائز کام واجب ہو جاتا ہے	۴۰
۸۱	ماں باپ کے لیے اہم نصیحت	۴۱
۸۲	سربراہ کی بات ماننے کے حدود	۴۲
۸۲	نافرمانی میں فرمانبرداری نہیں	۴۳
۸۳	مؤمن کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کی مثال	۴۴
۸۴	پریشان ہونے کی ضرورت نہیں	۴۵
۸۵	ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ.....	۴۶

۸۶	جاہلیت کی موت مرے گا	۴۷
۸۷	ہر حکمران کی بات سنو اور مانو؛ چاہے.....	۴۸
۸۷	ہر حال میں مانو	۴۹
۸۸	تو پھر تم میں اور اجنبی میں فرق ہی کیا؟	۵۰

وَجُوبُ طَاعَةِ وَلَا آثَارِ الْأُمُورِ فِي غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ

حاکموں کی اطاعت کے احکام (۲)

۹۳	بنیادی اصول	۵۱
۹۴	اُمتِ محمدیہ کی فتنوں سے سلامتی	۵۲
۹۷	فتنہ کسے کہتے ہیں؟	۵۳
۹۸	”فتنہ“ کی تشریح بہ زبانِ نبی	۵۴
۹۹	امیر کی اطاعت ضروری ہے	۵۵
۱۰۰	اُن کا بوجھ اُن پر؛ تمہارا تم پر	۵۶
۱۰۱	شریعت کا اصول	۵۷
۱۰۳	اصل علاج یہ نہیں	۵۸
۱۰۴	شفا بخش علاج	۵۹
۱۰۵	خلاصہ علاج	۶۰
۱۰۶	یہ سودے بازی نہیں ہے	۶۱
۱۰۶	ایسے زمانہ میں کیا کرے؟	۶۲

وُجُوبُ طَاعَةِ وَلَائِ الْأُمُورِ فِي غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ

حاکموں کی اطاعت کے احکام (۳)

۶۲	جس نے امیر کی اطاعت کی.....	۱۱۱
۶۳	ایک اہم اصول	۱۱۳
۶۴	جاہلیت کی موت	۱۱۳
۶۵	جس نے حاکم کی توہین کی	۱۱۴

الَّتِي عَنْ سُؤَالِ الْإِمَارَةِ وَاخْتِيَارِ تَرْكِ الْوَلَايَاتِ إِذَا لَمْ يَتَّعَيْنَ عَلَيْهِ

عہدہ طلب کرنے کی ممانعت اور اختیاری صورت میں عہدہ قبول نہ کرنا

۶۶	اسلامی اصول	۱۱۹
۶۷	باصلاحیت آدمی کے لیے دوراستے ہیں	۱۲۰
۶۸	اسلام اس نظریہ کا قائل ہی نہیں	۱۲۱
۶۹	آخرت کا گھر کس کے لیے؟	۱۲۱
۷۰	اگر مدد چاہتے ہو تو عہدہ مت مانگو	۱۲۲
۷۱	عمدہ مثال	۱۲۳
۷۲	بہتر کام کو انجام دینے کے لیے قسم توڑنا	۱۲۴
۷۳	کسی دو آدمیوں کے اوپر بھی امیر مت بننا	۱۲۵
۷۴	امارت سببِ ندامت	۱۲۵

حُكُّ السُّلْطَانِ وَالْقَاضِي وَغَيْرِهِمَا مِنْ وُلاَةِ الْأُمُورِ عَلَى اتِّخَاذِ وَزِيرٍ صَالِحٍ
وَتَحْذِيرِهِمْ مِنْ قَرَئَاءِ الشُّوْءِ
بادشاہ اور قاضی وغیرہ حکمرانوں کو اپنے لئے صالح مشیر رکھنے کی ترغیب اور برے
ساتھیوں سے بچنے کی تاکید

۱۳۱	صالح آدمی کو مشیر بناؤ	۷۵
۱۳۱	دنیا کی دوستیاں قیامت کی دشمنیاں	۷۶
۱۳۲	قاعدہ کلیہ	۷۷
۱۳۳	مصاحبین سے بدگمانیاں مت کرو	۷۸
۱۳۵	اللہ تعالیٰ صاحب اختیار کے ساتھ جب بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں	۷۹

النہی عن تولیة الامارة والقضاء وغیرہما من الولايات لمن
سألها أو حرص عليها فعرض بها
امارت وقضاء وغیرہ عہدے، ان کا مطالبہ کرنے والوں یا لالچ رکھنے والوں کو دینے
کی ممانعت

۱۳۶	جو کوئی عہدہ مانگے یا اس کی لالچ رکھے اس کو عہدہ نہیں دیتے	۸۰

کتاب الامار

باب الحیاء وفضله والحث علی التخلق به
شرم کا بیان اور اس کی فضیلت اور شرم اختیار کرنے کی ترغیب

۱۴۱	حیاء اور شرم کسے کہتے ہیں؟	۸۱

۱۴۲	شرم تو ایمان کا حصہ ہے	۸۲
۱۴۳	ایمان کی ایک شاخ	۸۳
۱۴۴	حقیقی حیا اور شرم	۸۴
۱۴۵	بے حیائی کی منظم سازش	۸۵
۱۴۷	حضور اکرم ﷺ کی شرم و حیا	۸۶

باب حفظ السر

کسی کے بھید کی حفاظت کرنا، رازداری سے کام لینا

۱۵۱	رازداری کے اصول	۸۷
۱۵۱	صریح راز	۸۸
۱۵۲	راز کا انداز	۸۹
۱۵۲	یہ بھی راز ہے	۹۰
۱۵۳	حضور ﷺ کے رازداری کی رازداری	۹۱
۱۵۶	راز امانت ہوتے ہیں	۹۲
۱۵۶	عہد کے بارے میں سوال ہوگا	۹۳
۱۵۶	اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں بدترین شخص	۹۴
۱۵۷	رازداری کا ایک واقعہ	۹۵
۱۶۰	نکاح کا پیغام لڑکے والے بھیجیں یا لڑکی والے؟	۹۶
۱۶۲	فوائد حدیث	۹۷
۱۶۳	حضور ﷺ کے مرض الوفا کا واقعہ	۹۸
۱۶۶	بعض بھید ہمیشہ کے لیے بھید ہوتے ہیں	۹۹

الوفاء بالعہد وإنجاز الوعد عہد و پیمان اور وعدہ پورا کرنا

۱۰۰	عہد و پیمان کو پورا کرنے کا اہتمام	۱۷۱
۱۰۱	کامیاب اہل ایمان کی نشانیوں میں سے یہ ہے	۱۷۲
۱۰۲	قرآنی ایک اصول	۱۷۲
۱۰۳	زندگی کے معاملات عہد و پیمان ہیں	۱۷۳
۱۰۴	یہ بڑی خطرناک چیز ہے	۱۷۴
۱۰۵	معاشرہ میں ہونے والی کوتاہیاں	۱۷۴
۱۰۶	منافع کی نشانی اور ہمارا معاشرہ	۱۷۶
۱۰۷	باطن کچھ، اور ظاہر کچھ	۱۷۸
۱۰۸	منافع کی چار علامتیں	۱۷۸
۱۰۹	وعدہ پورا کرنے کا عجیب و غریب واقعہ	۱۷۹
۱۱۰	عہد پورا کرنے کا بے مثال نمونہ	۱۸۱
۱۱۱	آج کے حالات کا موازنہ	۱۸۳
۱۱۲	حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انصاف کی ایک جھلک	۱۸۴
۱۱۳	آج ضرورت ہے اس بات کی.....	۱۸۵
۱۱۴	وعدہ پورا کرنے کا ایک اور نمونہ	۱۸۶
۱۱۵	یہ عملی عہد و پیمان ہے	۱۸۸

الامرفی الحافظة علی ما اعتادہ من الخیر نیک کاموں کی عادت کو باقی رکھنا

۱۱۶	معمولات کی پابندی کیجئے	۱۹۳

۱۹۳	اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو معمول چھوڑنے نہیں دیا	۱۱۷
۱۹۵	اس سے نقصان پہنچتا ہے	۱۱۸
۱۹۵	معمولات کا ایک ادب یہ بھی ہے	۱۱۹
۱۹۶	اس آیت کے ساتھ ایک ظلم ہوا	۱۲۰
۱۹۶	اس آیت صحیح مطلب	۱۲۱
۱۹۷	نعمتوں کے سلسلے اس وقت تک بند نہیں ہوتے	۱۲۲
۱۹۹	حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سوال	۱۲۳
۱۹۹	تم اس پگلی بوڑھیا کی طرح نہ بنو	۱۲۴
۲۰۰	معمولات چھوڑنے سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے	۱۲۵
۲۰۱	رہبانیت کیسے شروع ہوئی	۱۲۶
۲۰۲	اسلام میں رہبانیت نہیں ہے	۱۲۷
۲۰۲	دینداروں کے لیے بھی یہی وقت آزمائش کا ہوتا ہے	۱۲۸
۲۰۴	اے عبد اللہ! فلاں جیسے مت بنو	۱۲۹
۲۰۵	مداومت کا نتیجہ	۱۳۰
۲۰۵	ساری خرابی یہیں سے آتی ہے	۱۳۱
۲۰۶	ذکر میں دل نہیں لگتا، پریشان کیوں ہوتے ہو؟	۱۳۲
۲۰۷	خلاصہ باب	۱۳۳

استحباب طیب الکلام وطلاقة الوجه عند اللقاء

خوش کلامی اور ملاقات کے وقت چہرے کو مسکراتا ہوا رکھنے کا پسندیدہ ہونا

۲۱۱	ہر کس وناکس کو مسخر کرنے والا نسخہ	۱۳۴

۲۱۲	یہ آپ ﷺ کا طریقہ ہے	۱۳۵
۲۱۳	آدمی کے لئے بڑی بری چیز ہے	۱۳۶
۲۱۳	میں اپنے اخلاق کیوں خراب کروں!	۱۳۷
۲۱۴	یہ ہمارا مزاج ہے	۱۳۸
۲۱۴	وہ اخلاق کس کام کے!	۱۳۹
۲۱۶	اپنے بازوؤں کو جھکائے رکھنا	۱۴۰
۲۱۷	اگر آپ بدخلق اور سخت دل ہوتے	۱۴۱
۲۱۸	کم از کم اسی کی عادت ڈال لی جائے	۱۴۲
۲۱۹	اس پر بھی صدقہ کا ثواب	۱۴۳
۲۱۹	ہنستے چہرے سے ملاقات بھی نیکی ہے	۱۴۴

استحباب بیان الکلام وإيضاحه للمخاطب وتكريره ليفهم إذا لم يفهم إلا بذلك
بات کو مخاطب کے سامنے صاف اور واضح انداز میں کرنا اور اگر بغیر تکرار کے نہ سمجھتا ہو تو مکرر کرنا

۲۲۳	گفتگو کے آداب	۱۴۵
۲۲۳	کلام کا ایک ادب	۱۴۶
۲۲۴	آپ ﷺ کا کلام بھی ایسا ہی ہوتا تھا	۱۴۷

باب إصغاء المجلس لحديث جليسه الذي ليس بحرام

وإستنصات العالم والواعظ حاضري مجلسه

اپنے ہم نشین کی بات کی طرف دھیان دینا اور عالم و واعظ کا حاضریں کو اپنی بات
سنانے کے لئے خاموش کرنا

۲۲۷	مجلس کے آداب	۱۴۸

۱۴۹	لوگوں کو خاموش کر دو	۲۲۸

باب الوعظ والاقتصاد فیہ

وعظ و نصیحت میں میانہ روی

۱۵۰	شریعت کی ایک اہم تعلیم	۲۳۱
۱۵۱	حکمت تربیت یہی ہے	۲۳۲
۱۵۲	فقاہت کی علامت	۲۳۳
۱۵۳	وعظ مختصر، مگر پُر اثر	۲۳۴
۱۵۴	کاہن نہیں تو عامل	۲۳۶
۱۵۵	غلط عقیدہ	۲۳۷
۱۵۶	اگر ایسا کھٹکا پیدا ہو گیا	۲۳۷

باب الوقار والسکینۃ

سنجیدگی اور اطمینان کی عادت

۱۵۷	زندگی کا اہم ادب	۲۴۱
۱۵۸	ہر معاملہ میں تواضع	۲۴۲
۱۵۹	رحمن کے بندوں کی صفت	۲۴۳
۱۶۰	وقار کا ایک پہلو یہ بھی ہے	۲۴۴

الندب الی اتیان الصلاة والعلم ونحوہما من العبادات بالسکینۃ والوقار

نماز اور علمی مجالس میں سکون و وقار سے آنا

۱۶۱	وقار کو چھوڑنے کی اجازت نہیں	۲۴۶

۱۶۲	تقویٰ کی علامت	۲۴۶
۱۶۳	دوڑنا، وقار اور سنجیدگی کے خلاف ہے	۲۴۷
۱۶۴	حاصل شدہ کے لیے بھاگنا لا حاصل	۲۴۸
۱۶۵	جلد بازی نیکی نہیں ہے	۲۴۹

باب اکرام الضیف مہمان کا اعزاز و اکرام کرنا

۱۶۶	حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عمل	۲۵۳
۱۶۷	تب مجوسی ایمان لے آیا	۲۵۴
۱۶۸	آیت سے مستفاد احکام	۲۵۵
۱۶۹	حضرت لوط علیہ السلام کا مہمانوں کا اکرام	۲۵۶
۱۷۰	مہمان نوازی: ایمان کا تقاضہ	۲۵۶
۱۷۱	مہمان اور میزبان کے لیے ہدایات	۲۵۸

استحباب التبشیر والتہذئة بالخير کسی کو مبارک باد دینے کا پسندیدہ ہونا

۱۷۲	مبارک باد دینا پسندیدہ ہے	۲۶۳
۱۷۳	اگر اس پر عمل ہو جائے!	۲۶۳
۱۷۴	اسلامی معاشرے کو باہم جوڑنے والی	۲۶۴
۱۷۵	ہمارے آداب اہل یورپ نے اپنا لئے	۲۶۴
۱۷۶	اپنا بنانے کا گر	۲۶۵
۱۷۷	قرآنی دلائل	۲۶۶

۲۶۸	ایک موتی کے مکان کی خوشخبری	۱۷۸
۲۶۹	حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مناقب	۱۷۹
۲۷۰	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارتیں سنائیں	۱۸۰
۲۷۴	میرے پہلے سفر حج کا واقعہ	۱۸۱
۲۷۶	یقین سے کلمہ پڑھنے پر جنت کی بشارت	۱۸۲
۲۷۹	مختصر آپ بیتی از حضرت عمر بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ	۱۸۳

باب وداع صاحب و وصیتہ عند فرارہ للسفر وغیرہ

والدعاء لہ وطلب الدعاء مِنہ

اپنے کسی ساتھی اور دوست کو رخصت کرتے وقت نصیحت کرنا اس کے

لیے دعا کرنا اور اس سے دعا کی درخواست کرنا

۲۸۵	جدائی کے موقع کے چار آداب	۱۸۴
۲۸۶	دو پیغمبروں کی اپنے بیٹوں کو وصیت	۱۸۵
۲۸۸	بیان واقعہ کا نرالا انداز	۱۸۶
۲۸۹	خاندان نبوت	۱۸۷
۲۹۰	فکر کیا کرے؟	۱۸۸
۲۹۱	آج کے دور کی تصویر کشی	۱۸۹
۲۹۳	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت	۱۹۰
۲۹۴	مناسب حال معاملہ اور نصیحت	۱۹۱
۲۹۶	اپنی دعاؤں میں ہمیں مت بھولیو	۱۹۲
۲۹۷	کسی کو رخصت کرتے وقت کی دعائیں	۱۹۳

الاستِخارة والمشاورة استخارہ اور مشورہ کرنا

۱۹۴	مشورہ کی اہمیت	۳۰۱
۱۹۵	حضورِ اکرم ﷺ کبھی اپنی رائے چھوڑ دیتے تھے	۳۰۱
۱۹۶	غزوہٴ اُحد کے مشورہ کا منظر	۳۰۲
۱۹۷	غزوہٴ بدر کا مختصر خاکہ	۳۰۳
۱۹۸	افسوس کا تدارک	۳۰۴
۱۹۹	غزوہٴ اُحد کا مشورہ	۳۰۴
۲۰۰	اس کو مشورہ کہتے ہیں	۳۰۶
۲۰۱	اس کا نام مشورہ نہیں	۳۰۷
۲۰۲	مشورہ کے بعد کیا ہوا فیصلہ نہ بدلے	۳۰۷
۲۰۳	عورتوں سے مشورہ	۳۰۸
۲۰۴	آدم برسرِ مطلب	۳۱۰
۲۰۵	صدیق کی رائے صادق	۳۱۱
۲۰۶	استخارہ کی تعلیم اور اس کی اہمیت	۳۱۳
۲۰۷	اہتمامِ استخارہ کی وجہ	۳۱۴
۲۰۸	کہانت	۳۱۴
۲۰۹	زجر	۳۱۵
۲۱۰	تَطْيَر اور طَّيْرہ	۳۱۶
۲۱۱	اِسْتِقْسَام بِالْاَزْزَام	۳۱۶

۳۱۸	ایک غلط رواج	۲۱۲
۳۱۸	استخارہ کی لغوی تحقیق	۲۱۳
۳۱۹	استخارہ کن کاموں میں کیا جائے؟	۲۱۴
۳۲۰	منون استخارہ	۲۱۵
۳۲۱	دعا کے آداب	۲۱۶
۳۲۱	یہ سب حمد و ثناء ہی ہے	۲۱۷
۳۲۲	دعاے استخارہ کی تشریح	۲۱۸
۳۲۲	جب جیب کٹی	۲۱۹
۳۲۳	دعاے استخارہ کی روح	۲۲۰
۳۲۵	دعا کا عجیب و غریب انداز	۲۲۱
۳۲۶	استخارہ کے بعد پتہ کیسے چلے؟	۲۲۲
۳۲۷	استخارہ کتنے دن؟	۲۲۳
۳۲۷	دوسرے سے استخارہ کرایا جاسکتا ہے؟	۲۲۴

استحباب الذهاب الی العید الخ عید کی نماز کے لیے مختلف راستوں سے آنا جانا

۳۳۱	باب کا عنوان	۲۲۵
۳۳۱	قیامت کی کچھری کے گواہ	۲۲۶
۳۳۲	تطبیق آیات	۲۲۷
۳۳۳	زمین و آسمان روتے ہیں	۲۲۸
۳۳۴	زیادہ گواہ تیار کرلو	۲۲۹

۳۳۴	عمل چھوٹا سا؛ فضیلت بڑی	۲۳۰
۳۳۵	یہ اہتمام صرف عید میں نہیں	۲۳۱
۳۳۶	آپ ﷺ کی ذات نمونہ ہے	۲۳۲
۳۳۶	نبی کریم ﷺ کا طرزِ عمل	۲۳۳

استحباب تقدیم الیمین فی کل ماہو من باب التکریم

ہر اچھے کام میں دائیں طرف سے شروع کرنا مستحب ہے

۳۴۱	عنوان کی وضاحت	۲۳۴
۳۴۲	حضورِ اکرم ﷺ کی پسند	۲۳۵
۳۴۲	حضورِ اکرم ﷺ کا عمل	۲۳۶
۳۴۲	یہی تو کمالِ نبی ہے	۲۳۷
۳۴۶	آج کل کی بد تہذیبی کی بڑی وجہ	۲۳۸
۳۴۷	تربیت کا مؤثر ترین طریقہ	۲۳۹
۳۴۸	شان کے خلاف نہیں	۲۴۰
۳۴۸	آپ بیتی	۲۴۱
۳۴۹	تربیت کا اصل طریقہ	۲۴۲
۳۴۹	عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ہماری کوتاہیاں	۲۴۳
۳۵۱	ان چیزوں کی طرف بھی توجہ ہو	۲۴۴

کتاب آداب الطعام

کھانے کے آداب

باب التسمية في أوله والحمد في آخره

کھانے سے پہلے بسم اللہ اور کھانے کے بعد الحمد للہ پڑھنا

۲۴۵	آداب زندگی	۳۵۷
۲۴۶	کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کا فائدہ	۳۵۷
۲۴۷	کیا ہم نے کبھی سوچا؟	۳۵۹
۲۴۸	ایک ہی نعمت میں کئی نعمتیں	۳۶۱
۲۴۹	مضطرب کو روزی پہنچانے کا سرکاری انتظام	۳۶۲
۲۵۰	دوسروں کے نام سے کھلاتے ہیں	۳۶۴
۲۵۱	چیونٹی کی روزی کا منظر	۳۶۴
۲۵۲	روزی کا انتظام؛ ہمارے بس کی بات نہیں	۳۶۵
۲۵۳	حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت	۳۶۶
۲۵۴	شروع میں نہیں تو جب یاد آئے	۳۶۸
۲۵۵	حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کا معمول	۳۶۹
۲۵۶	حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل	۳۷۰
۲۵۷	مسنون دعائیں؛ حفاظت کا ذریعہ	۳۷۱
۲۵۸	شیطان کی اثرات کا توڑ	۳۷۱
۲۵۹	خود ہی موقع دیں؛ پھر پریشان ہوں!	۳۷۵

۳۷۷	شیطان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں	۲۶۰
۳۷۸	فوائد حدیث	۲۶۱
۳۷۹	شروع میں نہیں؛ تو اخیر میں سہی	۲۶۲
۳۸۱	بسم اللہ کی برکت	۲۶۳
۳۸۲	دستر خوان اٹھانے کی دعا	۲۶۴
۳۸۳	گناہوں کی معافی کی بشارت	۲۶۵

باب لا یعیب الطعام واستحباب مدحہ

کھانے میں عیب نہ نکالے اور اس کی خوبی بیان کرنے کا پسندیدہ ہونا

۳۸۷	کچھ بھی بے کار نہیں قدرت کے کارخانہ میں	۲۶۶
۳۸۸	مکھی کی پیدائش کا ایک فائدہ	۲۶۷
۳۸۹	بچھو کے ذریعہ جان بچائی	۲۶۸
۳۹۰	پاخانہ کے کیڑے سے علاج!	۲۶۹
۳۹۱	یہ کس مرض کی دوا ہے؟	۲۷۰
۳۹۱	کھانے کی نعمت، اور ہمارا طرز عمل	۲۷۱
۳۹۲	نعمت کی قدردانی کا عجیب واقعہ	۲۷۲
۳۹۳	جنوں کی خوراک کا نظام	۲۷۳
۳۹۴	ایک گھونٹ پانی کی قدر	۲۷۴
۳۹۵	عبرت انگیز واقعہ	۲۷۵
۳۹۷	اکابر کی کڑھن	۲۷۶
۳۹۸	پسند و ناپسند کے معاملہ میں معتدل تعلیم	۲۷۷

۳۹۸	سرکہ بہت اچھا سالن ہے	۲۷۸
۳۹۹	سال بھر کا اناج بھر لینا توکل کے خلاف نہیں	۲۷۹
۳۹۹	کھانے کی اور بنانے والے کی تعریف	۲۸۰
۴۰۰	حضرت ڈاکٹر عارفی رحمہ اللہ کا واقعہ	۲۸۱
۴۰۱	معرض کا حال مکھی جیسا	۲۸۲
۴۰۲	اس کا احسان اور ہمارا بخل!	۲۸۳
۴۰۳	بیوی کے مزاج سے واقفیت رکھنا سنت طریقہ ہے	۲۸۴
۴۰۳	ہم اگر واقف نہیں تو بیوی کے مزاج سے!	۲۸۵

باب مَا يَقُولُهُ مِنْ حَضَرِ الطَّعَامِ وَهُوَ صَائِمٌ إِذَا لَمْ يَفْطِرْ

وَبَاب مَا يَقُولُهُ مَنْ دُعِيَ إِلَى طَعَامٍ فَتَبِعَهُ غَيْرَهُ

کسی کو کھانے کی دعوت دی گئی، اور کوئی دوسرا بھی اس کے ساتھ ہو گیا، تو وہ کیا کہے؟
دعوت میں حاضر ہونے والا اگر روزہ دار ہے تو کیا کہے؟

۴۰۷	دعوت قبول کرنا سنت ہے	۲۸۶
۴۰۸	طفیلی کے احکام	۲۸۷
۴۰۹	جہاں وہ برا ہے؛ وہاں یہ بھی برا ہے	۲۸۸
۴۰۹	گمراہ طفیلی کا قصہ	۲۸۹
۴۱۰	دعاء	۲۹۰

باب الْأَكْلِ مِنْ تَأْيِيلِيهِ وَوَعْظُهُ وَتَأْدِيبِهِ مِنْ يَسَىءِ أَكْلِهِ

اپنے سامنے سے کھانا اور خلافِ ادب کھانے والے کو نصیحت کرنا اور ادب سکھانا

۴۱۳	کھانے کے آداب کی نصیحت	۲۹۱

النَّهْيُ عَنِ الْقِرَانِ بَيْنَ ثَمَرَتَيْنِ وَنَحْوَهُمَا إِذَا أَكَلَ جَمَاعَةٌ إِلَّا بِإِذْنِ رَفَقَتِهِ
مجمع کے ساتھ کھاتے وقت کھجور وغیرہ دو، دو نہ لے

۴۱۷	ساتھ بیٹھ کر کھانے کے اہم آداب	۲۹۲
۴۲۰	مہذب گیر تعلیم	۲۹۳
۴۲۰	ترقی کاراز	۲۹۴
۴۲۲	شرعی قانون پر عمل کا ایک کافر کو فائدہ	۲۹۵
۴۲۲	معاملہ کتنا سنگین ہے	۲۹۶
۴۲۳	معمولی سی غفلت سے حرام کار تکاب	۲۹۷
۴۲۴	اہل یورپ کے یہاں اصول کی پابندی	۲۹۸
۴۲۵	علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کا بھیل میں	۲۹۹
۴۲۶	مشترک کاروبار کی بدظمی	۳۰۰
۴۲۷	حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا عمل	۳۰۱
۴۲۷	مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا وصیت نامہ	۳۰۲
۴۲۸	خلاصہ روایت	۳۰۳

بَابُ مَا يَقُولُهُ وَيَفْعَلُهُ مَنْ يَأْكُلُ وَلَا يَشْبَعُ

کھانے سے سیری نہیں ہوتی، کیا کرے؟

۴۲۹	الگ الگ کھانے کی نحوست	۳۰۴

الأمر بالأكل من جانب القصعة والنهي عن الأكل من وسطها
برتن کے ایک طرف سے کھانے کا حکم

۴۳۳	کھانے کا ایک اور ادب	۳۰۵
۴۳۲	برکت برتن کے بیچ میں اترتی ہے	۳۰۶

كراهية الأكل متكئاً

ٹیک لگا کر کھانے کا ناپسندیدہ ہونا

۴۳۴	کھانے کے لیے حضور اکرم ﷺ کی پسندیدہ بیٹھک	۳۰۷
۴۳۶	بیٹھک کا اصولی طریقہ	۳۰۸
۴۳۷	علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق	۳۰۹
۴۳۸	ٹیبیل کرسی پر کھانا کیسا ہے؟	۳۱۰
۴۳۹	حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طرز	۳۱۱

باب استحباب الأكل بثلاث أصابع واستحباب لعق الأصابع،
وكراهة مسحها قبل لعقها واستحباب لعق القصعة وأخذ اللقمة التي
تسقط منه وأكلها وجواز المسحه بعد اللعق بالساعد والقدم وغيرها

۴۴۰	کھانے کا ایک ادب: تین انگلیوں سے کھانا	۳۱۲
۴۴۱	چھوٹے چھوٹے لقمے لینا	۳۱۳
۴۴۱	انگلیاں چاٹ لینا	۳۱۴
۴۴۲	پرانا عیب: آج کا فیشن/لطیفہ	۳۱۵

۴۴۳	فیشن کا حال!	۳۱۶
۴۴۴	آنکھوں دیکھا واقعہ	۳۱۷
۴۴۴	یہ دل و دماغ میں نوٹ کر لو	۳۱۸
۴۴۵	ایک بزرگ کا عمل	۳۱۹
۴۴۶	پلیٹ صاف کرنے والے ادب کی تفصیل	۳۲۰
۴۴۷	ایک قصہ	۳۲۱
۴۴۸	انگلیاں چاٹنا اور چٹوانا	۳۲۲
۴۴۹	حصولِ مقاصد کا نام برکت ہے	۳۲۳
۴۵۱	حصولِ اسباب اصل نہیں	۳۲۴
۴۵۲	یہ بے برکتی نہیں تو اور کیا ہے؟	۳۲۵
۴۵۳	اگر برکت حاصل کرنا چاہتے ہو تو.....	۳۲۶
۴۵۳	لقمہ گر جائے تو اٹھا لو	۳۲۷
۴۵۵	حصولِ برکت کے لیے ان چیزوں کا اہتمام کرو	۳۲۸
۴۵۶	”وُضُوءٌ مِمَّا مَسَّتِ النَّارَ“ کا مسئلہ	۳۲۹

تکثیر الایدی علی الطعام

۴۵۸	دو کا کھانا تین کو، تین کا چار، چار کا آٹھ کو کافی ہو جائے گا	۳۳۰
۴۵۹	ہم کسے مہمان سمجھتے ہیں؟	۳۳۱
۴۶۰	نہایت عبرت آموز واقعہ	۳۳۲
۴۶۱	یہ بات تو دل میں بٹھا ہی لو	۳۳۳
۴۶۲	خلاصہ کلام	۳۳۴

باب اَدَبُ الشَّرْبِ

پینے کے آداب

وَاسْتِحْبَابُ التَّنَفُّسِ ثَلَاثًا خَارِجَ الْإِنَاءِ وَكَرَاهَةُ التَّنَفُّسِ فِي الْإِنَاءِ

وَاسْتِحْبَابُ إِدَارَةِ الْإِنَاءِ عَلَى الْإِيْمَنِ فَلَا يُمْنُ بَعْدَ الْمُبْتَدِءِ

۳۳۵	پینے کے آداب	۴۶۵
۳۳۶	نبی ارشاد اور نبی تحریم	۴۶۶
۳۳۷	میٹھے پانی کا عجیب و غریب قدرتی نظام	۴۶۷
۳۳۸	شکر گزار بندہ کی دعائیں	۴۶۹
۳۳۹	برتن میں سانس نہ لے	۴۷۰
۳۴۰	الْأَيْمَنَ فَلَا يُيْمَنُ	۴۷۰
۳۴۱	ایک مسئلہ	۴۷۳

كَرَاهَةُ الشَّرْبِ مِنْ فَمِ الْقُرْبَةِ وَنَحْوِهَا وَبَيَانُ أَنَّهُ كَرَاهَةُ تَنْزِيهِ لَا تَحْرِيمَ

۳۴۲	مشکیزہ اور بڑے برتن سے منہ لگا کر پینے کی ممانعت اور اس کی وجہ	۴۷۴
۳۴۳	حضور ﷺ نے مشکیزہ سے منہ لگا کر پینا	۴۷۶
۳۴۴	روایتوں میں تطبیق	۴۷۷

باب كَرَاهَةُ النَّفْخِ فِي الشَّرْبِ

۳۴۵	پینے کی چیز میں پھونک نہ مارے	۴۷۸

بَابُ بَيَانِ جَوَازِ الشَّرْبِ قَائِمًا وَبَيَانُ أَنَّ الْأَكْمَلَ وَالْأَفْضَلَ الشَّرْبُ قَاعِدًا

۳۴۶	کھڑے ہو کر پینے کی تفصیل	۴۸۰

۴۸۲	چکی کا پاٹ	۳۴۷
۴۸۳	زمزم کو کھڑے ہو کر پینے کی تفصیل	۳۴۸
۴۸۴	وضو کا بقیہ بھی کھڑے ہو کر پی سکتے ہیں	۳۴۹
۴۸۵	کھڑے ہو کر کھانا پینا؟	۳۵۰

استحباب کون ساقی القوم آخر ہم شرباً

۴۸۸	پلانے والا خود اخیر میں پئے	۳۵۱
۴۸۸	ایک واقعہ	۳۵۲

باب جواز الشرب من جميع الأواني الطاهرة غير الذهب والفضة وجواز الكرع - وهُو الشرب بالفم من النهر وغيره بغير إناء ولا يد - وتحريم استعمال إناء الذهب والفضة في الشرب والأكل والطهارة وسائر وجوه الاستعمال

۴۹۰	ترجمۃ الباب	۳۵۳
۴۹۱	یہ غلط فہمی نہ رہے	۳۵۴
۴۹۲	پتھر کے برتن کا استعمال	۳۵۵
۴۹۳	پیتل کے برتن کا استعمال	۳۵۶
۴۹۳	نہر میں منہ ڈال کر پینا	۳۵۷
۴۹۵	یہ ان کے لیے دنیا میں؛ تمہارے لیے آخرت میں	۳۵۸
۴۹۵	جہنم کی آگ اُنڈیل رہا ہے	۳۵۹

تقریظ

مولانا نور عالم صاحب خلیل امینی دامت برکاتہم

(استاذ ادب عربی دارالعلوم دیوبند و رئیس تحریر رسالہ ”الداعی“)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری گجراتی قاسمی زید محبدہ - دست گرفتہ
حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی (۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء - ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء)
و خلیفہ و مجاز حضرت مفتی اعظم مفتی محمود حسن گنگوہی (۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء - ۱۴۱۷ھ / ۱۹۹۶ء)
و شیخ الحدیث و صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل و رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند -
کے افادات کا مجموعہ ”حدیث کے اصلاحی مضامین“ جس کا نام پہلے ”حدیث کے اسباق“ تھا،
کی آٹھ جلدوں - جواب تک چھپ چکی ہیں - کے جستہ جستہ مطالعے کا موقع ملا۔

مفتی صاحب مدظلہ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ مطابق ستمبر ۱۹۹۶ء سے سورت شہر کی
”مسجد ابراہیم“ اور مجمع کی کثرت کے بعد ”مسجد انوار“ میں شنبہ و یک شنبہ کی درمیانی شب میں
بعد نماز عشا امام نوویؒ (بیہی بن شرف نووی دمشقی ۶۳۱ھ / ۱۲۳۴ء - ۶۷۶ھ / ۱۲۷۷ء)
کی مشہور و مقبول تالیف ”ریاض الصالحین“ - جو حدیث پاک کا بہترین مجموعہ و انتخاب ہے -
کا درس پابندی سے دیتے رہے ہیں۔ انھی درسوں سے، سی ڈی سے نقل کر کے بہترین کاغذ
پر خوب صورت طباعت کے ذریعے عام قارئین کے لیے استفادے کو آسان کر دیا گیا ہے۔
جمع کنندوں نے بھی اپنے بہترین ذوق اور نفاستِ طبع کا ثبوت دیا ہے؛ اس لیے یہ کتاب
اپنی ممتاز طباعت میں سیکڑوں دینی کتابوں سے ممتاز ہے؛ اس لیے راقم کا اندازہ ہے کہ ہر
با ذوق قاری اس کو حاصل کرنے اور پڑھنے کے لیے ضرور لپکتا ہوگا۔

مفتی صاحب زادہ اللہ توفیقاً صحیح معنی میں عالم باعمل ہیں؛ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اُن کے علم و اتقان میں برکت دی ہے؛ بلکہ انھیں بڑی مقبولیت و محبوبیت عطا فرمائی ہے، علما و عوام دونوں میں انھیں بڑا وقار و اعتبار حاصل ہے، اللہ نے درس و تدریس اور وعظ و نصیحت میں بھی ان کی زبان کو بڑا امتیاز عطا کیا ہے، ساتھ ہی ذہن بھی زرخیز ہے؛ اس لیے ان کے دروس و مواعظ بھی بہت مقبول ہیں۔ وہ طلبہ اور عوام دونوں کے لیے آسان اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں، اور زندگی کے مسائل کو چھوتے ہوئے تازہ دلائل و امثال سے اپنی بات کو واضح اور سہل بنا دیتے ہیں۔ امام نوویؒ صاحبِ قلب و نظر عالم تھے، وہ مادرِ زاد ولی تھے، انھوں نے لوگوں کے سیرت رسول ﷺ کے سانچے میں ڈھلنے کو آسان بنانے کے لیے حدیث کا یہ مجموعہ تیار کیا تھا، جو اُن کے اخلاص و للہیت کی وجہ سے خوب خوب مقبول ہوا، اور عربی کے علاوہ بہت سی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے اور شرحیں لکھی گئیں؛ لیکن مفتی صاحب مدظلہ کی عمومی مجلسِ درس کے ذریعے جو آسان مفصل و مکمل شرح تیار ہو گئی ہے، وہ ”ریاض الصالحین“ کی شرحوں میں بے مثال اور لا جواب ہے، جس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کو چھپی ہوئی شکل میں پڑھنا شروع کیجیے تو چھوڑنے کو آپ کا جی نہ چاہے گا، جس کی وجہ جہاں زبان کی چاشنی، اُس کی سلاست و سہولت اور غذائے دل کے سامان کی بے پناہی ہے، وہیں وہ خلوص ہے جس سے اللہ نے مفتی صاحب کے دل کو مالا مال کیا ہے۔ خلوص کے بغیر کسی شے میں محبوبیت کا رنگ پیدا نہیں ہوتا، خشت و سنگ میں بھی اگر خونِ جگر اور سوزِ دروں شامل ہو جائے تو چمک اٹھتے ہیں، اس کے بغیر ہر انسانی عمل بے رنگ و بے نور رہتا ہے:

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
محبزہٴ فن کی ہے، خونِ جگر سے نمود

(علامہ اقبالؒ)

اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب میں کسی چیز کے پائدار اور کسی نقشِ عمل کے لازوال ہونے کے لیے یہ معیار بتایا ہے کہ وہ خلقِ خدا کے لیے نافع ہو، ﴿وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَبِئْسَ كُفًى فِي الْأَرْضِ﴾ [الرعد: ۷۱]؛ لہذا جو چیز جتنی مفید ہوگی اُتنی ہی پائدار و جاوید ہوگی، چوں کہ یہ اصلاحی مضامین و اسباق بہت مفید ہیں؛ اس لیے اپنے اندر خود ہی مقبولیت کی طاقت رکھتے ہیں۔ کسی چیز کی اُس اندرونی طاقت کے بعد کسی سفارش، تعریف اور التفات طلبی کے عمل کی کوئی ضرورت نہیں رہتی، اور کسی چیز میں اگر یہ اندرونی جوہر نہ ہو تو پھر ثنا خوانی، ترغیب و تشویق اور اہمیت بیانی کا کوئی عمل کارگر نہیں ہوتا۔ اپنی بے پناہ اندرونی طاقت اور مقناطیسی محاسن کی وجہ سے یقین ہے، کہ مواعظِ حسنہ پر مشتمل یہ مضامین جتنے مقبول ہوئے ہیں، آئندہ اس سے بھی بہت زیادہ مقبول و محبوب ہوں گے، اور نہ صرف مفتی صاحب مدظلہ کا دامنِ عمل بے حد و حساب اجر و ثواب سے مالا مال ہوگا؛ بلکہ وہ سارے محبین و متعلقین بھی اجر و ثواب کا بھرپور حصہ پائیں گے جنہوں نے اس کی تیاری و اشاعت میں کسی طرح بھی حصہ لیا ہے۔

نور عالم خلیل امینی

رئیس تحریر رسالہ ”الداعی“

استاذ ادب عربی دارالعلوم دیوبند

۱۱ بجے دن: شنبہ ۲۸/ ذی قعدہ ۱۴۳۲ھ

۵ اکتوبر ۲۰۱۳ء

تقریظ

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری دامت برکاتہم

(شارح بخاری و استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، والصلاة والسلام علی رسولہ محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین
 أما بعد! عزیز محترم مولانا محمد علی صاحب بجنوری زید مجدہم مدرس دارالعلوم دیوبند نے
 ”حدیث کے اصلاحی مضامین“ کی مطبوعہ آٹھ جلدیں پیش کیں، اور فرمایا کہ: یہ جلدیں محض
 و محترم حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم نے ہدیۂ ارسال کی ہیں، اور ان پر
 اظہار رائے کی خواہش ظاہر کی ہے۔

حکم کی تعمیل میں عرض ہے کہ: یہ جلدیں دراصل علامہ نووی (المتوفی ۶۷۶ھ) کی
 ”ریاض الصالحین“ کے ابواب کے مطابق نہایت مؤثر اور دل پذیر خطابات ہیں، جنہیں حضرت
 مفتی صاحب زید مجدہم کے متوسلین نے ٹیپ ریکارڈ سے نقل کر کے افادۂ عام کے لیے طبع کرا دیا
 ہے، اور جن سے علما، طلبہ اور تمام باذوق مسلمان استفادہ کر رہے ہیں۔ فجزاہم اللہ خیر الجزاء
 علامہ نوویؒ نے ”ریاض الصالحین“ کے مقدمے میں تحریر کیا ہے کہ: انسان کا مقصد
 تخلیق عبادت ہے۔ وما خلقت الجن والانس إلا ليعبدون اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ، دنیا میں ہر
 انسان کا قیام عارضی ہے، دائمی نہیں؛ اس لیے کامیاب وہ لوگ ہیں جو اس ناپائیدار زندگی کو مقصد
 زندگی کی تکمیل میں صرف کرتے ہیں، اور جو لوگ اس مقصد سے غافل ہیں وہ یقیناً ناکام ہیں۔ پھر
 امام نوویؒ نے امام شافعیؒ کے تین اشعار ذکر کیے ہیں:

إن لله عبداً فطناً	طلقوا الدنيا وخافوا الفتنة
نظروا فيها فلما علموا	إنها ليست لحي ووطنا
جعلوها لجة واتخذوا	صالح الأعمال فيها سفناً

کہ بے شک اللہ کے دانش مند بندے وہ ہیں جنہوں نے دنیا کو ترک کر دیا اور فتنوں سے ڈرتے رہے، انہوں نے دنیا کو غور سے دیکھا، اور جب انھیں یہ یقین حاصل ہو گیا کہ یہ دنیا کسی صاحبِ حیات کا وطن بننے کے لائق نہیں ہے، تو انہوں نے دنیا کو ایک گہرا سمندر سمجھا اور اس کے لیے اعمالِ صالحہ کو سفینہ بنا لیا۔ پھر علامہ نوویؒ نے لکھا کہ: میں اس کتاب میں مقصدِ زندگی یعنی عرفان و عبادت کو اپنا نصب العین بنانے والوں کے لیے اعمالِ صالحہ کے وہ کلیدی مضامین بیان کرنا چاہتا ہوں کہ، اُن لوگوں کو کیا کام کرنے ہیں اور کن چیزوں سے دامن بچانا ہے؟ پھر انہوں نے اپنی کتاب کو تقریباً تین سوستر سے زائد ابواب پر تقسیم کیا ہے، اور ہر باب کے آغاز میں قرآن کریم کی آیات اور معتبر احادیث درج کیں، چنانچہ یہ کتاب عہدِ تدوین سے آج تک مقصدِ زندگی کو سامنے رکھنے والوں کی رہنمائی کرتی رہی ہے۔

ماضی قریب میں مخدوم و محترم حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم نے اپنے اکابر کی ہدایت کے مطابق اصلاحی خطبات کا آغاز کیا، تو ”ریاض الصالحین“ کو سامنے رکھا، اور اب یہ خطبات - جو ”ریاض الصالحین“ کی نہایت مبسوط اور معتبر شرح ہیں - چار سو سے زائد ایسے اصلاحی مضامین پر مشتمل ہیں، جو مقصدِ زندگی کو نصب العین بنانے والوں کے لیے بہترین رہنمائی کا کام کریں گے۔ حضرت مفتی صاحب دام مجدہم دارالعلوم کے نامور فضلاء میں سے ہیں، حضرات اکابر کے تربیت یافتہ ہیں؛ اس لیے ان خطبات میں اہل دیوبند کے فکر و نظر کی ترجمانی اور زہد و قناعت کی تلقین کے ساتھ دعوت و ارشاد اور علم و عمل کی روح جلوہ گر ہے۔

راقم الحروف دعا گو ہے کہ: اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائے، اور ہم تمام مسلمانوں کے درمیان اسے حسن قبول کی دولت سے نوازے۔ آمین

والحمد لله أولاً و آخراً
ریاست علی بخجوری غفرلہ
خادم تدریس دارالعلوم دیوبند

۲۳ محرم ۱۴۳۵ھ

اداریہ

الحمد للہ پھر ایک مرتبہ آپ حضرات کی خدمت میں ”حدیث کے اصلاحی مضامین جلد: ۹“ کا گلدستہ لے کر حاضر ہیں۔ وہی روحانی نورانی مضامین جو نبوت کی مبارک زبان کے شایانِ شان ہیں۔

عہدہ، حکومت اور اقتدار کو آج ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں، جھوٹے وعدے، خیانت، غبن، الزام تراشی وغیرہ ہر گناہ انگیز کر لیا جاتا ہے، پھر جب کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو اس کا جو ناجائز استعمال کیا جاتا ہے وہ نہ محتاجِ بیان ہے اور نہ قابلِ بیان۔ جمہوری ملکوں میں اقتدار کے ’misuse‘ کی اگر تاریخِ رقم کی جائے تو دفاتروں کے انبار لگ جائیں۔ آج ان ممالک میں بسنے والا ہر شخص پریشان ہے کیوں کہ تختِ حکومت پر انسانیت کا خون چوسنے والے درندے اڑھ جمائے ہوئے ہیں یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اس سلسلہ کی خالق انسانیت کی طرف سے دی گئی تعلیمات سے واقفیت نہیں، یا پھر اللہ تعالیٰ کا ڈر نہیں۔ اگر اس سلسلہ کی تعلیمات کو پڑھا جائے تو معلوم ہو کہ یہ حکومت وعہدہ مانگنے کی نہیں، بھاگنے کی چیز ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ نے اس سے متعلق ایسا نایاب انتخاب پیش فرمایا ہے کہ قابلِ داد ہے، عنوان ہے: [✓] ”اصحابِ اقتدار کو نرمی کا حکم“:

ہمارے زمانہ میں اربابِ اقتدار تو درکنار، اُن کے ادنیٰ در ادنیٰ ماتحتوں میں سے اگر کوئی ہمارے ساتھ نرم کلامی کر لے، دل جوئی کا معاملہ کر لے، تو ہمیں حیرت ہوتی ہے، گویا اس نے کوئی انہونی کر لی ہو۔ ترش روئی و بد کلامی کو ایک حصہ فرض سمجھا جاتا ہے۔ خیانت، بد عہدی اور رشوت کا بازار لگ گرم ہے؛ جس سے ہر شہری پریشان

ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیوی زندگی کے مختلف الانواع شعبوں کے لیے جتنی ہدایات دی گئی ہیں ان کی مخالفت اور پریشانی لازم ملزوم ہے۔

اسلام عالم گیر مذہب ہے، پوری انسانیت کے لیے ہے، خود اسلامی تعلیمات پر صد فیصد عمل کر کے دارین کی فلاح و بہبود حاصل کرنا ہماری سعادت ہے، پھر اس کا تعارف اپنوں اور دوسروں سے کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ پوری انسانیت کے ہر دکھ درد کا واحد علاج اسلام اور اسلامی تعلیمات میں ہے۔

جامعیت کی بات تو یہ ہے کہ ایک طرف حکام و سلاطین کو اگر رعایا سے حسن سلوک اور ہمدردی کا درس دیا، تو دوسری جانب رعایا کے گلے میں ”اطاعتِ حکام“ کا ایسا زبردست طوق ڈالا کہ انتشار و خلفشار اور انارکی انسانی معاشرہ کے قریب بھی نہ بچھٹک سکے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عنوان کے ماتحت مندرجہ ذیل ضمنی عناوین قائم کئے ہیں:

☑ انصاف سے پیش آنے والا حکمران:

☑ حاکموں کی اطاعت کے احکام:

☑ عہدہ طلب کرنے کی ممانعت:

☑ بادشاہ اور قاضی وغیرہ حکمرانوں کو اپنے لئے صالح مشیر رکھنے کی ترغیب

اور برے ساتھیوں سے بچنے کی تاکید:

☑ امارت و قضاء وغیرہ عہدے مطالبہ کرنے والوں کو دینے کی ممانعت

اس سے فراغت کے بعد صاحب کتاب نے آداب کا وہ سلسلہ شروع فرمایا جن کے اختیار کرنے سے انسان حقیقی انسان بنتا ہے اور چھوڑنے سے سرحدِ انسانیت سے نکل جاتا ہے، مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف عناوین قائم فرما کر آیات و روایات کا حسین گلہستہ حسبِ عادت شریفہ پیش فرمایا ہے۔

- ☑ شرم و حیا کیا ہے؟ اور اس کی فضیلت۔ اس کا اسلام میں کیا مقام ہے؟
- ☑ رازداری کی اہمیت، کسی کے بھید کی حفاظت کرنا:
- ☑ عہد و پیمان اور وعدہ پورا کرنا:
- ☑ نیک کاموں کی عادت کو باقی رکھنا:
- ☑ بوقت ملاقات خوش کلامی و بشاشت:
- ☑ بات چیت واضح اور صاف ستھری کرے۔ اگر ایک بار سے مخاطب نہ سمجھے تو دو تین بار دہرائے:

☑ اپنے ہم نشین کی بات کی طرف دھیان دینا:

اسی طرح آدمی کے اندر وقار یعنی سنجیدگی اور طبیعت کے اندر جساؤ اور ٹھیراؤ ہونا چاہیے، یہ زندگی کا ایک اہم حصہ ہے جس کی وجہ سے آدمی کا سماج و سوسائٹی میں اثر و رسوخ قائم ہوتا ہے، اس سے متعلق معتدل تعلیم شریعتِ مطہرہ کے اندر موجود ہے جس کا مواد اس عنوان کے ماتحت قاری کو یکجا مل جائے گا۔

- ☑ سنجیدگی اور اطمینان کی عادت: ☑ نماز اور علمی مجالس میں سکون و وقار سے آنا:
- ☑ مہمان کا اعزاز و اکرام کرنا:

- ☑ کسی کو اس کی خوشی کے وقت مبارک بادی دینا
- ☑ اپنے کسی ساتھی اور دوست کو رخصت کرتے وقت نصیحت کرنا، اس کے لیے دعا کرنا اور اس سے دعا کی درخواست کرنا:
- ☑ استخارہ کرنا اور مشورہ کرنا:

یہ عنوان انتہائی توجہ سے پڑھنے کا ہے۔ ایسی نایاب باتیں اس عنوان کے تحت آئی ہیں جو کہیں اور بہت مشکل سے ملے گی، حضرت دامت برکاتہم نے بہت وضاحت

سے سمجھایا ہے کہ استخارہ کا حکم کس پس منظر اور ماحول میں نازل ہوا، عربوں نے اپنی طرف سے کسی اہم معاملہ میں اپنا تذبذب دور کرنے کے لیے کیا طریقے گھڑ رکھے تھے، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ استخارہ ایک سرسری عمل ہے، لیکن حضرت کے مضمون کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتنا گہرا اور نایاب عمل ہے جو اللہ رب العزت کی طرف سے بندوں کو دیا گیا ہے، اسی ضمن میں دعائے استخارہ کا نہ صرف ترجمہ؛ بلکہ دل نشین تشریح بھی پڑھنے کی چیز ہے۔

✓ عید کی نماز کے لیے مختلف راستوں سے آنا جانا:

✓ ہر اچھے کام میں دائیں طرف سے شروع کرنا مستحب ہے:

پھر ان سب کے ضمن میں دیگر علمی فوائد، ارشادات اکابر مختلف مثالوں کے ذریعہ مضمون کی تشریح وغیرہ امور ہیں۔

اس کے بعد کھانے اور پینے کے آداب کا سلسلہ شروع فرمایا جو تقریباً سو اسو صفحات تک پھیلا ہوا ہے۔ ضرور پڑھئے اور دوسروں کو سنائیے، اگر بیوی بچوں کو ساتھ بٹھا کر اس کی تعلیم کی جائے گی تو ان شاء اللہ زندگیوں میں سلیقہ و تمیز پیدا ہوگی، اور ایسی ایسی باتیں سامنے آئیں گی کہ ایمان میں تازگی محسوس ہوگی۔

✓ کھانے کے آداب/کھانے سے پہلے بسم اللہ اور کھانے کے بعد الحمد للہ پڑھنا:

✓ کھانے میں عیب نہ نکالے۔ اس کی خوبی بیان کرنے کا پسندیدہ ہونا:

✓ دعوت میں حاضر ہونے والا اگر روزہ دار ہے؛ تو کیا کہے؟:

✓ کسی کو کھانے کی دعوت دی گئی، اور کوئی دوسرا بھی اس کے ساتھ ہو گیا،

تو وہ کیا کہے؟:

✓ اپنے سامنے سے کھانا اور خلاف ادب کھانے والے کو نصیحت کرنا:

✓ مجمع کے ساتھ کھاتے وقت کھجور وغیرہ دو، دو نہ لے:

✓ کھانے سے سیری نہیں ہوتی؛ وہ کیا کرے؟:

✓ برتن کے ایک طرف سے کھانے کا حکم:

✓ ٹیک لگا کر کھانے کا ناپسندیدہ ہونا:

✓ پینے کے آداب:

✓ مشکیزہ اور بڑے برتن سے منہ لگا کر پینے کی ممانعت اور اس کی وجہ:

✓ پینے کی چیز میں پھونک نہ مارے:

✓ کھڑے ہو کر پینے کی تفصیل:

✓ پلانے والا خود اخیر میں پئے:

✓ کن برتنوں میں پینا جائز ہے اور کن میں نہیں:

حق تو یہ ہے کہ جوں جوں ہم یہ مضامین پڑھتے جائیں گے توں توں ہمارے سامنے دین اسلام کے محاسن منکشف ہوں گے، تعلیمات کی قدر ہوگی، اور عمل کریں گے تو زندگی سنورے گی، ایک ایمان والے کے لیے تعلیمات نبوی انمول سرمایہ ہے۔ حق تعالیٰ شانہ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

اس جلد کے مواد کی فراہمی میں ہمیں مفتی محمد امین صاحب راجستھانی اور مولانا محمد ایوب صاحب مالینگانوی زید مجدہما اور ان کے احباب کا تعاون حاصل رہا، ادارہ ان سب کا ممنون و مشکور ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کے علم و عمل، صلاح و تقویٰ میں برکت دے اور ان سب کو خدمات کا دارین میں بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

ابوزاہر

۱۸ جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ ۳۰ اپریل ۲۰۱۳ء

بَابُ أَمْرِ وَلَا إِكْرَاهٍ بِالرِّفْقِ بِرِءَايَاهُمْ
وَنَصِيحَتِهِمْ، وَالشَّفَقَةِ عَلَيْهِمْ
وَالنَّهْيِ عَنْ غَشِّهِمْ، وَالتَّشْدِيدِ عَلَيْهِمْ
وَالْهَبَالِ مَصَالِحِهِمْ وَالْغَفْلَةِ عَنْهُمْ
وَعَنْ حَوَائِجِهِمْ

اصحاب اقتدار اپنے ماتحتوں کے ساتھ نرمی
اختیار کریں، ان کی خیر خواہی اور ان کے
ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ کریں، ان کو
دھوکہ نہ دیں، بے جا سختی نہ کریں، ان کی
مصالح سے پہلو تہی نہ کریں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تَحْمَدُهُ وَ نَسْتَعِيْنُهُ وَ نَسْتَغْفِرُهُ وَ نُؤْمِنُ بِهِ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَ نَعُوْذُ
بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَ مَنْ يُّضِلِّه
فَلَا هَادِيَ لَهُ وَ نَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ حْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَ نَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَ مَوْلَانَا
مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَ رَسُوْلُهُ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَ عَلَى اٰلِهِ وَ اَصْحَابِهِ وَ بَارَكَ وَ سَلَّمَ تَسْلِيْمًا
كَثِيْرًا كَثِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ:-

اسلام نام ہی حقوق کی ادائیگی کا ہے

اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ نے تمام لوگوں کے حقوق کو واضح کر کے امت کے سامنے پیش کر دیا ہے، اور اسلام کی تعلیمات کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ ان تمام حقوق کو ادا کیا جائے، گویا اسلام نام ہی حقوق کی ادائیگی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر کیا حق ہے وہ بھی بتلادیا، اور خود بندوں کے آپس کے حقوق بتلائے کہ ماں باپ کا اولاد کے اوپر کیا حق ہے، اولاد کا ماں باپ کے اوپر کیا حق ہے۔ بیوی کا شوہر کے اوپر اور شوہر کا بیوی کے اوپر کیا حق ہے۔ بھائی کا بھائی پر، بہن کا بہن پر، بھائی بہنوں کے آپس میں ایک دوسرے پر کیا حقوق ہیں، ایک پڑوسی کا دوسرے پڑوسی کے اوپر کیا حق ہے، آقا کا اپنے غلام کے اوپر کیا حق ہے، اور غلام کا آقا پر کیا حق ہے؛ یہ سب حقوق تفصیلی طور پر اسلام نے بتلائے ہیں۔

حکمرانوں کا پورا سلسلہ

چنانچہ اسی سلسلہ میں ایک چیز آج پیش کی جا رہی ہے کہ جب اسلامی حکومت ہوتی ہے تو ان میں ایک حکمران طبقہ ہوتا ہے اور ان میں بھی درجات ہوتے

ہیں۔ ایک تو حاکم اعلیٰ ہوتا ہے جس کو بادشاہ اور سلطان کہا جاتا ہے، پھر اس کی ماتحت درجات ہوتے ہیں، جیسے: ہمارے ملک میں پورا ایک نظام ہے کہ صدر یا وزیر اعظم ہوتے ہیں، پھر ان کے ماتحت گورنروں اور وزرائے اعلیٰ کا سلسلہ ہے، پھر وزرائے اعلیٰ کے ماتحت ضلعوں کے کلکٹر وغیرہ ہیں، پھر تحصیل کے پیمانوں پر حاکم ہیں، پھر دیہات اور بستیوں کے پیمانوں پر حاکم ہیں۔ اور ہر سطح پر کچھ نہ کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں، یہ ساری ذمہ داریاں جن کے حوالہ کی جاتی ہیں ان کو ایک قسم کی حکمرانی حاصل ہوتی ہے، چاہے چھوٹے پیمانے پر ہو، یا بڑے پیمانے پر ہو۔ اگر وہ حاکم اعلیٰ ہے جس کے ہاتھ میں حکومت دی گئی ہے، تو پورا ملک اور تمام رعیت اس کے ماتحت ہے، اس کے اوپر اپنے ماتحتوں کی، رعایا اور پبلک کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ ان کے ساتھ کیسا معاملہ کرنا چاہیے؟ اور پھر پبلک و رعایا کے اوپر اس حکمران کے کیا حقوق ہیں؟

حکومت نہ ہونے کی صورت میں بھی ہر ایک پر کچھ ایسی ذمہ داریاں ہیں جن کی وجہ سے کچھ لوگ اس کے ماتحت ہوتے ہیں، جیسے: گھر یا خاندان کا بڑا ذمہ دار ہوتا ہے تو اس کی ماتحتی میں کچھ لوگ ہیں۔ گھر کے ذمہ دار کے ماتحتی میں اس کے بیوی بچے اور دوسرے لوگ جو گھر کے اندر سکونت اور رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں جن کا یہ بڑا سمجھا جاتا ہے: اس پر ماتحتوں کے حقوق ہوتے ہیں۔

جہاں خاندان مشترکہ طور پر زندگی گزارتے ہیں، تو خاندان کا جو سربراہ اور بڑا ہوتا ہے، وہ سب کا ذمہ دار ہوتا ہے، اس کے اوپر اپنے ماتحتوں کے حقوق ہوتے ہیں، علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ دونوں باب بالترتیب لائیں گے، اس کی تفصیل بیان کریں گے اور اس سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ذمہ داریاں بتلائی ہیں ان سے متعلق روایتیں پیش کریں گے۔

حیثیتِ جی جنت کا نمونہ بنانے کا نسخہ

اس سلسلہ میں ایک چیز ذہن نشین رہے کہ جہاں کہیں معاملہ دو پارٹیوں یا دو فریق کا ہوتا ہے، تو ہر فریق کے اوپر دوسرے فریق کی نسبت سے کچھ حقوق اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ایسی بے شمار مثالیں ہیں، مثلاً: میاں بیوی کا تعلق ہے، اور ہر ہر گھر کے اندر یہ تعلق ہوتا ہے، بلکہ ایک ہی گھر کے اندر کئی میاں بیوی رہتے ہیں؛ تو شوہروں کا ایک گروہ اور جماعت ہے، ان کے مقابلہ میں بیویوں کی ایک جماعت اور پارٹی ہے۔ اسی طریقہ سے سیٹھ اور نوکر کا تعلق ہے، تو سیٹھوں کی پوری ایک جماعت اور طبقہ ہے اور ان کے ماتحت کام کرنے والوں کا پورا ایک گروہ ہے۔ تو جو مالک، آقا اور سیٹھ ہیں؛ ان کو کیا حقوق حاصل ہیں؟ اور ان کی اپنے ماتحتوں اور نوکروں کی نسبت سے کیا کیا ذمہ داریاں ہیں۔ اسی طرح نوکروں کا جو گروہ ہے ان کے اوپر اپنے آقا کی نسبت سے کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ اس سلسلہ میں حکومتوں کے بھی قانون ہوتے ہیں۔ اور شریعتِ اسلامیہ میں اللہ تعالیٰ نے بھی یہ سارے حقوق واضح کر دیئے ہیں اور اس سلسلہ میں ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ اگر دونوں فریق اپنی اپنی ذمہ داریوں کو پوری دیانت اور امانت داری کے ساتھ ذرہ برابر بھی کمی کیے بغیر ادا کریں؛ پھر تو یہ دنیا جیتے جی جنت کا نمونہ ہی بن جائے، اور اگر ایک فریق تو ان حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے جو اس کے اوپر دوسرے فریق کے واجب ہوئے ہیں، لیکن دوسرا فریق اپنی ذمہ داریاں ادا کرتا ہے، تب بھی کوئی جھگڑا اور نزاع کی نوبت پیش نہیں آئے گی۔

اسلام اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ تمہارے اوپر دوسروں کے جو حقوق ہیں اس کو ادا کرو، اور اپنے حقوق کا مطالبہ مت کرو۔ چنانچہ آپ قرآن و حدیث کے انداز

متخاطب کو دیکھیں گے تو اس میں خاص طور پر جس کا حق ہے اس کو خطاب نہیں کیا ہے، بلکہ جس پر حق ہے اس کو خطاب کیا ہے۔ جیسے: بیوی کا حق ہے تو بیوی کو یہ نہیں کہا کہ شوہر کے اوپر تیرا حق ہے، بلکہ شوہر کو یوں کہا گیا کہ تمہارے اوپر بیوی کا یہ حق ہے۔ یا بیوی کے اوپر شوہر کا حق ہے تو شوہر کو خطاب کر کے یوں نہیں کہا گیا کہ اے شوہروں کی جماعت! تمہاری بیویوں پر تمہارے یہ حقوق ہیں، بلکہ عورتوں کو براہ راست خطاب کیا گیا ہے کہ تمہارے اوپر شوہروں کے یہ یہ حقوق ہیں، تم ان کو ادا کرو۔ ایسے ہی یہاں پر بھی ہے۔

عنوان کا خلاصہ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلا باب قائم کیا، جس کا عنوان ہے: ذمہ داروں کو اپنے ماتحتوں کے ساتھ نرمی اختیار کرنے کا حکم۔ جیسا کہ میں نے بتلایا کہ حکمرانی کے بھی مراتب اور درجات ہیں، ایک تو حاکم اعلیٰ ہوتا ہے، پھر اس کے ماتحت ہوتے ہیں، پھر اس کے ماتحت؛ اسی طرح ایک بہت لمبا چوڑا سلسلہ چلتا ہے۔ اس لیے یہ حکم صرف بادشاہ وقت کے لیے خاص نہیں ہے، بلکہ جو گھر کا ذمہ دار، بڑا اور رئیس ہوتا ہے اس کو بھی یہ سارے احکام لاگو پڑتے ہیں۔ ”وَنَصِيحَتِهِمْ وَالشَّفَقَةُ عَلَيْهِمْ“ ان کی خیر خواہی اور پوری پوری بھلائی چاہنے، اور ان کے ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ کرنے کا حکم۔ ”وَالنَّهْيُ عَنِ غَيْبَتِهِمْ“ اور ان کی بدخواہی سے منع کرنے کا حکم۔ بحیثیت حاکم کے تمہاری طرف سے کوئی ایک حرکت بھی ایسی نہیں ہونی چاہیے جس سے تمہارے ماتحتوں کے متعلق بدخواہی معلوم ہوتی ہو۔ ”وَالنَّشِيدُ عَلَيْهِمْ“ جہاں حکمران کو حکم دیا گیا کہ نرمی کرو، وہیں ان کے ساتھ سختی کرنے سے منع کیا گیا۔ یعنی دونوں باتیں ہونی چاہئیں، صرف نرمی کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ سختی سے بھی منع کیا گیا، جیسے: خیر خواہی کا حکم دیا اور

ساتھ ہی بدخواہی سے منع کیا۔

بے توجہی اور غفلت سے منع کیا گیا

”وَإِهْمَالِ مَصَالِحِهِمْ وَالْغَفْلَةِ عَنْهُمْ“ ان کی جو جو مصلحتیں ہوں ان کی طرف سے بے خبری، بے توجہی اور ان کے معاملہ میں غفلت برتنے سے بھی منع کیا گیا۔ اور ان کی بھلائی کی جتنی بھی شیطیں ہو سکتی ہیں وہ سوچی جائیں۔ مثلاً: ایک آدمی پورے گھر کا سربراہ اور رئیس ہے، اب گھر میں کیا ہو رہا ہے اس کو اس بات کی کوئی پڑی ہی نہیں ہے، گھر والے کہاں سے کھا رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں، ان کی ضرورتیں کیسے پوری ہو رہی ہیں، اس کو اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی، وہ اپنے میں مست ہے، اور ان کی طرف سے بالکل غفلت برت رہا ہے۔

یا اگر اچھا کھلا پلا تو رہا ہے لیکن ان کی تعلیم و تربیت کی طرف سے غفلت برت رہا ہے کہ ان کے اعمال کیا شکل اختیار کر رہے ہیں۔ یا اس کو اس بات کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہے کہ میرا بیٹا کس کی صحبت میں پھر رہا ہے، میری بیوی کہاں جا رہی ہے، میری بیٹیاں کیا کر رہی ہیں۔ یا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ گھر والے غلط لیٹرچر کا مطالعہ کر رہے ہیں جس سے ان کی ذہنیت خراب ہوتی ہے، لیکن ان کی طرف سے بے توجہی اور غفلت برتا ہے، تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اوپر سے لے کر نیچے تک ہر ایک کے لیے یہ حکم یکساں ہے۔

مصلحت اور حاجت کا فرق

”وَعَنْ حَوَائِجِهِمْ“ ان کی ضرورتوں سے غفلت برتنے سے منع کیا گیا ہے۔ مصالح اور حوائج دو چیزیں الگ الگ ہیں، مصالح کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس سے

اس کی زندگی میں خوبی اور نکھار آتا ہے، زندگی بنتی اور سنورتی ہے، اور اس میں تسلیم و تربیت، اخلاق، اعمال، اٹھنا بیٹھنا، بول چال؛ یہ ساری چیزیں آتی ہیں۔ اور حوائج کا مطلب ہے ضرورتیں؛ جس میں کھانا، پینا، کپڑا مکان؛ یہ ساری چیزیں آتی ہیں۔ اب ایک آدمی اگر اپنے ماتحتوں کے کھانے پینے، رہنے سہنے، اور ان کے کپڑوں کا بہترین انتظام کرتا ہے، اس پر برابر پیسے خرچ کرتا ہے، ذرہ برابر اس کی طرف سے غفلت نہیں برتا، لیکن ان کی تعلیم و تربیت کی طرف سے غفلت کا معاملہ کرتا ہے، ان کی عادتوں کی طرف سے غفلت و بے پرواہی برتا ہے تو پھر یہ گڑبڑ والی بات ہو جائے گی۔ اس لیے کہ وہ ان کی حاجتیں پوری کر رہا ہے، لیکن ان کی مصلحتوں اور بھلائیوں کی طرف توجہ نہیں کر رہا ہے۔ لہذا ہمیں بحیثیت ایک ذمہ دار کے ہر طرف سے چوکنا رہنا ہے اور ہر چیز کا خیال کرنا ہے۔ گھر کے لیڈر اور ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے صرف کھانا پلانا ہی کافی نہیں ہے۔

آج کل ہم لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ اگر ہم گھر کے ذمہ دار ہیں تو گھر کے لوگوں کے رہنے سہنے، کھانے پینے، کپڑوں وغیرہ دوسری ضرورتوں کا انتظام کر دیں گے؛ تو گویا ہم نے اپنی ذمہ داری پوری کر لی۔ حالاں کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: «وَاِهْمَالِ مَصَالِحِهِمْ وَالْغَفْلَةِ عَنْهُمْ وَعَنْ حَوَائِجِهِمْ» ان کی ذات سے بھی غفلت نہ برتے اور ان ضرورتوں سے بھی غفلت نہ برتے، ان کی ہر چیز کا خیال رکھے؛ یہ سب ذمہ داریاں ہیں۔

ایک مثال

بھائی! آپ گاڑی میں پٹرول تو دیتے ہیں، لیکن اس کے شیشے کی صفائی نہیں کرتے، سروس نہیں کراتے؛ تو کیا کام چل جائے گا؟ نہیں چلے گا! بلکہ ہر چیسز کرنی

پڑے گی، تب ہی آپ کی گاڑی چلے گی۔ اسی طریقہ سے کھلانے پلانے، رہنے سہنے کا انتظام تو کرتے ہیں؛ لیکن ان کے اخلاق، اعمال، اقوال کے سدھار اور تعلیم و تربیت کی طرف دھیان نہیں دیتے، ان کی عادتیں کیسی ہیں، کہاں اٹھتے بیٹھتے ہیں، گھر میں کیسا کرتے ہیں، اس طرف سے غفلت برتتے ہیں اور کوئی توجہ نہیں کرتے؛ تو کام نہیں چلے گا۔ اور جتنے بھی ذمہ دار ہیں ہر ایک کے لیے یہی حکم ہے، بادشاہ وقت اور حاکم اعلیٰ جو پوری سلطنت کا ذمہ دار ہے، اس کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی رعیت کی ان ساری چیزوں کا خیال رکھے۔

موت کی گھڑی میں رعایا کی اصلاح کی فکر

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو پتہ چلے گا کہ وہ صرف اتنا ہی نہیں سوچتے تھے کہ نظام سلطنت برابر چلے، بلکہ رعیت کی ہر چیز کا پورا خیال رکھتے تھے، لوگوں کا کیا حال ہے، ان کے اخلاق کیسے ہیں، ان کے اعمال کیسے ہیں، وہ کس قسم کا لباس پہنتے ہیں؛ وہ ان سب چیزوں کا خیال رکھتے تھے۔ اس بات کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر حملہ ہوا، ابولؤلؤ نے خنجر مارا جس سے آپ زخمی ہوئے اور آپ کے جاں برہونے کی امید نہیں تھی، سب کا گمان تھا کہ اسی بیماری میں انتقال ہو جائے گا اور اسی بیماری میں آپ کی وفات بھی ہوئی۔ اسی بیماری کے دوران ایک نوجوان آپ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے آیا، جب وہ واپس لوٹ رہا تھا تو آپ کی نظر اس کی لنگی یا پاجامہ پر پڑی جو ٹخنوں سے نیچے لٹک رہا تھا، آپ نے اس کو بلایا اور کہا: اے بھائی! «ارْفَعْ ثَوْبَكَ»، اپنا پاجامہ اونچا رکھو «فَإِنَّهُ أَتَقَى لِثْوَبَكَ» یہ تمہارے کپڑے کی صفائی کا ذریعہ ہے «وَأَتَقَى لِرَبِّكَ»، اور اپنے رب کے یہاں تقویٰ کا ذریعہ بھی ہے۔ (صحیح بخاری، باب

قصۃ البیعة والاتفاق علی عثمان بن عفانؓ، حدیث نمبر: ۳۴۹۷) غور کرو کہ عین موت کی گھڑی میں وہ اس ذمہ داری سے بے خبر اور بے پرواہ نہیں تھے۔

ایک مرتبہ جب آپ شام کے علاقہ میں تشریف لے گئے، تو وہاں اسلامی لشکر کے مختلف حصوں کے سپہ سالار ملے، ان کے حالات کو دیکھا تو ان کے لباس پر ان کوٹوکا۔

جامع آیت

پہلی آیت لائے ہیں: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ﴾ اللہ تعالیٰ عدل کا حکم دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی جامع آیت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کی ساری تعلیمات پیش کرنے کے لئے یہ ایک آیت ہی کافی ہے۔ اسی لیے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے جمعہ اور عیدین کے دوسرے خطبہ میں اس کو شریک کر لیا، خطیب اپنے خطبہ کو اسی آیت پر ختم کرتا ہے۔ یہ ایسی جامع آیت ہے کہ قرآن کریم کی تمام تعلیمات کی پوری عکاسی کرتی ہے۔ بعض حضرات تو اسی آیت کی وجہ سے ایمان لائے ہیں۔

آیت کا اثر پوری قوم پر

حضرت اکثم بن صیفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک صحابی ہیں۔ علامہ ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اپنے قبیلے کے سردار تھے، ان کو معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا ہے اور آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، لوگوں کو اسلام و ایمان کی دعوت دیتے ہیں، تو انہوں نے اپنی قوم سے کہا: میں جا کر ان کے حالات کی تحقیق کر کے آتا ہوں۔ قوم نے کہا: آپ ہمارے قبیلے کے سردار ہیں، آپ خود نہ جائیے، بلکہ ان کے حالات کی تحقیق کے لیے دو آدمیوں کو بھیج دیجیے۔ چنانچہ دو آدمی گئے جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

پوچھا: ”مَنْ أَنْتَ وَمَا أَنْتَ؟“ آپ کون ہیں اور کیا ہیں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ”أَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ“ میں محمد بن عبد اللہ ہوں ”وَأَنَا عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ“ اور میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ ان کے سوال ”کون ہو؟“ کے جواب میں اپنا نام بتا دیا، پورا نسب بھی تفصیل سے نہیں بتایا۔ اور ”کیا ہو؟“ کے جواب میں بتا دیا کہ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں پھر تعلیم کے طور پر آپ نے قرآن پاک کی یہی آیت پڑھ کر سنائی۔ انہوں نے عرض کیا: اس کو لوٹائیے یہاں تک کہ ان کو یہ آیت یاد ہوگئی۔ آپ نے ایسا نہیں بتلایا کہ میں بڑے خاندان کا ایک فرد ہوں، بلکہ ان لوگوں نے اپنے طور پر نبی کریم ﷺ کے نسب شریف سے متعلق لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ آپ تو بڑے اونچے خاندان قبیلہ مضر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب وہ دونوں واپس آئے اور رپورٹ پیش کی کہ ہم نے ان سے پوچھا تو انہوں نے تو مختصر سا جواب دیا، اپنے خاندان کی تفصیل بھی ذکر نہیں کی، لیکن جب ہم نے لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ تو بڑے اونچے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان پر جو جی آتی ہے اس میں سے یہ آیت پڑھ کر سنائی ہے، جب حضرت اکثم بن صیفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ آیت سنی تو کہا: وہ تو بڑے اچھے اخلاق کا حکم دیتے ہیں اور برے اخلاق سے روکتے ہیں اور فوراً اسلام قبول کر لیا، پھر اپنی قوم سے کہا: جلدی سے تم لوگ بھی اسلام میں داخل ہو جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری دنیا اسلام میں داخل ہو جائے، اس کے بعد تم ضمنی طور پر داخل ہوؤ، پھر تمہاری کوئی حیثیت نہ رہے، ابھی اسلام لانے میں سبقت کرنے کا موقع ہے۔ اس طرح یہ خود بھی مسلمان ہوئے اور پورے قبیلہ کو بھی مسلمان بنالیا۔ (تفسیر ابن کثیر، سورہ نحل)

..... میرا ایمان پختہ ہو گیا

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ شروع میں جب میں ایمان

لایا تو میرے دل میں ایمان مضبوط نہیں تھا، بس ایمان لے آیا تھا لیکن اس بارے میں ابھی ”ڈانواں ڈول“ اور مذہب تھا۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے اوپر وحی کے نزول کے آثار ظاہر ہوئے، جب وحی نازل ہو چکی، تھوڑی دیر بعد حضور اکرم ﷺ نے یہی آیت پیش کی، جب میں نے یہ آیت سنی تو اس کے مضمون کے نتیجے میں میرا ایمان پختہ ہو گیا۔ (تفسیر قرطبی، سورہ نحل)

عدل

خلاصہ یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ”عدل“ کا حکم دیتا ہے۔ عدل یعنی انصاف و برابری۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ہر ذی حق کا حق ادا کرنا ”عدل“ ہے۔ اور عدل سے اعتدال مراد لیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اعتدال و میانہ روی کا حکم کرتا ہے کہ اپنے عقائد، اعمال، اخلاق، معاشرت اور معاملات کو درست کرو اور ہر چیز میں اعتدال مطلوب ہے۔

احسان

”وَالْإِحْسَانُ“ اور اللہ تعالیٰ بھلائی کا حکم دیتا ہے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ عدل تو واجب ہے کہ ہر ذی حق کا حق پورا پورا ادا کیا جائے، اور پھر حق سے زائد بھی کچھ دیا جائے؛ اسی کو احسان اور بھلائی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں: احسان کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام کو خوبی کے ساتھ اچھی طرح انجام دینا، جیسے: اہل عرب بولتے ہیں: ”طَبَخْتُ، فَأَحْسَنْتُ الطَّبْخَةَ“ میں نے پکایا اور بڑا اچھا پکایا۔ کوئی عمل اچھے اور عمدہ انداز و طریقہ سے پختگی کے ساتھ کیا گیا ہو، تو اس کو احسان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے تمام اعمال، اخلاق، عبادات، معاملات، معاشرت؛ ہر چیز

میں آدمی خوبی پیدا کرنے کا اہتمام کرے۔

إِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ

”وَإِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ“ اور اللہ تعالیٰ رشتہ داروں کو دینے کا حکم کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ احسان کے عام حکم میں رشتہ دار بھی آگئے تھے، اور واجب حق تو ہر ایک کا ادا کرنا ہی ہے، لیکن جہاں احسان یعنی واجب سے زیادہ دینے کی بات آتی ہے تو اس میں پھر درجات ہوتے ہیں، خاص کر رشتہ داروں کے ساتھ آدمی زیادہ بھلائی کا معاملہ کرے، رشتہ داری کی وجہ سے ان کا حق زیادہ ہے۔

فحش، منکر، سرکشی

”وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ“ اور اللہ تعالیٰ بے حیائی اور ظاہری و باطنی ہر طرح کی برائی سے منع کرتا ہے ”وَالْمُنْكَرِ“ اور نامعقول حرکتوں اور باتوں سے بھی منع کرتا ہے ”وَالْبَغْيِ“ اور ظلم و سرکشی سے منع کرتا ہے ”يَعْظُمُ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ“ اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے، شاید تم نصیحت حاصل کرو۔

ہر ایک ذمہ دار ہے

۶۵۳:- وعن ابن عمر رضي الله عنهما قال سمعت رسول الله ﷺ يقول: كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ: الْإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِي أَهْلِهِ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالْمَرْءُ رَاعٍ فِي بَيْتِ زَوْجِهِا وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا، وَالْحَادِمُ رَاعٍ فِي مَالِ سَيِّدِهِ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم

ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے (یہاں تک کہ جس کے ماتحت کوئی نہ ہو، وہ بھی اپنی ذات کا ذمہ دار ہے۔ اپنی جان اور جسم پر اس کی ذمہ داری ہے کہ اپنے جسم کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چلائے) اور ہر ایک کو اپنے ماتحتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا (جیسی جیسی ذمہ داری اس کو سونپی گئی ہے اسی کے مناسب اللہ تعالیٰ کے یہاں پوچھ ہوگی اور مطالبہ ہوگا کہ تم نے اپنی اس ذمہ داری کو کتنا پورا کیا۔ جیسے: کوئی) اگر پورے ملک کا سربراہ اعلیٰ اور حکمران ہے تو پورے ملک کا پوچھا جائے گا (اور اگر کسی علاقہ کا نگران ہے تو اس علاقہ کے متعلق، اور کسی بستی کا نگران ہے تو بستی کے متعلق، اور کسی محلہ کا نگران ہے تو محلہ کے متعلق، اور کسی خاندان کا نگران ہے تو خاندان کے متعلق، اور مکان کا نگران ہے تو مکان کے متعلق سوال کیا جائے گا) اور مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، ان کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اور عورت اپنے گھر اور مکان کی ذمہ دار ہے، اس کے متعلق اس سے پوچھا جائے گا۔ نوکر اور غلام اپنے آقا اور سیٹھ کے مال میں ذمہ دار ہے، اس سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔ تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے، اور ہر ایک کو اپنے ماتحتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

افادات:- ”الإِمَامُ رَاۓ“ امام سے مراد حاکم اعلیٰ، بادشاہ وقت ہے،

اس کو اپنی ماتحت پوری رعیت، پبلک اور پورے ملک کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال کیا جائے گا۔

”وَالرَّجُلُ رَاۓ“ مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، وہ اپنے گھر کا سربراہ ہوتا

ہے، اس کے ماتحت بیوی بچے ہوتے ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال کیا

جائے گا کہ تم نے اپنی ذمہ داری کو ادا کیا یا نہیں۔ اگر اس میں کوتاہی کی ہے تو پھر

اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے پکڑ ہوگی۔

”وَالْمَرْأَةُ أَقْرَبُ عِيَّةً فِي بَيْتِ زَوْجِهَا“ عورت اپنے گھر اور مکان کی ذمہ دار ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ اولاد کی نگرانی کے سلسلہ میں اور شوہر کے مکان میں جتنی بھی چیزیں ہیں ان سب کی ذمہ دار ہے۔ شوہر تو کاروبار اور کمانے اور دوسری ضرورتوں کے واسطے باہر رہتا ہے، اب گھر میں شوہر کا جو کچھ بھی ہے ان ساری چیزوں کی رکھوالی اور نگرانی کی ذمہ داری بیوی کی ہے۔ اولاد کی نگرانی بھی بیوی کے اوپر ہے۔ اور گھر کے سارے نظام کی ذمہ داری بھی عورت کے اوپر ہے۔ شوہر کی غیر حاضری میں عورت اپنی ذات کی عفت و پاک دامنی کی بھی حفاظت کرے، ساتھ ہی ساتھ بال بچوں کی نگرانی بھی کرے، اگر اس نے اس میں کوتاہی برتی، اور خیانت سے کام لیا، جیسے: بعض عورتیں اپنی ذات کے معاملہ میں بھی بے خبر اور اپنی اولاد کے معاملہ میں بھی غافل رہتی ہیں، حالاں کہ ان کو ہر چیز کو نبھانا اور سنبھالنا ہے، ان کو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔ اس لیے کہ شوہر صبح جب گھر سے نکلتا ہے تو اپنے گھر میں جو کچھ ہے وہ سب بیوی کے حوالہ کر کے جاتا ہے، اگر اس میں کوئی کوتاہی یا خیانت ہوئی تو بیوی سے اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہوگا۔

”وَالْخَادِمُ رَاعٍ فِي مَالِ سَيِّدِهِ“ نوکر اور غلام اپنے آقا اور سیٹھ کے مال میں ذمہ دار ہے جو اس کے حوالہ کیا گیا ہو۔ کوئی آدمی اگر کسی جگہ ملازم ہے، تو سیٹھ نے جو کام اس کے حوالہ کیا ہے، مثلاً: کوئی مشین حوالہ کی جاتی ہے، تو یہ اس کے آقا کا مال ہے، اس کو صحیح طریقہ سے چلانا، اس کو نقصان سے بچانے کی کوشش کرنا، اس کو چلانے میں پوری امانت و دیانت سے کام لینا؛ یہ نوکر کا کام ہے۔ یا سیٹھ نے دوکان حوالہ کی، تجارت کے مال کی حفاظت کی ذمہ داری سوچنی اور اسی کی تنخواہ دی جاتی ہے، تو اس کے متعلق قیامت کے روز پوچھا جائے گا۔

”كُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ“ تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جس کے سر جتنی ذمہ داری حوالہ کی گئی ہے، اس کے متعلق اس سے پوچھا جائے گا۔ جیسی جیسی جس کی حیثیت اور جیسا جیسا جس کا مقام ہوگا اتنی ہی ذمہ داری اس کی زیادہ اور بڑی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے متعلق اس سے سوال ہوگا۔

آج کل تو یہ ہو گیا ہے کہ کوئی اونچا عہدہ یا منصب مل جائے تو ہم خوش ہوتے ہیں، حالاں کہ یہ تو ڈرنے کی چیز ہے۔ جس کا منصب جتنا اونچا ہوگا، اتنے ہی زیادہ لوگ اس کے ماتحت آئیں گے اور ان سب کی ذمہ داری اس کے اوپر عائد ہوگی، اس میں سے کسی ایک کے حق کی ادائیگی میں بھی کوتاہی ہوئی تو قیامت کے روز اس کا جواب دینا پڑے گا۔

ماتحتوں کے بدخواہ کی سزا

۶۵۴:- وعن أبي يعلى مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللَّهُ رَعِيَّةً، يَمُوتُ يَوْمَ يَمُوتُ وَهُوَ غَاشٌّ لِرَعِيَّتِهِ، إِلَّا أَحْرَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ. (متفق عليه)

وفی روایۃ: ((فَلَمْ يَحْطَئْ بِنُصْحِهِ لَمْ يَجِدْ رَاحَةَ الْجَنَّةِ))

وفی روایۃ لمسلم: ((مَا مِنْ أَمِيرٍ يَلِي أُمُورَ الْمُسْلِمِينَ، ثُمَّ لَا يَجْهَدُ لَهُمْ وَيَنْصَحُ لَهُمْ إِلَّا لَمْ يَدْخُلْ مَعَهُمُ الْجَنَّةَ))

ترجمہ:- حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: جس بندہ کو اللہ تعالیٰ اپنی رعیت کا نگران مقرر کرے (جیسا کہ اوپر بتلایا کہ

جس کے ماتحت جتنے بھی لوگ ہوتے ہیں، اگر کوئی ایک گھر کا سربراہ ہے، کوئی پورے خاندان کا سربراہ ہے، کوئی پوری بستی کا سربراہ ہے، کوئی پورے علاقہ کا سربراہ ہے (اور جس روز وہ مر رہا ہے تو اس کی موت ایسی حالت میں آرہی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کی بدخواہی کیے ہوئے ہے، یا ان کی بھلائی چاہنے کے بجائے ان کی برائی چاہ رہا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے اوپر جنت کو حرام کر دے گا۔

افادات:- اسلام نے رعایا کے اوپر حکمرانوں کے بڑے حقوق بتائے ہیں، جیسا کہ آئندہ باب آنے والا ہے جس میں آئے گا کہ ان کی پوری فرمانبرداری کرو، اور جب کہ رعیت تو پوری فرمانبرداری کر رہی ہے، لیکن حکمران رعیت کی خیر خواہی کرنے کے بجائے بدخواہی کرتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ چیز ان کے لیے مضر ہے، اس کے باوجود اپنے کسی مفاد کے پیش نظر ان کے لیے وہی چیز اختیار کرتا ہے، تو ایسے آدمی پر اللہ تعالیٰ جنت کو حرام کر دیں گے۔

دوسری روایت میں ہے: ”فَلَمْ يَحْطُهَا بِنُصْحِهِ“ پوری پوری خیر خواہی نہیں کی، یعنی جو بھلائی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں چاہی، اس میں کمی کی۔ مثلاً: کھانا تو کھلایا، کپڑے تو پہنائے، لیکن اچھے آداب نہیں سکھلائے، اچھے اخلاق سے آراستہ نہیں کیا، دینی تعلیم نہیں دی، اس کو دنیا حاصل ہو جائے اس کی ڈگریاں تو دلوادیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو، ایسی چیز ان کو نہیں سکھلائی، نماز نہیں سکھلائی، تو ظاہر ہے کہ خیر خواہی میں کمی رہ گئی، ایسا آدمی جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔

جن کے رتبے ہیں سوا.....

ایک روایت میں ہے کہ جو حکمران مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار ہوتا ہے،

پھر وہ ان کے لیے پوری پوری خیر خواہی نہیں کرتا بلکہ اس میں کمی رکھتا ہے، تو وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے اوّل وہلہ میں جنت میں نہیں جاسکے گا، بلکہ خیانت اور کوتاہی کی سزا بھگتنے کے بعد جائے گا۔ ہاں! اگر اپنی مقدور بھر طاقت کے مطابق پوری خیر خواہی کر ڈالی، جتنا اس کے بس میں تھا اس میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی، تو اس کا ذمہ بری ہو جائے گا، اس لیے منصب و عہدہ اور اونچا مقام کوئی آسان چیز نہیں ہے:۔

جن کے رتبے ہیں سوا، ان کی مشکل بھی سوا ہوتی ہے

جس کا جتنا اونچا مقام ہوتا ہے اس کی ذمہ داری بھی اسی مناسبت سے بڑی ہوا کرتی ہے اگر اس میں اس نے کوتاہی سے کام لیا تو دنیا میں بھی لوگ تھو تھو کریں گے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی جواب دینا ہے۔

جیسا برتاؤ؛ ویسی دعا

۶۵۵:- وعن عائشة رضي الله عنها قالت: سمعتُ رسولَ الله ﷺ يقولُ في بيتي هَذَا: اللَّهُمَّ مَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ أُمَّتِي شَيْئاً، فَشَقَّ عَلَيْهِمْ؛ فَاشْقُقْ عَلَيْهِ. وَمَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ أُمَّتِي شَيْئاً، فَرَفَقَ بِهِمْ؛ فَارْفُقْ بِهِ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو میرے اس مکان اور حجرہ میں فرماتے ہوئے سنا: اے اللہ! جو آدمی میری امت کی کسی کام کا ذمہ دار ہوا (یعنی کوئی حکمرانی اور ذمہ داری اس کے سر آئی) اور اس نے (بجائے راحت اور نرمی کرنے کے) ان کے اوپر بلاوجہ سختی کی اور ان کو مشقت میں ڈالا؛ تو اے اللہ! تو بھی اس کو مشقت میں ڈال۔ اور جو میری امت کے کسی کام کا ذمہ دار ہوا اور اس کو حکمرانی کا منصب ملا پھر اس نے ان کے ساتھ نرمی برتی؛ تو اے اللہ! تو بھی اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کر۔

افادات:- نرمی کا مطلب یہ ہے کہ جہاں شریعت نے نرمی کا حکم دیا ہے وہاں نرمی اختیار کی جائے۔ ورنہ جہاں شریعت کے قانون کو نافذ کرنے کے معاملہ میں سختی اختیار کرنی پڑے؛ تو وہاں تو سختی سے کام لینا ہی ضروری ہے۔ یہاں سختی کا مطلب یہ ہے کہ بلا وجہ لوگوں کو مشقت میں ڈالنا، جیسا کہ بعضوں کو عادت ہوتی ہے کہ اس کو مارا اس کو پھٹکارا، اس کو کچھ کر دیا؛ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ایک تو قانون کو نافذ کرنا ہوتا ہے، وہاں تو شریعت کا قانون نافذ کیا جائے گا؛ اور اس کا نام سختی نہیں ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا.....

آج لوگوں نے سختی اور نرمی کی تعریف اور اصطلاحات بھی بدل ڈالی ہیں، اور سختی و نرمی کے لیے پیمانے بھی بدل دیئے ہیں۔ اگر کوئی باپ اپنی اولاد کی صحیح تربیت کے معاملہ میں ذرا سختی کرتا ہے، جیسے: صبح جلدی اٹھتا ہے، بچہ کو اپنے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے مسجد لے جاتا ہے، تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ بڑا سخت ہے، بچہ تو ابھی بیچارہ دس بارہ سال کا ہے، اس کو سونے نہیں دیتا، صبح جلدی اٹھا کر ظلم کرتا ہے۔ حالاں کہ سات سال کی عمر میں تو شریعت نے بھی نماز کے لیے کہنے کا حکم دیا ہے، اور یہ بچہ تو بارہ سال کا ہوا، اس کو بھی باپ تاکید کرے تو لوگ ایسا کہتے ہیں کہ باپ بڑا سخت ہے، حالاں کہ اس کا نام سختی نہیں ہے، بلکہ باپ اگر اس کو نہیں کہے گا تو گنہگار ہوگا۔ اسی طریقہ سے بیٹا اگر ٹی وی دیکھ رہا ہے اور باپ روک رہا ہے، تو لوگ کہتے ہیں کہ باپ بڑا سخت ہے، اگر نہ روکے تو اس کا نام نرمی ہے، حالاں کہ یہ نرمی نہیں ہے، بلکہ بدخواہی ہے۔

حاکموں سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرو

۶۵۶:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: كَانَتْ

بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسْوِسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي، وَسَيَكُونُ بَعْدِي خُلَفَاءُ فَيَكْتُرُونَ. قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، فَمَا تَأْمُرُنَا؟ قَالَ: أَوْفُوا بِبَيْعَةِ الْأَوَّلِ فَالْأَوَّلِ، ثُمَّ أَعْطَوْهُمْ حَقَّهُمْ، وَاسْأَلُوا اللَّهَ الَّذِي لَكُمْ، فَإِنَّ اللَّهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ. (متفقٌ عليه)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بنو اسرائیل کی سرداری ان کے انبیاء کرتے تھے (یعنی ان کے ہاتھ میں حکومت ہوتی تھی) جب ایک نبی کا انتقال ہوتا تھا تو اس کی جگہ پر دوسرا نبی اس کا جانشین بتاتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے، اس لیے میرے بعد خلفاء ہوں گے اور وہ زیادہ ہوں گے (اس لیے کہ جب تک دنیا قائم ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا) صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ ان کے سلسلہ میں ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ (یعنی بعد میں جو لوگ آئیں گے اور جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہوگی، ان کے ساتھ ہم کیا معاملہ کریں؟) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: پہلے جس کے ہاتھ پر بیعت لی گئی اس کے عہد و پیمان کو پورا کرو اور اس کا حق ادا کرو، اور تمہارا جو حق ان کے اوپر ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگو، اس لئے کہ اگر وہ کچھ کمی کوتاہی کر رہے ہیں، اور حق نہیں دیتے تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا۔

افادات:- بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے ہاتھ پر حکمرانی کی بیعت لی گئی اور اس کو حاکم مقرر کیا گیا، پھر دوسرا آدمی اس کے اوپر زبردستی بزور قوت چڑھ بیٹھتا ہے اور اس کے پاس سے حکومت چھین کر لوگوں سے بیعت لینا شروع کر دیتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ جس کے ہاتھ پر پہلے بیعت کی گئی تھی اور اس کے ساتھ تم نے جو عہد و پیمان کیا تھا؛ اس کو پورا کرو، اس لیے کہ اسلام دوسروں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ پہلے حکمران کو ہٹا کر اس کی جگہ پر آجائیں، اس لیے تم نے پہلے کے ہاتھ پر بیعت کے

وقت جو عہد و پیمان کیا تھا اور وفاداری کا وعدہ کیا تھا؛ اس کو پورا کرو اور اس کا حق ادا کرو۔

جہاں کہیں فتنے رونما ہوتے ہیں

اور اگر وہ تمہارے حقوق کی ادائیگی میں کچھ کوتاہی کرتے ہیں، تو اس کو لینے کے لیے تلوار مت نکالو اور لڑنے کے لیے میدان میں مت آ جاؤ، اس لیے کہ سارے فتنوں کی جڑ یہی ہے، بلکہ تمہارا جو حق ان کے اوپر ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگو۔

کتاب الفتن میں بھی محدثین ان روایتوں کو خاص طور پر لاتے ہیں، اس لیے کہ جب بھی کہیں فتنے ہوتے ہیں اسی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ ذمہ دار کی طرف سے بلا وجہ سختی ہوئی جس کی وجہ سے رعیت میں اشتعال پیدا ہوا۔ یا ذمہ دار نے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی، تو رعیت کی طرف سے مطالبہ ہوا۔ یا رعیت نے ذمہ دار کے حقوق کی ادائیگی اور اطاعت و فرمانبرداری میں کوتاہی کی جس کے نتیجے میں اس نے سخت نوٹس لیا اور ٹکراؤ پیدا ہوا۔ جہاں کہیں بھی فتنے رونما ہوتے ہیں، چاہے وہ گھر کا فتنہ ہو، میاں بیوی کا مسئلہ ہو، فیکٹری کا فتنہ ہو، سیٹھ نوکر کا مسئلہ ہو، یا علاقہ کا ہو، حکمران اور پبلک کا مسئلہ ہو، جہاں کہیں کوئی بھی جھگڑا ہوتا ہے اگر آپ اس کی بنیاد دیکھیں گے تو یہی ہوگی کہ یا تو اس کے اوپر جو ذمہ داری ہے وہ ادا نہیں کرتا ہے، یا دوسرا مطالبہ کرتا ہے، حالاں کہ شریعت یہ کہتی ہے کہ اگر وہ تمہارے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو تم اس سے مت مانگو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ اس لئے کہ اگر وہ کچھ کمی کوتاہی کر رہے ہیں، اور حق نہیں دیتے تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا۔

آج کل کی سب سے بڑی گڑبڑ

آج کل تو معاملہ یہ ہو گیا ہے کہ ہم لوگوں کے سارے حساب و کتاب دنیا ہی

میں کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی رشتہ دار نے کچھ اچھا سلوک نہیں کیا، تو ہم اس سے یہیں نمٹ لینا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں کے لئے باقی چھوڑنا ہی نہیں چاہتے، یوں سمجھتے ہیں گویا میدانِ حشر میں کچھ ہونے والا ہی نہیں ہے، یہاں ہم ہی سب نمٹا دیں۔ کسی نے گالی دی تو صبر سے کام نہیں لیتے اور کہتے ہیں کہ اب میں تجھے بتاتا ہوں۔ حالاں کہ ہونا یہ چاہیے کہ ہم اپنے کام میں لگے رہیں۔ اگر ہم یوں سوچیں کہ اس نے یہ کیا، فلاں نے وہ کیا، اس سے بدلہ لینا ہے، فلاں سے انتقام لینا ہے، فلاں نے ایسا کیا تو اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے؛ اگر ہم یہی سب کرتے رہیں تو پھر اپنی ذمہ داریاں کہاں ادا کریں گے۔ آج کل ہر جگہ جو گڑ بڑیاں ہو رہی ہیں اس کی وجہ یہی ہے۔ ہر ایک کا یہ حال ہو گیا ہے، سب ہی یہ سوچتے ہیں کہ جو ذمہ دار اعلیٰ ہے وہ ایسا کرے، استاذ کو یوں کرنا چاہیے، اس نے ایسا کیوں کیا، فلاں نے ایسا کیوں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ سب کی پڑی ہوئی ہے، اگر نہیں پڑی ہے تو اپنی نہیں پڑی ہے۔ اپنے اوپر جو ذمہ داریاں ہیں اس کی ادائیگی کا اہتمام نہیں ہے، پھر اگر کسی نے ذرا سا کوئی معاملہ کیا تو فوراً ٹکراؤ کی شکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

وہاں دیر تو ہے، اندھیر نہیں

بیوی کا حق اگر شوہر نے ادا نہیں کیا تو بیوی کو چاہیے کہ وہ اس کا حق ادا کرتی رہے، اور اپنے حق کے متعلق اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی رہے کہ: اے اللہ! میرے شوہر کو توفیق دے کہ وہ میرا حق ادا کرے۔ اگر وہ کوتاہی کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہونے والا ہے، وہاں دیر تو ہے، اندھیر نہیں۔ اس کے عدل و انصاف کا تقاضہ یہی ہے کہ ہر ایک سے پوچھا جائے اور اس کا ظہور قیامت کے روز اس طرح ہوگا کہ اگر سینگ

والی بکری نے بغیر سینگ والی بکری کو مارا ہے، تو اللہ تعالیٰ سینگ والی کا سینگ چھین کر بغیر سینگ والی بکری کو سینگ دیں گے اور کہیں گے کہ اس کو مار لو، حالاں کہ بکری جانور ہے اور جانوروں کے لیے شریعت نہیں آئی ہے، شریعت کے احکام تو ہم انسانوں کے لیے ہیں، لیکن پھر بھی وہاں عدل و انصاف اس طرح ہوگا۔ اسی لیے ہمیں خاص طور پر یہ تعلیم دی گئی ہے۔

آج کل عام طور پر جو فتنے ہو رہے ہیں اس کی بڑی وجہ یہی ہے، لہذا اس بات کا اہتمام ہو کہ ہم پر جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان کو ادا کریں، اور ہمارے حقوق کی ادائیگی میں سامنے والے کی طرف سے اگر کوتاہی ہو رہی ہے تو اگر عافیت کے ساتھ بغیر لڑائی جھگڑے کے مل جاتے ہیں؛ تب تو ٹھیک ہے؛ ورنہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔

بدترین ذمہ دار کی نشانی

۶۵۷:- وعن عائذ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّهُ دَخَلَ عَلَى عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زِيَادٍ، فَقَالَ لَهُ: أَيُّ بُعْثٍ! إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: إِنَّ شَرَّ الرِّعَاءِ الْخَطْبَةُ. فَإِيَّاكَ أَنْ تَكُونَ مِنْهُمْ. (متفق عَلَيْهِ).

ترجمہ:- حضرت عائذ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ عبید اللہ بن زیاد کے یہاں تشریف لے گئے اور (عبید اللہ بن زیاد؛ خلافت بنو امیہ کے زمانہ میں کوفہ کا گورنر تھا) اس سے کہا: اے میرے بیٹے! میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بدترین ذمہ دار وہ ہے جو سخت دل اور سخت مزاج ہو، اس لئے تو ایسا بدترین حکمران مت بنو۔

ایسے حاکم کی طرف اللہ تعالیٰ توجہ نہیں فرمائیں گے

۶۵۸:- وعن أبي مريم الأزدي رضي الله عنه قَالَ لِبُعَاوِيَةَ رضي الله عنه: سَمِعْتُ

رسول اللہ ﷺ یقول: مَنْ وَلَاكَ اللَّهُ شَيْئاً مِنْ أُمُورِ الْمُسْلِمِينَ، فَاحْتَجَبَ دُونَ حَاجَتِهِمْ وَخَلَّتْهُمْ وَفَقَّرَ هُمْ، احْتَجَبَ اللَّهُ دُونَ حَاجَتِهِ وَخَلَّتْهُ وَفَقَّرَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. فجعل معاوية رجلاً على حوائج الناس. (رواه أبو داود والترمذی)

ترجمہ مع تشریح: - حضرت ابو مریم اُزدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سے کہا۔ چوں کہ وہ امیر المؤمنین تھے۔ کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جس آدمی کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار بنایا (یعنی کسی بھی طرح کی حکمرانی عطا فرمائی) پھر اس نے رکاوٹ اختیار کی اور لوگوں کی حاجت سے اپنے آپ کو چھپائے رکھا، ان کی حاجتیں پوری کرنے کے لیے باہر نہیں آیا، اور نہ کسی کو اپنے تک آنے دیا (یعنی باہر پہرے دار بٹھا رکھے، لوگ تو چاہتے ہیں کہ اپنی حاجتیں لے کر اس کے پاس جائیں لیکن وہاں اجازت ہی نہیں ملتی، اور وہ ان کی ضرورتوں اور ان کے فقر کی طرف توجہ نہیں کرتا) تو قیامت کے روز اللہ تبارک و تعالیٰ اس کی حاجت کے درمیان رکاوٹ بنیں گے اور اس کی طرف توجہ نہیں فرمائیں گے (جیسا گناہ کیا تھا قیامت کے روز اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ویسی ہی سزا دی جائے گی) چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب یہ حدیث سنی تو اس بات کا اہتمام کیا کہ لوگوں کی حاجتوں کے لیے باقاعدہ ایک آدمی مقرر کیا (جو لوگوں کی حاجتوں کی تحقیق کرتا رہے اور ان تک پہنچائے۔ یعنی لوگوں کو خود بھی آنے کی ضرورت نہیں، ان کا آدمی خود ہی جا کر تحقیق کرے اور آ کر بتلائے، تاکہ وہ ان کی ضرورتیں پوری کر سکیں)۔

الوالی العادل

انصاف سے پیش آنے والا حکمران

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ

باب کا عنوان

چھپلی مجلس میں بتلایا تھا کہ جو لوگ حکمران اور صاحب اختیار ہیں، جن کے پاس پاورس ہیں، وہ اپنی رعایا کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کریں، اس کی تفصیل آپ کی تھی۔ آج باب قائم کیا ہے: ”أَلُوْا إِلَى الْعَادِلِ“ وہ حکمران جو اپنی رعایا کے ساتھ انصاف سے پیش آتا ہو، اس کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے کیسا اجر و ثواب ملے گا، اور اس کا اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا مقام ہے۔

میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ ہر وہ معاملہ جس کا تعلق دو گروہ اور دو جماعتوں سے ہوتا ہے تو شریعت کی طرف سے دونوں میں سے ہر ایک جماعت کو اس کے مناسب ہدایتیں دی جاتی ہیں، اگر دونوں جماعتیں شریعت کی طرف سے دی گئی ہدایتوں پر عمل کا اہتمام کرتی ہیں؛ تب تو پھر چین ہی چین اور اطمینان ہی اطمینان رہتا ہے۔ اور اگر کوئی ایک جماعت بھی شریعت کی طرف سے بتلائی گئی ان ہدایتوں پر عمل کرتی ہے، تب بھی کوئی فتنہ اور فساد نہیں ہوتا۔ ہاں! اگر دونوں ہی اللہ تعالیٰ کے احکام توڑنے پر تل جائیں اور دونوں میں سے کوئی بھی کسی کا حق ادا کرنے کے لیے تیار نہ ہو؛ تو پھر لڑائی ہوتی ہے۔

یہاں ایسے حکمران کا بیان کیا جا رہا ہے جو عدل و انصاف سے پیش آتا ہو۔ پہلی آیت پیش کی ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ اللہ تعالیٰ انصاف اور بھلائی کرنے کا حکم دیتا ہے کہ ہر ایک کا حق پورا پورا ادا کیا جائے۔ اس آیت کی

تفصیل گزشتہ مجلس میں عرض کر چکا ہوں۔

دشمنوں کے معاملہ میں بھی انصاف

﴿وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ انصاف کرو؛ بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ بلکہ قرآن کریم میں تو یہاں تک تاکید کی گئی ہے: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَنْ لَا تَعْدِلُوا، اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ کسی جماعت کی شاعت اور برائی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کے تقاضوں کو چھوڑ دو۔ یعنی اگر کوئی آدمی آپ کے ساتھ نا انصافی سے پیش آتا ہے تب بھی شریعت آپ کو یہ حکم دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ انصاف کا معاملہ کریں؛ یہی چیز تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ دشمنوں کے معاملہ میں بھی شریعت نے انصاف کے تقاضوں کو پکڑے رہنے کا حکم دیا ہے۔

سایہ دارسات گروہ..... پہلا گروہ

۶۵۹:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ: إِمَامٌ عَادِلٌ. وَشَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ اللَّهِ تَعَالَى. وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِي الْمَسَاجِدِ. وَرَجُلَانِ تَخَافَا فِي اللَّهِ، اجْتَمَعَا عَلَيْهِ، وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ. وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ: إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ. وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتَّىٰ لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ. وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللَّهَ خَالِيًا ففَاضَتْ عَيْنَاهُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں:

سات آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تبارک و تعالیٰ قیامت کے روز میدانِ حشر میں اپنے سائے میں جگہ

دیں گے جبکہ اللہ کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا:-

﴿۱﴾: انصاف کرنے والا حاکم۔

﴿۲﴾: وہ نوجوان جس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں پرورش پائی۔

﴿۳﴾: وہ آدمی جس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو۔

﴿۴﴾: ایسے دو آدمی جنہوں نے آپس میں اللہ کے واسطے اور اللہ کی نسبت پر محبت کی ہو۔

اللہ کی نسبت پر ہی آپس میں ملے، اور اسی نسبت پر جدا ہوئے۔

﴿۵﴾: وہ آدمی جسے اونچے منصب و خاندان والی خوبصورت عورت زنا کاری و بدکاری

کے لیے دعوت دے، لیکن وہ جواب میں کہے: میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔

﴿۶﴾: وہ آدمی جس نے کوئی صدقہ ایسا چھپا کر کیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا

کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔

﴿۷﴾: وہ آدمی جو تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرے اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

افادات:- سات آدمیوں سے مراد مخصوص شخصیتیں نہیں ہیں، بلکہ پوری

جنس مراد ہے، جیسے: ”إِمَامٌ عَادِلٌ“ انصاف کرنے والے حاکم کا تذکرہ ہے، تو یہ کسی

ایک شخصیت کا نام نہیں ہے، بلکہ جب سے شریعتِ مطہرہ جاری ہوئی ہے تب سے قیامت

تک جو بھی آدمی عدل و انصاف کے ساتھ حکمرانی کرے گا، وہ سب اس میں

آجائیں گے۔

اس باب میں یہ روایت اسی مناسبت سے لائے ہیں کہ وہ حکمران جس کے

ہاتھ میں اختیارات ہیں، اور پہلے بتلا چکا ہوں کہ اختیارات کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں،

ایک تو حاکمِ اعلیٰ اور بادشاہِ وقت ہوتا ہے جو سب سے اوپر ہوتا ہے اور اس کی ماتحتی میں

مختلف علاقوں اور صوبوں کے حاکم ہوتے ہیں، پھر ان صوبوں کے جو حصے ہیں، مثلاً:

ضلع اور ضلعوں میں تحصیلیں، یہاں تک کہ گھر کا جو سربراہ ہوتا ہے وہ بھی اس گھر کا حاکم کہلاتا ہے، وہ بھی شریعت کی طرف سے اس بات کا پابند ہے کہ اپنے ماتحتوں کے معاملہ میں عدل و انصاف سے کام لے، نا انصافی کا برتاؤ نہ کرے۔ تو پہلا گروہ ہوا ”إِمَامٌ عَادِلٌ“ انصاف کرنے والا حکمران۔

دوسرا گروہ

”وَشَابٌ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ اللَّهِ تَعَالَى“ وہ نوجوان جس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں پرورش پائی، یعنی اس کی جوانی اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں گزری ہو۔ کیوں کہ عام طور پر جوانی میں نفس کے تقاضے اور خواہشات عروج و شباب پر ہوتی ہیں، وہی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف لے جاتی ہیں، اس لیے جو نوجوان ایسے حالات میں بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری اور اس کی عبادت میں اپنے اوقات کو گزارتا ہو، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی بڑی قدر و قیمت ہے۔

تیسرا گروہ

”وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلِّقٌ فِي الْمَسَاجِدِ“ وہ آدمی جس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ایک نماز کی ادائیگی سے فارغ ہو کر گھر، کاروبار، دوکان یا فیکٹری پر آیا اور اپنے کام میں تو لگا، لیکن اس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہے کہ دوسری نماز کا وقت آنے والا ہے، میں بروقت کیسے مسجد پہنچوں اور اس نماز کو شریعت کے بتلائے ہوئے صحیح طریقہ سے ادا کروں۔ تو اگرچہ وہ اپنے کاروبار کو بھی انجام دیتا ہے، اپنی دوسری ذمہ داریاں بھی پوری کرتا ہے لیکن اس کا دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ مسجد میں لگا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کے فریضہ کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہے۔

چوتھا گروہ

”وَرَجُلَانِ تَحَابَّانِ فِي اللَّهِ اجْتَمَعَا عَلَيْهِ، وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ“ ایسے دو آدمی جنہوں نے آپس میں اللہ کے واسطے اور اللہ کی نسبت پر محبت کی ہو۔ آپس میں ملے تو اللہ ہی کی نسبت پر، اور جدا ہوئے تب بھی اسی نسبت پر۔ اس لیے کہ کچھ ملاقاتیں اور تعلقات وہ ہوتے ہیں جو آدمی اپنی ذاتی اغراض کے پیش نظر قائم کرتا ہے۔ اور کچھ تعلقات وہ ہوتے ہیں جو اللہ کی نسبت پر ہوتے ہیں، اس میں کوئی اپنی ذاتی غرض شامل نہیں ہوتی، وہ ملاقات دین کی اور اللہ کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اپنی ذاتی غرض کے لیے تو سب ہی تعلق و محبت کرتے ہیں، لیکن اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت اور تعلق رکھنا، اسی بنیاد پر ملنا اور اسی بنیاد پر جدا بھی ہونا؛ ایسے دو آدمیوں کی اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی قدرو قیمت ہے، اور قیامت کے روز اللہ تبارک و تعالیٰ ایسوں کو اپنے سائے میں جگہ دیں گے

پانچواں گروہ

”وَرَجُلٌ دَعَا لَهُ امْرَأَةً أَذَاتُ مَنْصِبٍ وَجَمَالٍ، فَقَالَ: إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ“ وہ آدمی جس نے اپنی خواہشات پر ایسا کنٹرول کیا ہے کہ ایسی عورت جو اونچے منصب و خاندان والی ہے اور خوبصورت بھی ہے، اس نے بدکاری کے لیے دعوت دی، تنہائی میں اپنی طرف آمادہ کیا، ایسے موقع پر آدمی عام طور پر اس میں مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن وہ آدمی جواب میں کہتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں، اس کے لیے اس حرکت سے باز رہنے کا ذریعہ صرف اللہ تعالیٰ کا خوف بنا؛ تو قیامت کے روز ایسے آدمی کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں جگہ دیں گے۔

چھٹا گروہ

”وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتَّى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمْيِنُهُ“ وہ آدمی جس نے کوئی صدقہ ایسا چھپا کر کیا کہ بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔ اس لیے کہ صدقہ اگر کھل کر کیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس میں مقصود نام آوری اور شہرت ہو، اس لیے ایسے چھپا کر دیا کہ گویا اس کے دائیں ہاتھ نے خرچ کیا لیکن اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا۔ آدمی کا اس طرح عمل کو انجام دینا انتہائی خلوص کی طرف اشارہ کرتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسا مقبول اور پسندیدہ ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کو بھی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنا سایہ عطا کریں گے۔

ورنہ تو عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ لوگ کھل کر دینے ہی پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ بعد میں بھی ساری دنیا میں اعلانات کرتے پھرتے ہیں کہ میں نے اس کو اتنا دیا اور فلاں کو اتنا دیا۔ اور اگر خدا نخواستہ اس کے چشم و ابرو کا خیال رکھنے میں ذرا سی کوتاہی ہوئی تو پھر اس کی خیر نہیں ہوتی۔ اس لیے کہا گیا کہ یہ جو کچھ کر رہا ہے خالص اللہ کے واسطے اور اللہ تعالیٰ سے اپنا اجر و ثواب حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہے؛ اس لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی بڑی قدر ہے۔

ساتواں گروہ

”وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللَّهَ حَالِيًّا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ“ وہ آدمی جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرے اور اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ تنہائی میں اللہ کو یاد کر کے رونا، یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ غایت تعلق اور انتہائی محبت اور اس کے خوف و خشیت کی علامت ہے، ایسے آدمی کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دیں گے۔

تویہ سات قسم کے آدمی ہیں، جن میں نمبر اول پر حضور اکرم ﷺ نے اس حکمران اور صاحب اختیار کو شمار کرایا جو انصاف سے کام لے۔ اللہ تعالیٰ نے جس آدمی کو جہاں کہیں بھی کچھ اختیارات دیئے ہوں اور ان اختیارات کی نوعیت جیسی بھی ہو، وسیع پیمانے پر ہو، یا محدود طریقہ پر ہو، اپنے گھر میں ہو، اپنے خاندان میں ہو، اپنی برادری میں بڑا عہدہ اور بڑے اختیارات ملے ہوں، پوری جماعت اور برادری کی سربراہی ملی ہو، یا پورے علاقہ کا حاکم ہو، اور وہ اپنے اختیارات کے حدود اور دائرے میں عدل و انصاف سے کام لیتا ہو، تو ان شاء اللہ اس وعدے کا حقدار ہوگا اور یہ بشارت اس کو حاصل ہوگی۔ اسی طرح اپنے گھر میں اپنے ماتحتوں پر، بیوی بچوں پر اور دوسرے اہل خانہ پر جہاں اس کو اختیارات حاصل ہیں، اگر وہ انصاف سے کام لے گا تو اس کے حق میں بھی یہ بشارت پوری ہوگی۔

نور کے منبروں پر ہوں گے

۶۶۰:- وعن عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: إِنَّ الْمُقْسِطِينَ عِنْدَ اللَّهِ عَلَى مَنَابِرٍ مِنْ نُورٍ، الَّذِينَ يَعْدِلُونَ فِي حُكْمِهِمْ وَأَهْلِيهِمْ وَمَا وَلُّوا. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: انصاف کرنے والے اللہ تعالیٰ کے یہاں نور کے منبروں پر ہوں گے، جو اپنے فیصلوں اور اپنے گھروالوں کے معاملہ میں اور جن لوگوں کے اوپر ان کو جو اختیارات دیئے گئے ہیں ان اختیارات کو استعمال کرنے کے معاملہ میں عدل و انصاف سے کام لیتے ہیں۔

افادات:- قیامت کے روز اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو نور کی کرسیوں اور نور

کے منبروں پر بٹھائیں گے، یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ان کا اعزاز و اکرام ہوگا۔ انصاف کرنے والے کون ہیں؟ جو اپنے فیصلوں اور اپنے گھر والوں کے معاملہ میں اور جن لوگوں کے اوپر اس کو حاکم بنایا گیا ہے اور اختیارات دیئے گئے ہیں ان اختیارات کو استعمال کرنے کے معاملہ میں عدل و انصاف سے کام لیتے ہیں، یعنی بلا وجہ کسی کی جانب داری سے، ظلم و زیادتی اور کسی کو ترجیح دینے سے کام نہیں لیتے، بلکہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، اور ماتحتوں کے حقوق کو پورا پورا ادا کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نور کے منبروں پر بٹھائیں گے۔ اور جو ان تقاضوں کو پورا نہیں کریں گے، ان کے لیے یہ بشارت نہیں ہے۔

بہترین اور بدترین حکمرانوں کی علامت

۶۶۱:- عن عوف بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال سمعت رسول اللہ ﷺ يقول: خِيَارُ أُمَمَتِكُمُ الَّذِينَ تُحِبُّونَهُمْ وَيُحِبُّونَكُمْ، وَتُصَلُّونَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّونَ عَلَيْكُمْ، وَشَرُّ أُمَمَتِكُمُ الَّذِينَ تُبْغِضُونَهُمْ وَيُبْغِضُونَكُمْ، وَتَلْعَنُونَهُمْ وَيَلْعَنُونَكُمْ! قَالَ: قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَفَلَا نُنَايِذُهُمْ؟ قَالَ: لَا، مَا أَقَامُوا فِيكُمْ الصَّلَاةَ. لَا، مَا أَقَامُوا فِيكُمْ الصَّلَاةَ. (رواه مسلم)

قَوْلُهُ: ((تُصَلُّونَ عَلَيْهِمْ)): تَدْعُونَ لَهُمْ.

ترجمہ:- حضرت عوف بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: تمہارے حکمرانوں میں بہترین لوگ وہ ہیں جن سے تم محبت کرو، اور جو تم سے محبت کریں، ان کے لیے تم دعائیں کرو اور وہ تمہارے لیے دعائیں کریں۔ اور تمہارے حکمرانوں میں بدترین حکمران وہ ہیں کہ تم ان سے دل میں عداوت رکھو، اور وہ تم سے عداوت رکھیں

تم ان پر لعنت بھیجو، اور وہ تم پر لعنت بھیجیں، وہ تم کو برا کہیں اور تم ان کو برا کہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ایسے حکمرانوں کی اطاعت کا پھندا کیسا ہم اپنی گردنوں سے اتار نہ دیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں! جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز کو قائم کرتے رہیں۔ نہیں! جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز کو قائم کرتے رہیں (وہاں تک ان کو چھینک مت دیجیو۔)

افادات:- دیکھو! آج دنیا کا حال کیا ہے؟ آج کل ہر گھر میں یہی مصیبت ہے۔ اس لیے اپنے گھر والوں میں بھی کون بہترین آدمی ہے اور کون نہیں؟ اس کا اس سے اچھا کوئی معیار نہیں ہے۔ آدمی اپنے متعلق یہ سمجھنا چاہتا ہو کہ میرا تعلق اپنے ماتحتوں کے ساتھ کیسا ہے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا بہترین معیار بتلایا کہ وہ آپ سے محبت کرتے ہیں اور آپ ان سے محبت کرتے ہو۔ وہ آپ کے لیے دعا کرتے ہیں اور آپ ان کے لیے دعا کرتے ہو۔ وہ آپ کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں اور آپ ان کے لیے بے چین ہو جاتے ہو؛ یہ ”خِيَارُ أُمَّتِكُمْ“ بہترین حکمران کی علامت ہے۔ اس لیے اگر آپ کو بھی معلوم کرنا ہے کہ اپنے ماتحتوں کے درمیان میں آپ کا معاملہ کیسا ہے؟ آپ کو جو اختیارات دیئے گئے ہیں ان کے استعمال میں آپ صحیح ہیں یا غلط؟ تو دیکھ لو کہ آپ کے ماتحت آپ سے محبت کرتے ہیں اور آپ بھی ان کے ساتھ محبت کرتے ہو؟ آپ ان کو دل سے چاہتے ہو اور وہ بھی آپ کو دل سے چاہتے ہیں؟ آپ ان کے لیے دل سے دعائیں کرتے ہو اور وہ بھی آپ کے لیے دل سے دعائیں کرتے ہیں؟ اگر آپ کو ذرا سی گزند پہنچے تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں اور رونے لگتے ہیں آپ کے لیے دعائیں کرنے لگتے ہیں، اور اگر ان کو کچھ ہو جائے تو آپ بے حسین ہو جاتے ہو، ان کے لیے آپ دعائیں کرنے لگ جاتے ہو، وہ آپ سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں اور آپ بھی ان سے محبت رکھتے ہو؟ اگر ایسا ہے تب تو سمجھ جاؤ کہ معاملہ

برابر ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے، تو سیدھی بات ہے کہ معاملہ الٹا ہے۔
 ویسے تو ہر آدمی اپنے طور پر یہی دعویٰ کرتا ہے کہ میرا معاملہ برابر ہے، اپنے
 آپ کو کون غلط کہتا ہے، لیکن حضور اکرم ﷺ نے اس کی یہ علامت بتلا دی۔

نظام سلطنت کے بقاء کی اہمیت

جب حضور اکرم ﷺ نے بدترین حکمرانوں کی یہ علامت بتلائی کہ تم ان سے
 بغض رکھو، وہ تم سے بغض رکھیں، تم ان سے دشمنانہ رکھو، وہ تم سے دشمنانہ رکھیں، تم
 ان کو برا بھلا کہو اور لعنت ملامت کرو، اور وہ تم کو برا بھلا کہیں، تم پر لعنت ملامت کریں، تم
 ان کے لیے بد دعائیں کرو اور وہ تمہارے لیے بد دعائیں کریں، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے
 عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ایسے حکمرانوں کی اطاعت کا بچھندا ہم اپنی گردنوں سے اتار نہ
 دیں؟ یعنی جو حکمران ایسے ہوں تو ان کی بات ماننے کی کیا ضرورت ہے، ان کو گولی مارو؛
 ہم ان سے بغاوت نہ کر لیں؟ تو آپ ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔

دیکھو! شریعت نظام کو باقی رکھنے کا کتنا اہتمام کرتی ہے! ان کی علامت تو
 بتلائی گئی، لیکن اس کے باوجود آگے کہہ رہے ہیں کہ ان کی اطاعت کی جو ذمہ داری تم پر
 عائد ہوتی ہے، اس سے آپ اپنے آپ کو نکال نہیں سکتے، جب تک کہ وہ تمہارے
 درمیان نماز کو قائم کرتے رہیں وہاں تک ان کو پھینک مت دیجیو۔ یعنی یہ حکمران جب
 تک تھوڑا بہت بھی دین کو قائم کر رہے ہیں، نمازیں قائم کر رہے ہیں، ظاہری طور پر دین
 پر ہیں، تو پھر ان سے ان کی اطاعت کا جو عہد و پیمان آپ نے کیا ہے اس کو چھوڑ نہیں
 سکتے۔ ہاں! اگر وہ کفر میں مبتلا ہو جائیں، بلکہ بعض روایتوں میں یہاں تک ہے: ”إِلَّا أَنْ

تَرَوْا كُفْرًا بَعْدَ عَهْدٍ كُفْرًا مِنْ اللَّهِ فِيهِ بُرْهَانٌ“ (بخاری، باب قول النبي ﷺ: مَنْ عَاهَدَ بَعْضُكُمْ عَلَى شَيْءٍ وَكُنَ أُخْرَىٰ أُولَٰئِكَ لَا بَأْسَ عَلَيْهِمْ لَمَتَ اللَّهِ عَلَيْهِمْ وَلِيَالِهِمْ)۔

تُنْكِزُ وَتَهْأَلُ حَدِيثُ رَقْم: ۵۰۶۱) جب کھلم کھلا کفر کرنے لگیں، اور بالکل اسلام سے ہٹ جائیں تو پھر تمہارے اوپر ان کی اطاعت کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ شریعت نے حکمرانوں کی زیادتیوں کے باوجود ان کی اطاعت سے نکلنے کی اجازت نہیں دی۔ یہی معاملہ گھر کے ذمہ دار کا ہے کہ اگر گھر کے بڑے کی طرف سے زیادتی ہو رہی ہے تو شریعت یہ ضرور کہے گی کہ وہ غلطی پر ہے، اور اس کی علامتیں بھی بتلا دیں، لیکن اس کے باوجود آپ کو یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ آپ ان کی اطاعت سے نکل جائیں، آپ کو تو ہر حال میں ان کی اطاعت کرتے رہنا ہے۔

تین جنتی

۶۶۲:- وَعَنْ عِيَاذِ بْنِ حَمَارٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: أَهْلُ الْجَنَّةِ ثَلَاثَةٌ: ذُو سُلْطَانٍ مُقْسِطٌ مُوَفَّقٌ، وَرَجُلٌ رَحِيمٌ رَقِيقُ الْقَلْبِ، لِكُلِّ ذِي قُرْبَى وَمُسْلِمٍ، وَعَفِيفٌ مُتَعَفِّفٌ ذُو عِيَالٍ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جنت والے تین ہیں؛ ایک تو وہ حکمران جس کے پاس پاؤں پادری ہے پھر بھی وہ انصاف کرنے والا ہے، اور اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کی توفیق دی گئی ہے۔ دوسرا وہ آدمی جو ہر رشتہ دار اور مسلمان کے لیے مہربان اور نرم دل ہے۔ اور تیسرا وہ بال بچے والا جو اپنے آپ کو سوال کے تقاضوں سے بچاتا ہو۔

افادات:- بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی اس کو ڈانٹتے ہیں کہ ارے یار! تم اتنے پیٹھے کیوں بنتے ہو، سب لوگ تم کو ہڑپ کر جائیں گے (خود سے تو کچھ بھلائی ہوتی نہیں، اور دوسرے کچھ کرتے ہیں تو ان کو بھی روکنے کی کوششیں کی

جاتی ہیں) تب بھی وہ کہتا ہے کہ جس کو جو کرنا ہے اس کو وہ کرنے دو، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بڑا اجر ہے۔

اور وہ بال بچے والا جو اپنے آپ کو سوال کے تقاضوں سے بچاتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ چوں کہ وہ بال بچے والا ہے اس لئے یہ احتمال تھا کہ وہ اپنی ضرورتوں کی زیادتی کی وجہ سے کسی کے سامنے اپنی ضرورتیں پیش کرے، لیکن وہ کسی سے سوال نہیں کرتا، جو ضرورت ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی سے مانگتا ہے؛ تو ایسا آدمی بھی جنتی ہے۔

وُجُوبُ طَاعَةِ وَلَاةِ الْأُمُورِ فِي غَيْرِ
مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْبَعْصِيَةِ
حاکموں کی اطاعت کے احکام
(مجلس ۱)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حاکم کے حکم دینے کی وجہ سے جائز کام واجب ہو جاتا ہے

اس باب میں یہ بتلاتے ہیں کہ رعایا پر اپنے حکمرانوں کی اطاعت کن چیزوں

میں ضروری ہے؟

حکمرانوں کی طرف سے دیا جانے والا کام گناہ کا نہ ہو، بلکہ جائز کام ہو تو حاکم کی حکمرانی کی وجہ سے وہ جائز کام واجب کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ ماں باپ کا بھی مسئلہ یہی ہے، اس لیے ماں باپ اگر اولاد کو ایسے کام کا حکم دیں جو جائز ہے، تو ماں باپ کے حکم دینے کے بعد وہ کام واجب ہو جاتا ہے۔

ماں باپ کے لیے اہم نصیحت

اسی لیے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ماں باپ کو چاہیے کہ اپنے الفاظ کو استعمال کرنے میں احتیاط سے کام لیں، اگر اولاد سے کوئی کام کروانا چاہتے ہیں تو یوں نہ کہیں کہ ایسا کرو۔ اس لیے کہ اگر اولاد وہ کام نہیں کرے گی تو ماں باپ کی حکم عدولی کرنے کی وجہ سے گنہگار ہوگی اور یہ حرکت نافرمانی قرار دی جائے گی۔ اور ماں باپ کی نافرمانی پر جو وعیدیں ہیں اس کی حق دار بن جائے گی اور مصیبتوں میں پڑے گی اور کوئی ماں باپ اپنی اولاد کے لئے ایسا نہیں چاہتے۔ لہذا ماں باپ کو یوں کہنا چاہیے کہ: بیٹا! ایسا ہو جائے تو اچھا ہے۔ اگر اس طرح ہو جائے تو ٹھیک ہے۔ اور اولاد کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ ماں باپ کی یہ خواہش ہے، اگرچہ وہ صاف لفظوں میں حکم نہیں دے رہے ہیں، لیکن ان کی منشاء یہی ہے، اور ان کا جی یہی چاہتا ہے تو اس کے مطابق عمل کرے۔

بہر حال! جس کو بھی آپ پر حکمران اور سربراہ بنایا گیا ہے، اس کی طرف سے کسی ایسے کام کا حکم دیا جائے جو گناہ نہیں ہے، بلکہ جائز ہے؛ تو اس حکمران کے حکم کے نتیجہ میں وہ کام ضروری اور واجب ہو جاتا ہے۔

سربراہ کی بات ماننے کے حدود

ایک بات یاد رکھیے کہ سربراہی کی نوعیتیں مختلف ہیں۔ کچھ سربراہی محدود ہوتی ہے، اور کسی کو عام سربراہی حاصل ہوتی ہے۔ جیسے: حاکم اعلیٰ اور پورے ملک کے بادشاہ کو عمومی سربراہی حاصل ہے۔ بعضوں کو مختلف شعبوں میں سربراہی حاصل ہوتی ہے، مثلاً: آپ نے کسی کے یہاں ملازمت اختیار کی اور اس کو اپنا بڑا مان لیا، تو وہ مالک اور سیٹھ اگر اس شعبہ سے متعلق کسی جائز کام کا حکم کرتا ہے تو آپ کے لیے اس کا حکم ماننا ضروری ہے۔ لیکن اگر وہی سیٹھ آپ کو اس شعبہ سے ہٹ کر کسی دوسرے کام کے متعلق کہتا ہے، مثلاً: آپ کا سیٹھ آپ کو یوں کہے کہ تو تیری بیوی کو طلاق دیدے؛ تو وہاں سیٹھ صاحب کا حکم نہیں مانا جائے گا۔ سیٹھ صاحب کا حکم دوکان، فیکٹری اور آفس سے متعلق جو بھی جائز کام ہیں، وہیں تک مانا جائے گا۔ اگر ناجائز کام یا شریعت کے خلاف کسی بات کے لیے کوئی بھی کہے؛ تو اس پر عمل کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

نافرمانی میں فرمانبرداری نہیں

”وَتَحْرِيمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ“ گناہ اور نافرمانی کے کاموں کا حکم اگر بادشاہ وقت بھی دے، اور باقاعدہ فرمان جاری کر دے؛ تب بھی اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے کہ جتنے بھی حکمران ہم پر بڑے بنائے گئے ہیں، ہم ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے ہی کرتے ہیں۔ میں پہلے بھی کسی موقع پر بتلا چکا ہوں کہ

مؤمن کا اصل تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے، ایک آدمی جب یہ کہتا ہے کہ میں ایمان لایا تو اس نے اپنا تعلق اللہ تعالیٰ سے جوڑ دیا، اب اُدھر سے جو کہا جائے گا وہی کیا جائے گا۔ اولاد ماں باپ کی فرمانبرداری کے لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ماں باپ کی فرمانبرداری کا حکم دیا ہے۔ آدمی اپنے بڑوں کی عزت اور ان کا احترام اس لیے کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اپنے بڑوں کی عزت و احترام کرو، جو آدمی ایسا نہیں کرتا وہ برا سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح بیوی کا حق ادا کرتا ہے، اس کی فرمائشیں حق سمجھ کر اس لیے پوری کرتا ہے کہ شریعت نے اس کے حقوق کے ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ بیوی شوہر کی بات اس لیے مانتی ہے کہ جس پر وہ ایمان رکھتی ہے اس نے حکم دیا ہے کہ شوہر کی اطاعت کرو، اولاد پر ماں باپ شفقت کا معاملہ کرتے ہیں اور ان کی ضرورتوں کا خیال اس لیے رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ جب اصل بات یہ ہے تو اب وہی شوہر، وہی ماں باپ، وہی بیوی، وہی اولاد، کوئی ایسی حرکت کرنے کے لیے کہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہو، اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی ہو، تو ہم کہیں گے کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے کہنے سے تمہاری بات مانتے تھے، اب اگر تم ہم کو اللہ تعالیٰ ہی سے توڑنا چاہتے ہو، تو یہ کسی حال میں قابلِ برداشت نہیں ہوگا۔ معلوم ہوا کہ مؤمن کا اصل رشتہ اور تعلق اللہ تعالیٰ سے ہی ہوتا ہے۔

مؤمن کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کی مثال

میں نے مثال بھی دی تھی کہ آپ کے گھر میں جو فون ہوتا ہے اس کا کنکشن ٹیلیفون ایکسچینج کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی ٹیلیفون ایکسچینج کے ساتھ دوسرے بہت سارے فون بھی جڑے ہوئے ہوتے ہیں، یہاں تک کہ آپ کے پڑوس میں مکان ہے جس کی

دیواریں بالکل آپ کے گھر سے لگی ہوئی ہیں، اگر آپ اس کے فون پر بھی کال (Call) کریں گے تو وہ سیدھی اس کے فون پر نہیں جائے گی، بلکہ پہلے ٹیلیفون ایکسچینج جائے گی اور وہاں سے اُدھر آئے گی۔ وہ جواب دے گا تو وہ بھی ڈائرکٹ (Direct) آپ کے فون پر نہیں آئے گی بلکہ انڈائرکٹ (In Direct) آئے گی۔ اگر آپ کا تعلق ٹیلیفون ایکسچینج سے ختم ہو جائے گا تو پڑوسی سے بھی ختم ہو جائے گا، حالاں کہ وہ بالکل پڑوس میں ہے، لیکن ایکسچینج کے واسطے سے بات ہو رہی ہے۔ ایسے ہی جن جن لوگوں کے ساتھ مؤمن کا تعلق ہے وہ اللہ تعالیٰ کے واسطے سے ہے، درمیان میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہی واسطہ ہے۔ اس لیے چاہے باپ ہو، یا شوہر ہو، یا کوئی اور بڑا ہو، اگر وہ کسی ایسے کام کے کرنے کا حکم دیتے ہیں جو ناجائز ہے، شریعت نے جس کام کی اجازت نہیں دی ہے، تو ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی، اور نہ کرنے پر کوئی گناہ بھی نہیں ہوگا، بلکہ آدمی کے لیے لازم اور ضروری ہے کہ ایسا کام نہ کرے، اگر ایسا کام کرے گا تو گنہگار ہوگا۔

پریشان ہونے کی ضرورت نہیں

بعض مرتبہ لوگ آکر کہتے ہیں کہ اب ایسی بات کا حکم دیتے ہیں جو گناہ ہے، اور جب میں نہیں مانتا تو اب کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ میری بات مانو۔ پھر بھی میں نہیں مانتا تو اب ناراض ہو کر مجھے بددعا دیتے ہیں؛ اب میں کیا کروں؟ میں ان سے کہتا ہوں کہ: بھائی! اب کی بددعا کو عمل میں کون لائے گا؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی عمل میں لائیں گے۔ اگر اب کے ہاتھ میں کچھ ہوتا تو وہ کچھ کر کے نہ بتلاتا؟ صرف بددعا کر کے چپ چاپ کیوں بیٹھا رہتا؟ معلوم ہوا کہ بددعا کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی سے

کہہ رہا ہے کہ: اے اللہ! یہ میری بات نہیں مانتا ہے، اس لیے اس کا ایسا کر ڈالیو۔ اور اللہ تعالیٰ بھی جانتے ہیں کہ وہ کس بنیاد پر ایسا کہہ رہا ہے، اس نے میرے ایک بندہ کو میرے ہی حکم کی خلاف ورزی کرنے کا حکم دیا تھا، اور اس نے وہ بات نہیں مانی تھی، اس پر وہ بددعا کر رہا ہے؛ تو اب اس کی بددعا تھوڑے ہی قبول کی جائے گی؟ لہذا ایسے موقع پر ذرا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ.....

۶۲۳: عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبی ﷺ قَالَ: عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ اللَّهُ - مَجْعُ الطَّاعَةِ
فِيمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ، إِلَّا أَنْ يُؤْمَرَ بِمَعْصِيَةٍ، فَإِذَا أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی بھی حکمران کی طرف سے جب حکم دیا جائے، تو مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس کو سننے مانے اور اس پر عمل کرے، چاہے جو چیز کرنے کے لیے کہی گئی ہے وہ اس کی طبیعت کو پسند ہو، یا ناپسند ہو (بس صرف یہ دیکھا جائے گا کہ گناہ کے کام کا حکم تو نہیں ہے، اگر کسی جائز چیز کا حکم ہے، تو چاہے آپ کی طبیعت کو پسند ہو یا نہ ہو، طبیعت اس کے لیے آمادہ ہو یا نہ ہو؛ اس کو ماننا ضروری ہے۔ ہاں!) اگر گناہ کا حکم دیا جائے تو (آپ ادب کے ساتھ بتلا دو کہ آپ کی) یہ بات سننے اور عمل کے قابل نہیں ہے۔

۶۲۴:- وَعَنْهُ قَالَ: كُنَّا إِذَا بَايَعْنَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، يَقُولُ لَنَا: فِيمَا اسْتَطَعْتُمْ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب ہم نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر (کسی بھی حاکم کی بات) سننے اور اس کو ماننے کے بارے میں عہد کرتے تھے تو آپ یہ

قید لگا دیا کرتے تھے کہ جتنی طاقت و قدرت میں ہوگی (اتنی ضرور سنیں گے اور مانیں گے)۔

..... جاہلیت کی موت مرے گا

۶۶۵:- وعنه قال: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: مَنْ خَلَعَ يَدَ أَمْرٍ طَاعَةِ لِقَى اللَّهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا حُجَّةَ لَهُ، وَمَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ، مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً. (رواه مسلم)

و فی روایۃ لہ: وَمَنْ مَاتَ وَهُوَ مُفَارِقٌ لِلْجَبَاعَةِ، فَإِذَا تَمَّتْ مِيتَتُهُ جَاهِلِيَّةً.

((المِيتَةُ)) بکسر المیم۔

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس نے اپنے امیر اور حاکم کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملے گا کہ اپنے اس جرم کے اوپر معذرت کے واسطے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی (یعنی اس کے پاس کوئی عذر اور دلیل ایسی نہیں ہوگی جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو اپنے حاکم کی نافرمانی کی سزا سے بچا سکے۔ جب اسلامی حکومت ہوتی ہے تو حکومت کا جو حکمران اعلیٰ اور بادشاہ وقت ہوتا ہے، لوگ اس کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، ہاتھ میں ہاتھ دے کر وعدہ اور عہد و پیمان کرتے ہیں کہ ہم آپ کی اطاعت کریں گے، آپ کا حکم مانیں گے۔ تو حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ) جو آدمی ایسی حالت میں مرا کہ اس نے کسی ایسے مسلمان حاکم (جس کو باقاعدہ حکومت کا سربراہ مقرر کیا گیا ہے اس) کے ہاتھ پر اطاعت کی بیعت نہیں کی؛ تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

انفادات:- زمانہ جاہلیت میں اس طرح کا کوئی نظام نہیں تھا اور جس وقت

نبی کریم ﷺ جزیرۃ العرب میں مبعوث ہوئے اس وقت بھی کوئی بادشاہت نہیں تھی، ہر قبیلے کا اپنا اپنا الگ الگ نظام ہوتا تھا، اور ہر قبیلے میں مختلف سردار ہوتے تھے، کوئی اس کی مان رہا ہے، کوئی اُس کی مان رہا ہے، کسی ایک کی اطاعت و فرمانبرداری پر کسی کا اتفاق نہیں تھا، لیکن اسلام نے آکر پورا ایک نظام قائم کیا اور ایک آدمی کی اطاعت کے لیے سب کو آمادہ کیا، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو آدمی بغیر بیعت کے انتقال کرے گا تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

ہر حکمران کی بات سنو اور مانو؛ چاہے.....

۶۶۶:- وعن أنس بن مالك رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: اَسْمَعُوا وَأَطِيعُوا،

وإن استُعِبلَ عليكم عبدٌ حبشيٌّ، كَأَنَّ رَأْسَهُ زَبِيْبَةٌ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم اپنے حکمرانوں کی بات سنو اور اس پر عمل کرو، چاہے تم پر کسی حبشی غلام کو حاکم بنایا جائے اور وہ بھی ایسا حبشی غلام ہو کہ جس کا سر اتنا چھوٹا ہو جیسے کشمش (کالی دراک) ہوتی ہے۔

افادات:- بعض حبشی ایسے ہوتے ہیں جن کے سر چھوٹے ہوتے ہیں۔

تو ویسے بھی عرب اور تمام اقوام میں حبشی سب سے کمتر سمجھے جاتے ہیں، اور اس میں بھی جو غلام ہو تو وہ اور زیادہ کمتر سمجھا جاتا ہے، اور پھر وہ غلام بھی چھوٹے سرو والا ہو، تو اس کی تو کوئی وقعت ہی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر حاکم اعلیٰ کی طرف سے کسی ایسے غلام کو بھی کسی جگہ کا حاکم بنادیا جائے جو پہلے غلام تھا؛ تو اس کی اطاعت ضروری ہے۔

ویسے یہ مسئلہ اپنی جگہ پر الگ ہے کہ جو خود غلام ہو اس کو کسی طرح کی حکمرانی سونپی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اس کو کسی ماتحت جگہ کا حاکم بنایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ یہاں

مطلب یہ ہے کہ پہلے وہ غلام تھا، اب غلامی سے آزاد ہو چکا ہے، لیکن سیاہ فام ہے اور ظاہری شکل و صورت اور جسم کے اعتبار سے ایسا نہیں کہ جس کو دیکھ کر کسی کے دل میں اس کی وقعت پیدا ہوتی ہو، ایسے آدمی کو بھی اگر تمہارے اوپر نگران اور حاکم مقرر کر دیا گیا ہو تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس کی بات بھی کو سنو اور مانو۔

ہر حال میں مانو

۶۶۷:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: عَلَيْكَ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِي عُسْرِكَ وَيُسْرِكَ، وَمَنْشَطِكَ وَمَكْرَهِكَ، وَأَثَرَةٍ عَلَيْكَ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارے لیے ضروری ہے کہ اپنے حکمران کی بات سنو اور اس کی اطاعت اور فرماں برداری کرو، فقیری کی حالت میں ہو یا مال داری کی حالت میں ہو (ایسا نہیں کہ جیب خالی ہے تو حکم مانتے رہے، لیکن جب دو پیسے آگئے تو ماننے کے لیے تیار نہیں) اور تمہاری طبیعت اس حکم کو ماننے کے لیے آمادہ ہو یا نہ ہو (تمہارا موڈ ہو یا نہ ہو) اور تمہارے مقابلہ میں جب دوسروں کو ترجیح دی جائے (تب بھی ماننا ضروری ہے)

افادات:- ”مَنْشَطِكَ وَمَكْرَهِكَ“ کا مطلب یہ ہے کہ ہر حال میں ماننا ہے۔ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ موڈ میں آئے تو اپنے ابا کی بات پر عمل کر لیا، ورنہ نہیں کیا، ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ان کی بات کو تو ہر حال میں ماننا ہی ہے، بس شرط ایک ہی ہے جو اوپر گزر چکی کہ گناہ کے کام کا حکم نہ دیا جا رہا ہو۔

..... تو پھر تم میں اور اجنبی میں فرق ہی کیا؟

”وَأَثَرَةٍ عَلَيْكَ“ ایک تو یہ کہ ابا آپ کو خوب پیسے دے رہے ہیں، کھلا پلا رہے

ہیں، اس وقت آپ ابنا کی بات مان رہے ہیں، اسی طرح حاکم کی طرف سے خوب نوازشات کا معاملہ چل رہا ہے، داد و دہش ہو رہی ہے، اس وقت تو مانتے ہیں، حالاں کہ ایسے وقت تو سب ہی مانتے ہیں، لیکن جب آپ کے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دی جا رہی ہے، مثلاً: چار بھائی ہیں، تین بھائیوں کے ساتھ ابنا بہت اچھا معاملہ کر رہے ہیں، آپ کو تو ایک پائی بھی نہیں دیتے، ان کو اچھے اچھے کپڑے لا کر دے رہے ہیں، لیکن آپ کو کبھی اچھا سوٹ لا کر نہیں دیا، ان کی ساری فرمائش پوری ہوتی جا رہی ہیں، اور آپ کی ایک فرمائش بھی پوری نہیں کی، پھر بھی ابنا یہ حکم دیں کہ تمہیں ایسا کرنا ہے، تو حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ان کی بات مانو اور ویسا ہی کرو۔ یوں مت کہنا کہ ان تینوں بھائیوں کی باتیں تو مانی جائیں اور ان کی فرمائشیں پوری کی جائیں، میرا تو آج تک کبھی کچھ کیا ہی نہیں؛ اب میں آپ کی بات کیسے مانوں؟ ارے بھائی! اس بنیاد پر بات مانی جائے گی تو پھر تمہارے اور اجنبی میں فرق ہی کیا رہا؟ تم پر جو اطاعت ضروری قرار دی گئی وہ تو ہر حال میں ضروری ہے، بس شرط ایک ہی ہے کہ گناہ کے کام کے لیے نہ کہا جائے۔

کسی حاکم یا بڑے کی طرف سے کسی کے ساتھ کوئی خصوصی معاملہ کیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے وہ اطاعت کرتا ہے، تو وہ تو اطاعت کرے گا ہی، لیکن آپ کے ساتھ کوئی خصوصی معاملہ نہیں کیا بلکہ آپ کے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دی جا رہی ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کی جماعت کا چیرمین دوسرے کو ترجیح دے رہا، اور آپ کی بات کی طرف دھیان نہیں دیتا، تب بھی چیرمین چوں کہ چیرمین (Chair Man) ہے، اس لیے آپ بات مان رہے ہیں؛ تب تو برابر ہے۔ ورنہ آپ کو اگر لڈ وکھلا رہا ہے اور آپ اس کی بات مان رہے ہیں؛ تو کیا فرق پڑتا ہے۔

کہنے کا حاصل یہی ہے کہ اپنے حکمران اور سربراہ کی اطاعت ہر حال میں کرنی

ہے، چاہے وہ آپ کے ساتھ اچھا سلوک رکھتا ہو، یا نہ رکھتا ہو۔ آپ کے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دیتا ہو تب بھی آپ کو اس کا حکم ماننا ہے، بس ایک شرط ہے کہ وہ کوئی گناہ کے کام کا حکم نہ دیتا ہو۔ اور اسی شعبہ سے متعلق حکم کو ماننا لازم ہے جس شعبہ میں آپ اس کے ماتحت ہیں جیسا کہ میں نے اوپر مثال دے کر بتلایا تھا۔

وُجُوبُ طَاعَةِ وَلَاةِ الْأُمُورِ فِي غَيْرِ
 مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْبَعْصِيَةِ
 حاکموں کی اطاعت کے احکام
 (مجلس ۲)

کیم ذی قعدہ ۱۴۲۱ھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۲۷ جنوری ۲۰۰۱ء

بنیادی اصول

باب کا عنوان قائم کیا ہے کہ: حکمران اگر ایسا حکم دے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہوتی ہو، تو ان کے حکم کو ماننا واجب اور ضروری ہے۔ اور اگر وہ کوئی ایسا حکم دے جس کے بجالانے میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی ہوتی ہے، تو پھر اس کو پورا کرنا اور اس پر عمل کرنا حرام ہے۔ اسی مناسبت سے روایتیں لارہے ہیں۔

پہلے بھی میں نے بتلایا تھا کہ مسلمان کا اصل تعلق تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے، جب وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے تو اسی کے حکم سے دوسرے لوگوں کی اطاعت کرتا ہے، اگر ماں باپ کا حکم مانتا ہے تو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کی اطاعت کو ضروری قرار دیا ہے۔ بیوی اگر شوہر کا حکم مانتی ہے تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے شوہر کی اطاعت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اسی طرح کوئی ماتحت اپنے سربراہ کا کوئی حکم مانتا ہے تو وہ اسی لیے کہ شریعت نے اس کی اتباع اور فرمانبرداری کا حکم دیا ہے، مؤمن کا اصل تعلق اور رشتہ تو اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ ہی ہے، اس کے بعد وہ ان سارے لوگوں کے احکام کو اللہ تعالیٰ ہی کے حکم کی وجہ سے مانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے احکام کو اپنے دائرے اور حدود میں واجب الاطاعت قرار دیا ہے۔ اس میں بنیادی اصول بتلادیا گیا تھا کہ جب کسی کا کوئی حکم ایسا ہو جس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو تو پھر ان کے کسی حکم پر عمل نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے ان کے حکم پر عمل کرتے تھے، بلکہ ان کے حکم کی تعمیل کو اپنی سعادت سمجھتے تھے، لیکن جب وہی ایسی بات کا حکم دے رہے ہیں جس پر عمل کرنے کے نتیجے میں

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہے؛ تو پھر ان کے حکم کو ہم رد کر دیں گے۔

امتِ محمدیہ کی فتنوں سے سلامتی

۶۲۸:- وعن عبدِ اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما قَالَ: كُنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي سَفَرٍ فَكَزَلْنَا مَمْزِلًا، فَمِنَّا مَنْ يُصْلِحُ خَبَاءَهُ، وَمِنَّا مَنْ يَنْتَضِلُّ، وَمِنَّا مَنْ هُوَ فِي جَشَرٍ ۖ إِذْ نَادَى مُنَادِي رَسُولِ اللَّهِ ﷺ: الصَّلَاةُ جَامِعَةٌ. فَاجْتَبَعْنَا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ: إِنَّهُ لَمْ يَكُنْ نَبِيٌّ قَبْلِي إِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَيْهِ أَنْ يَدُلَّ أُمَّتُهُ عَلَى خَيْرٍ مَا يَعْلَمُهُ لَهُمْ، وَيُنْذِرَهُمْ شَرًّا مَا يَعْلَمُهُ لَهُمْ. وَإِنَّ أُمَّتَكُمْ هَذِهِ جُعِلَ عَافِيَتُهَا فِي أَوَّلِهَا، وَسَيُصِيبُ آخِرَهَا بَلَاءٌ وَأُمُورٌ تُنْكَرُونَهَا، وَتَجِيءُ فِتْنَةٌ يُرَقِّقُ بَعْضُهَا بَعْضًا، وَتَجِيءُ الْفِتْنَةُ فَيَقُولُ الْمُؤْمِنُ: هَذِهِ مُهْلِكَتِي، ثُمَّ تَنْكَشِفُ، وَتَجِيءُ الْفِتْنَةُ فَيَقُولُ الْمُؤْمِنُ: هَذِهِ هَذِهِ. فَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُرْحَظَ عَنِ الدَّارِ، وَيُدْخَلَ الْجَنَّةَ، فَلْيَأْتِهِ مِنْ يَتُّهُ وَهُوَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَلْيَأْتِ إِلَى النَّاسِ الَّذِي يُحِبُّ أَنْ يُؤْتَى إِلَيْهِ. وَمَنْ بَايَعَ إِمَامًا فَأَعْطَاهُ صَفْقَةً يَدِهِ، وَثَمَرَةً قَلْبِهِ، فَلْيُطْعِمْهُ إِنْ اسْتَطَاعَ، فَإِنْ جَاءَ آخَرُ يُنَازِعُهُ فَاصْطِرْبُوا عَنْقَ الْآخِرِ.

ترجمہ مع مختصر تشریح:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما

فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے، دورانِ سفر آرام کی ضرورت پیش آئی تو ہم نے ایک جگہ پر قیام کیا۔ اس دوران کوئی آدمی اپنے خیمے کو درست کر رہا تھا، کوئی آدمی نیزے بازی کی مشق کر رہا تھا، اور کوئی آدمی اپنے مویشیوں میں مشغول تھا (اس لئے کہ جب کسی جگہ پر ٹھہرتے ہیں تو ہر ایک اپنی اپنی ضرورتیں پوری کر لیتا ہے) اتنے میں نبی کریم ﷺ کے منادی نے آواز دی: اَلصَّلَاةُ جَامِعَةٌ (حضور اکرم ﷺ صحابہ کو کسی خاص بات بتلانے

کے لئے یا کسی خاص پیغام کو ان تک پہنچانے کے لئے اگر فوری طور پر جمع کرنا چاہتے تو اس کے لئے ان الفاظ میں اعلان کراتے تھے۔ مقصد ہوتا تھا کہ فوراً آجاؤ (چناں چہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس جمع ہو گئے اس وقت نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: مجھ سے پہلے جو بھی نبی آئے ان پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے یہ ضروری قرار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی امت کو ہر ایسی چیز کی طرف رہنمائی کریں جسے اُس امت کے لئے بھلائی کا ذریعہ سمجھتے ہوں۔ اور ان کو اس برائی سے ڈرائیں جو ان کے حق میں وہ بری سمجھتے ہوں۔ پھر ارشاد فرمایا: ہماری اس امت - یعنی امت محمدیہ - کی فتنوں سے سلامتی اللہ تعالیٰ نے اس کے شروع میں رکھی ہے، البتہ اس امت کے بعد میں آنے والے حصے اور طبقے کو کچھ آزمائشیں اور کچھ ایسی چیزیں پیش آئیں گی جن کو تم اُپر اور اجنبی سمجھتے ہو۔ اس امت کے آخری زمانہ میں ایسے فتنے آئیں گے کہ ایک فتنہ دوسرے فتنے کو کم کر کے دکھلائے گا اور صورتِ حال یہ ہوگی کہ ایک فتنہ آئے گا اور ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے کہ جس میں آدمی کے لیے حق و باطل میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے گا، ایسے موقع پر ایک مؤمن یوں کہے گا کہ یہ فتنہ تو مجھے ہلاک ہی کر ڈالے گا (مطلب یہ ہے کہ ہر بعد میں آنے والا فتنہ پہلے والے فتنہ سے بڑا ہوگا۔ ایک فتنہ جب آئے گا تو اس کو دیکھ کر آدمی یوں سمجھے گا کہ یہ فتنہ بہت بڑا ہے اور اس فتنہ کی کیفیت کو دیکھ کر مؤمن اپنے ایمان کے متعلق خطرہ محسوس کرے گا اور یوں کہے گا یہ مجھے ہلاک کر دے گا۔ پھر جب وہ فتنہ ختم ہو جائے گا اور وہ حالات دور ہو جائیں گے) اس کے بعد دوسرا فتنہ آئے گا تو اس وقت مؤمن کہے گا کہ بس یہی وہ فتنہ ہے جو مجھے ہلاک کر دے گا اور میرے ایمان کو ختم کر دے گا۔ اس لیے جو آدمی یہ چاہتا ہو کہ اس کو جہنم سے دور کیا جائے اور جنت میں داخل کیا جائے، اس کو چاہیے کہ اس کی موت ایسی حالت میں آئے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اور لوگوں کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ اور جس کسی نے حاکم وقت امام یعنی حاکم اعلیٰ، بادشاہ وقت

کے ہاتھ پر اطاعت و فرمانبرداری کی بیعت کی اور بیعت کے وقت اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دل سے عہد و پیمان اور اقرار بھی کیا، تو اب اپنی طاقت کے مطابق اس حکمران کی پوری پوری اطاعت کرے۔ اس کے بعد اگر کوئی دوسرا آدمی حکومت اور تاج و تخت کا دعویدار کھڑا ہو جائے تو جو بعد میں کھڑا ہوا ہے اس کی گردن اڑا دو۔

افادات:- اس روایت سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوئے:-

[۱]: ہر نبی کا یہ فریضہ تھا کہ جو کام اور طریقہ اپنی امت کے لئے باعثِ خیر جانتا ہو، اپنی امت کو اس طریقہ اور اس کام کی طرف رہنمائی کرے اور دعوت دے، اور جو کام اور طریقہ اپنی امت کے لئے غلط، برا، مضر اور نقصان دہ سمجھتا ہو، اس سے اپنی امت کو ڈارے اور اس کام سے بچائے۔ حضراتِ علمائے کرام بھی چونکہ انبیاء کے جانشین ہیں، اس لئے ان کا بھی یہی فریضہ ہے کہ لوگوں کو وہ چیز بتلائیں جو دین اور شریعت کی تعلیمات کے اعتبار سے بھلائی اور خیر کا ذریعہ ہیں۔ اور جو چیزیں لوگوں کے حق میں مضر اور نقصان دہ ہوں، ان سے روکنا بھی اہل علم کے لیے ضروری ہے۔ یہ کام علماء کے لیے ضروری اور واجب ہے، خاموشی اختیار کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی [۲]: اس امت کا ابتدائی دور وہ ہے جس میں یہ امت فتنوں سے محفوظ رہے گی، ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ تشریف فرما تھے، آپ کے بعد حضراتِ خلفائے راشدین کا زمانہ تھا، تو اس وقت یہ امت دینی فتنوں سے محفوظ تھی۔ البتہ اس امت کے بعد میں آنے والے حصے اور طبقے کو کچھ آزمائشیں اور کچھ ایسی چیزیں پیش آئیں گی جن کو اوپر اور اجنبی سمجھا جائے گا۔

ہر وہ کام جس کے کرنے کی شریعت نے اجازت نہ دی ہو، اس کو غلط اور ممنوع قرار دیا ہو، ان کو ”منکر“ کہتے ہیں۔ اور جس کام کا شریعت کی طرف سے حکم دیا گیا ہو؛

اس کو ”معروف“ کہا جاتا ہے۔ لغوی اور ڈکشنری کے اعتبار سے معروف کا ترجمہ ’جانی پہچانی چیز‘ ہوتا ہے۔ جس کا مزاج دینی ہوگا اور ماحول بھی دینی ہوگا، ایسے معاشرہ میں نیک کام جانے پہچانے ہوں گے۔ اور غلط و گناہ کے کام انجامانے ہوں گے، جن کو کوئی جانتا اور پہچانتا نہ ہوگا، گویا ایسے کام اجنبی اور اُوپرے سمجھے جاتے ہیں، اس لیے ان کو ”منکر“ سے تعبیر کیا جاتا ہے (معروف اور منکر پر تفصیلی کلام جلد ۳ میں ملاحظہ فرمائیں۔ مرتب۔)

فتنہ کسے کہتے ہیں؟

[۳]: ”فتنہ“ عربی زبان کا لفظ ہے ”فَتَنَ يَفْتِنُ“ کا اصل ترجمہ ہوتا ہے: سونے کے کھرے اور کھوٹے ہونے کو پہچاننے اور اس کے میل کچیل کو دور کرنے کے لئے آگ کے اندر ڈالنا۔ اور شریعت کی اصطلاح میں ”فتنہ“ ان حالات اور آزمائش کو کہا جاتا ہے جس سے آدمی کے ایمان اور نفاق، اخلاص اور عدم اخلاص کو پہچانا جاتا ہے ایسے حالات کہ جس میں حق اور باطل ایسے گھل مل جائیں، دونوں میں ایسی آمیزش ہو جائے، دونوں ایسے قریب قریب ہو جائیں کہ آسانی کے ساتھ یہ پہچاننا مشکل ہو جائے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے، سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے، ایسے حالات کو سمجھنا ہر آدمی کا کام نہ رہے؛ ایسے واقعات کو ”فتنہ“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسی طریقہ سے اگر گناہوں کی کثرت ہونے لگے فسق و فجور عام ہو جائے، تو اس کو بھی بعض روایتوں میں ”فتنہ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کی دو جماعتوں میں آپس میں ٹکراؤ ہو جائے اور جنگ چھڑ جائے اور ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے موقف اور نظریہ پر ایسا قائم ہو کہ اس کو چھوڑنے کے لیے تیار ہی نہ ہو، دونوں ایک دوسرے سے ایسے بھڑے ہوئے

ہوں کہ ملنے کے لئے بھی تیار نہ ہوں، ہر ایک اپنے حق پر ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، ایسے مشکل حالات پیدا ہو جائیں، اور ایسی شکل بن گئی ہو کہ عام آدمی کے لئے تمیز کرنا دشوار ہو جائے کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر ہے؛ اس کو بھی روایتوں میں ”فتنہ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بہر حال! لفظ ”فتنہ“ کا مفہوم عام ہے، سب کے اندر قدر مشترک بات اتنی ہے کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ جس میں آدمی کے لئے آسانی سے حق اور باطل، سچ و جھوٹ کے اندر تمیز کرنا مشکل ہو جائے۔ بس! جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایمانی بصیرت عطا فرمائی ہو اور جس پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم ہو، وہی ان حالات کے اندر کوئی صحیح فیصلہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے، ورنہ ہر ایک کے لیے یہ کام آسان نہیں ہوا کرتا؛ ایسے حالات کو ”فتنہ“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسے فتنے آئیں گے کہ ایک فتنہ دوسرے فتنہ کو کم کر کے بتلائے گا، یعنی ہر بعد میں آنے والا فتنہ اس سے پہلے والے فتنہ کے مقابلہ میں بڑھا ہوا ہوگا۔ ایک حالت آتی ہے تو آدمی اس کو دیکھ کر سہم جاتا ہے اور ڈر جاتا ہے کہ یہ تو بڑا خطرناک معاملہ ہے، ایسا تو ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں، لیکن جب اس کے ختم ہونے کے بعد دوسرا معاملہ پیش آتا ہے تو بعد والا معاملہ اس سے بھی زیادہ بھیانک اور خطرناک ہوتا ہے، اس وقت وہی آدمی یوں کہتا ہے کہ پہلے والے حالات تو اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں تھے۔

”فتنہ“ کی تشریح بہ زبانِ نبی

اور فتنہ کی تشریح فرماتے ہوئے حضور اکرم ﷺ خود فرماتے ہیں کہ

صورتِ حال یہ ہوگی کہ ایک فتنہ آئے گا اور ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے کہ جس میں آدمی کے لیے حق و باطل میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے گا، ایسے موقع پر ایک مؤمن کہے گا کہ یہ فتنہ تو مجھے ہلاک ہی کر ڈالے گا، یعنی اس فتنہ کی کیفیت کو دیکھ کر مؤمن اپنے ایمان کے متعلق خطرہ محسوس کرے گا اور یوں کہے گا یہ مجھے ہلاک کر دے گا، پھر وہ فتنہ ختم ہو جائے گا، حالات دور ہو جائیں گے، اس کے بعد دوسرا فتنہ آئے گا تو اس وقت مؤمن کہے گا کہ بس! یہی فتنہ ایسا ہے جو مجھے ہلاک کر دے گا اور میرے ایمان کو ختم کر دے گا گویا پہلے کے مقابلہ میں دوسرے کو اتنا زیادہ سخت پائے گا کہ یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ یہی میرے ایمان کی بربادی کا ذریعہ بنے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی صورتِ حال ہوگی کہ ہر آنے والا فتنہ پہلے والے فتنہ کے مقابلہ میں بڑا ہوگا، ہر آنے والی کیفیت پہلی والی کیفیت کو مات کر دے گی۔ آج کل بھی شکلیں پیدا ہو رہی ہیں۔

امیر کی اطاعت ضروری ہے

[۴]: جس کسی نے حاکمِ وقت امام یعنی حاکمِ اعلیٰ بادشاہِ وقت کے ہاتھ پر اطاعت و فرمانبرداری کی بیعت کی، اور اپنے دل سے اقرار بھی کیا، گویا وہ اس بات کا عہد و پیمان لیتا ہے کہ میں اس کو اپنا امیر تسلیم کرتا ہوں اور اس کی اطاعت کروں گا، چاہے اس کا حکم میرے مزاج کے موافق ہو، یا میرے مزاج کے خلاف ہو۔ آدمی جب بیعت کرتا ہے تو اس وقت اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دل سے عہد و پیمان اور اقرار بھی کرتا ہے، تو اب اس حکمران کی پوری پوری اطاعت اپنی طاقت کے مطابق کرے، اس کے بعد کوئی دوسرا آدمی حکومت اور تاج و تخت کا دعویدار اگر کھڑا ہو جائے تو جو بعد میں کھڑا ہوا ہے اس کی گردن اڑا دو۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم

پہلے والے سے عہد و پیمان کر چکے ہو، تو اب دوسرے کا ساتھ دینا کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ پہلے والے کے ساتھ اطاعت کا عہد و پیمان کیا تھا تو اب اس کی اطاعت ضروری ہے اور دوسرا جو دعویٰ رکھڑا ہوا ہے اس کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کو تو ختم کیا جائے گا۔ بہر حال! باب کا عنوان جو قائم کیا تھا کہ امیر کی اطاعت ضروری ہے وہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے۔

اُن کا بوجھ اُن پر؛ تمہارا تم پر

۶۶۹:- وعن أَبِي هُرَيْرَةَ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: سَأَلَ سَلَمَةُ بْنُ يَزِيدَ الْجُعْفِيُّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ: يَا نَبِيَّ اللَّهِ، أَرَأَيْتَ إِنْ قَامَتْ عَلَيْنَا أُمَرَائِي سَأَلُونَا حَقَّهُمْ، وَيَمْنَعُونَا حَقَّنَا، فَمَا تَأْمُرُنَا؟ فَأَعْرَضَ عَنْهُ، ثُمَّ سَأَلَهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: اسْمَعُوا وَأَطِيعُوا، فَإِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا حُمِّلُوا، وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت سلمہ بن یزید جمعی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے نبی! ہمیں بتلائیے کہ اگر ہمارے اوپر ایسے حکمران مسلط ہوں جو ہم سے اپنا حق مانگتے ہوں اور ہمارا حق ادا نہ کرتے ہوں؛ ایسوں کے متعلق آپ ہمیں کیا حکم ارشاد فرماتے ہیں؟ ہم ان کے ساتھ کیا معاملہ کریں؟ یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے بے رخی برتی۔ انہوں نے پھر یہی سوال پوچھا تو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے حکمرانوں کے حکم کو سنو اور ان کی اطاعت کرو، اس لیے کہ اگر وہ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے تو اس کا بوجھ ان پر رہے گا، اور تمہاری ذمہ داری تم پر ہے۔

افادات:- اسلام نے حاکم کا حق محکومین و ماتحتوں پر مقرر کیا ہے، ان کا حق رعایا کے ذمہ یہ ہے کہ جائز کاموں کے اندر ان کی اطاعت واجب اور فرض قرار دی

گئی ہے، اس کے علاوہ بھی حقوق ہیں کہ ان کی خیر خواہی ضروری ہے۔ اسی طریقہ سے محکوم یعنی رعیت کے بھی حقوق ہیں جیسا کہ پہلے بھی آچکا ہے کہ رعایا کی خیر خواہی کرنا حاکم کے لیے ضروری ہے، اور دوسرے حقوق بھی ہیں جن کی تفصیل پچھلے باب میں آگئی تھی۔

ان صحابی نے سوال کیا کہ ایسے حکمران اگر ہمارے اوپر آگئے جو اپنا حق تو ہم سے وصول کرتے ہیں یعنی اپنی بات تو ہم سے منواتے ہیں، اپنی اطاعت تو کرواتے ہیں گویا ان کی طرف سے اس بات کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ہماری فرمانبرداری کرو، لیکن ہمارے جو حقوق ان کے اوپر لازم ہوتے ہیں وہ ادا نہیں کرتے، ہماری ضرورتوں اور تقاضوں کو وہ پورا نہیں کرتے، ہمارے ساتھ جو خیر خواہی کا معاملہ کرنا چاہیے وہ نہیں کرتے؛ ایسے وقت ہم کیا کریں؟ ان کا یہ سوال سن کر نبی کریم ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

عام طور پر جب اس طرح کے سوالات حضور اکرم ﷺ سے کیے جاتے تھے تو آپ ﷺ ابتداءً اس کا جواب نہیں دیا کرتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر سوال کا فوری جواب نہیں دیا جاتا، بلکہ بعض سوالات ایسے ہوتے کہ ان کے جواب میں ٹال مٹول سے کام لیا جاتا ہے، اور بہت سے سوال تو ایسے ہوتے بھی نہیں کہ ان کا فوری جواب دیا جائے۔ ہاں! جب دیکھے کہ آدمی کے سوال کا جواب دیئے بغیر چارہ کار نہیں ہے؛ تو بات دوسری ہے۔

شریعت کا اصول

دیکھو! شریعت کا یہ ایک اصول ہے جو میں پہلے بھی کئی مرتبہ بتلا چکا ہوں کہ شریعت کی طرف سے ہر جگہ حقوق مقرر کر دئے گئے ہیں۔ حکمرانوں کے اوپر ان کے ماتحتوں اور رعایا کے حقوق مقرر کیے گئے، اور رعایا کے اوپر حکمرانوں کے حقوق مقرر کیے گئے۔ اب ہر ایک کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان حقوق کو ادا کرے۔ یا جیسے شوہر

کے اوپر بیوی کا حق مقرر کیا گیا اور بیوی کے اوپر شوہر کا حق مقرر کیا گیا۔ اب شوہر کے لیے ضروری ہے کہ بیوی کا حق ادا کرے اور بیوی کے لیے ضروری ہے کہ شوہر کا حق ادا کرے۔ لیکن عام طور پر دنیا میں ہوتا یہ ہے کہ جن دو فریق کے آپس میں ایک دوسرے کے اوپر حقوق مقرر کیے گئے ہیں (جیسے میاں بیوی، یا حاکم اور محکوم، آقا اور غلام) اس میں جو قوت والا فریق ہوتا ہے وہ ایسا انداز اور ایسی روش اختیار کرتا ہے کہ اپنا حق جو سامنے والے پر ہے وہ تو اپنی قوت کے زور سے وصول کرتا ہے، لیکن سامنے والے کا جو حق اپنے اوپر ہے اس کو ادا کرنے کی فکر نہیں کرتا؛ تو اب ایسے مواقع پر کیا کیا جائے؟

آپ حدیث کے پورے ذخیرے کو اٹھا کر دیکھ لیجیے کہ آپ ﷺ نے ایسے تمام مواقع پر یہ نہیں فرمایا کہ وہ تمہارا حق ادا نہیں کرتا تو تم بھی اس کا حق ادا مت کرو۔ کہیں بھی ایک حدیث آپ کو ایسی نہیں ملے گی، اس لیے کہ نظام عالم کو باقی رکھنے کا طریقہ یہ ہے ہی نہیں۔ اور میں پہلے بھی کئی مرتبہ بتلا چکا ہوں کہ اگر دونوں فریق ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں تب تو نور علی نور؛ پورا معاشرہ جنت کا نمونہ بن جائے گا۔ اور اگر جن دو فریق کے ایک دوسرے کے اوپر حقوق مقرر کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک فریق سامنے والے کے حقوق کو ادا نہیں کرتا، لیکن دوسرا فریق اس کے حقوق کو ادا کرتا ہے؛ تب بھی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئے گی، معاملہ سنبھلا ہوا رہے گا۔ لیکن اگر سامنے والا فریق بھی حق ادا نہیں کرتا تو پھر ٹکراؤ کی نوبت آئے گی۔ جیسے: شوہر اپنا حق وصول کرتا ہے، لیکن بیوی کا حق ادا نہیں کرتا، تو وہاں ہم بیوی کو کبھی یہ مشورہ نہیں دیں گے کہ تو بھی شوہر کا حق ادا مت کرو۔ اسی طرح حاکم کے پاس قوت ہے جس کی وجہ سے وہ اپنا حق وصول کرتا ہے، لیکن اس کے اوپر اپنے ماتحتوں کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں وہ ان کو ادا نہیں کرتا۔ اب اگر ماتحت آکر یہ سوال کریں کہ آپ ہی بتائیے کہ ہم کیا

کریں؟ تو آپ کبھی بھی یہ مشورہ نہ دیں کہ تم بھی اس کا حق ادا مت کرو۔ اس روایت میں حضور اکرم ﷺ بھی ایسا مشورہ نہیں دے رہے ہیں بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اسْمَعُوا وَأَطِيعُوا“ اس کا تم پر یہ حق ہے کہ وہ تم کو جو حکم دے اس کو مانو، بس! جب وہ حکم دیتا ہے تو مان لو، اس طرح تمہاری ذمہ داری تو تم پوری کر لو۔

”فَاتِمَا عَلَيْهْمَا حَمْلُهَا، وَعَلَيْكُمْ مَا حَمَلْتُمَا“ ہماری ذمہ داری یہی ہے کہ جو شریعت کی طرف سے ہم پر لازم کی گئی، اور ان کی ذمہ داری وہ ہے جو شریعت کی طرف سے ان پر لازم کی گئی تھی۔ اب اگر وہ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے تو اس کا بوجھ ان پر رہے گا، ہمیں اس بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ ہمارا حق ادا نہیں کرتے تو ہم ان کا حق کیوں ادا کریں؟ شریعت ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ آپ حق ادا کرتے رہے یا نہیں؛ اس کا فیصلہ تو اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے آپ کے ساتھ قیامت کے روز کیا ہی جائے گا جہاں کبھی اس کے خلاف ہونے والا نہیں ہے۔

یہاں یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ حکمران کی اطاعت ضروری ہے۔ اور ویسے بھی جب وہ قوت کے زور سے اپنا حق وصول کر رہا ہے، تو اگر ہم یہ مشورہ دیں کہ تم اس کا حق ادا مت کرو؛ تو یہی چیز فتنہ بڑھانے کا ذریعہ بنے گی۔

اصل علاج یہ نہیں

اور ایک بات یہ بھی غور طلب ہے کہ وہ اپنا حق اسی لئے وصول کر رہا ہے کہ اس کا حق ہے، اور کسی آدمی کا اپنے حق کو وصول کرنا کوئی گناہ کا کام نہیں ہے، سیدھی سی بات ہے۔ اس کو حق پہنچتا ہے کہ اپنا حق وصول کرے اس لیے کر رہا ہے۔ ہاں! سامنے والے کا جو حق ادا نہیں کر رہا ہے، یہ بات غلط ہے، اس کی طرف سے یہ کوتاہی ہو رہی

ہے۔ اب اگر ہم سامنے والے کو یہ مشورہ دیں کہ تم بھی حق ادا مت کرو، تو آپ ہی سوچئے کہ ہم سامنے والے کو بھلائی کا مشورہ دے رہے ہیں، یا غلط مشورہ دے رہے ہیں؟ جو غلطی یہ کر رہا تھا اس کا علاج ڈھونڈنے کے لیے سامنے والا فریق ہمارے پاس آیا، تو علاج میں ہم بھی وہی بات بتلا رہے ہیں کہ تو بھی اس کا حق مت ادا کرنا؛ تو یہ علاج کہاں ہوا، بلکہ معاملہ کو اور زیادہ بگاڑنا ہوا۔ شریعت کبھی یہ مشورہ نہیں دیتی۔

اگر ہم یہ کہیں گے کہ تم اس کا حق ادا مت کرو تو ظاہر ہے کہ وہ تو پہلے ہی قوت سے اپنا حق وصول کر رہا تھا اور اب اگر یہ حق ادا نہیں کرے گا تو ٹکراؤ کی شکلیں پیدا ہوں گی جب یہ اس پر اپنا زور چلانا چاہیے گا تو اس کے اس زور سے بچنے کے لیے سامنے والا فریق جو کمزور ہے وہ دوسروں کی حمایت حاصل کرے گا، اور جب دوسروں کی حمایتیں آئیں گی تو جھگڑے اور فتنے زیادہ پیدا ہوں گے، اس لئے شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی، یہ بات بڑے خطرے کی ہے، عام طور پر فتنے اسی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں، ایسے تمام حالات میں شریعت کی بڑی تاکید رہتی ہے کہ تم سامنے والے کا حق ادا کرتے رہو، اگرچہ وہ تمہارے حق میں کوتاہی کرے۔

شفا بخش علاج

آج کل تو ایسا مزاج بن گیا ہے کہ لوگ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کیا ہم بزدل ہیں کہ وہ ہمارا حق ادا نہیں کرتا تب بھی ہم اس کا حق ادا کریں؟ لوگوں نے اس کا نام بزدلی رکھ دیا ہے، حالاں کہ یہ بزدلی نہیں ہے۔ آپ یہ طے کر لیجئے کہ میں اس کا جو حق ادا کر رہا ہوں وہ بزدلی کی وجہ سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس لئے ادا کر رہا ہوں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ہر کام میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو پیش نظر رکھیں۔

اور یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ بہت سے دینی کام جو ہم کرتے ہیں وہ حکم خداوندی کی وجہ سے نہیں، بلکہ معاشرے اور سماج کا ایک طریقہ اور دھارا بنا ہوا ہے اس لیے کرتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہماری دینداری کا بہت بڑا حصہ ایسا ہی ہے۔ بعض لوگ اگر شراب نہیں پیتے تو وہ اس لیے نہیں کہ حرام ہے، بلکہ سوچتے ہیں کہ اگر میں پیوں گا تو لوگ کیا کہیں گے۔ میں سنیا دیکھنے جاؤں گا تو لوگ کیا کہیں گے؟ وہاں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو نہیں سوچتا۔ تو درحقیقت بہت سے گناہوں سے لوگ اللہ تعالیٰ کی خاطر نہیں، بلکہ سماج کے ڈر سے بچتے ہیں، اور بہت سے کام اللہ تعالیٰ کی خاطر نہیں، بلکہ سماج کے ڈر سے کرتے ہیں۔ حالاں کہ شریعت کی تعلیم تو یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا کام کرو تب بھی اور بڑے سے بڑا کام کرو تب بھی اللہ تعالیٰ کے واسطے ہی کرو۔ اور اگر کوئی کام نہ کرو، تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے واسطے مت کرو۔ جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے: ”مَنْ أَعْطَى اللَّهَ وَمَتَعَ اللَّهُ“ جس نے دیا تو اللہ کے واسطے دیا، اور نہیں دیا تب بھی اللہ کے واسطے نہیں دیا ”فَقَدْ اسْتَغْمَلَ الْإِيمَانُ“ تو اس کا ایمان کامل ہو گیا۔

خلاصہ علاج

خلاصہ یہ ہوا کہ ایسے مواقع پر آدمی اللہ تعالیٰ کے حکم کو مد نظر رکھے، اور یہی سوچے کہ میرا اس کے حق کو ادا کرنا بزدلی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، تو پھر دیکھئے کہ بھائیوں بھائیوں میں اور رشتہ داروں میں کیسی محبتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ ہمارے سماج میں جتنے بھی بگاڑ ہیں یہ آپسی حقوق کے ادا نہ کرنے کے نتیجے ہی میں ہیں، اگر اس تعلیم پر عمل کر لیا گیا تو ان شاء اللہ سارے بگاڑ ختم ہو جائیں گے۔ جب بھی ایسا کوئی معاملہ ہوا اور لوگ کہیں کہ کیا تو بزدل ہے؟ وہاں اسی سوچ کی

ضرورت ہے ”فَاتِمَا عَلَيْهِم مَّا حُجِّلُوا، وَعَلَيْكُمْ مَّا حُجِّلْتُمْ“ وہ جو کرتا ہے اس کی ذمہ داری اس پر ہے، کل کو قیامت میں اس کا جواب اس کو دینا ہے۔ ہاں! میری ذمہ داری مجھ پر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا جو حق میرے اوپر لازم کیا ہے، میں اس کو ادا کروں گا، چاہے وہ میرا حق ادا نہ کرتا ہو۔

یہ سودے بازی نہیں ہے

”معاملات میں سودے بازی ہوتی ہے، حقوق میں سودے بازی نہیں ہوتی“ دونوں باتیں الگ الگ ہیں جس کو ذرا برابر سمجھ لیجئے۔ جیسے: میں نے آپ سے ایک مکان خریدا، اگر میں پیسے نہ دوں تو آپ مجھے مکان نہ دیجئے۔ آپ مکان نہ دیں، تو میں پیسے نہ دوں؛ یہ تو برابر کا معاملہ ہے، یہ تو سودا ہوا جو آپس کے معاملات میں ہوتا ہے۔ لیکن شریعت نے جو حقوق مقرر کئے ہوئے ہیں، یہ کسی طرح کی سودے بازی نہیں ہے، باپ کے اوپر بیٹے کا حق، یا بیٹے کے اوپر باپ کا حق؛ یہ کوئی سودے بازی نہیں ہے کہ بیٹا باپ کا حق ادا کرے تب ہی باپ بیٹے کا حق ادا کرے گا۔ بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اور دونوں کے لیے لازم ہے کہ اپنا اپنا کام کریں۔ دونوں میں کوئی ایک نہیں کرتا تو دوسرے کو چاہیے کہ یہ نہ دیکھے کہ وہ کیوں نہیں کرتا، بلکہ وہ خود حق ادا کرنے کا اہتمام کرے۔ یہ سب حقوق ہیں اور حقوق اللہ تعالیٰ نے متعین کئے ہیں۔ اسی اصول کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے، اگر ہم اس چیز کو پیش نظر رکھیں گے، تو ان شاء اللہ کبھی کوئی گڑبڑ کی نوبت نہیں آئے گی۔

ایسے زمانہ میں کیا کرے؟

۶۷۰:- عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: إِيَّاكُمْ

سَتَكُونُ بَعْدِي أَثَرَةٌ وَأُمُورٌ تُنْكَرُ وَهَذَا! قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ! كَيْفَ تَأْمُرُ مَنْ
أَدْرَكَ مِنَّا ذَلِكَ؟ قَالَ: تَوَدُّونَ الْحَقَّ الَّذِي عَلَيَكُمْ، وَتَسْأَلُونَ اللَّهَ الَّذِي لَكُمْ.

(متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے بعد ترجیحی معاملہ کیا جائے گا، اور ایسی چیزیں ہوں گی جن کو تم اجنبی سمجھو گے یعنی پسند نہیں کرو گے۔ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! جو آدمی ایسا زمانہ پالے تو وہ کیا کرے؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان حاکموں کا تم پر جو حق ہے وہ تم ادا کرو، اور تمہارا ان پر جو حق ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگو اور اسی سے دعا کرو۔

افادات:- حُکام جن کے ہاتھ میں اختیارات اور پاورس (Powers) ہوتے ہیں، ان اختیارات کے نتیجے میں جب وہ کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو انصاف کے ساتھ اور حقدار کا حق سمجھ کر کرتے ہیں، لیکن بعض لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح نہیں ہے، اس کو یہ منصب اور عہدہ نہیں دینا چاہیے تھا، وہ آدمی اس لائق نہیں تھا، اس نے اس کی فیور (Favour) کی ہے۔ ”أَثَرَةٌ“ کے معنی فیور کرنا۔ حضور اکرم ﷺ نے کبھی کوئی معاملہ کیا تو بعض لوگوں نے اس کو بھی فیور پر محمول کیا تھا جس پر آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ہم تو ایسا نہیں کرتے، لیکن آئندہ ایسا ہوگا کہ تم ایسے ترجیحی اور فیور والے معاملات دیکھو گے۔

تو حکمرانوں کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہوتا ہے، جن کے ہاتھ میں اختیارات ہوتے ہیں، وہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے، بلکہ ان کی بڑی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اگر وہ اپنی ذمہ داری کے مطابق کام کرتا ہے، پھر بھی اپنے اور پرانے سب ان پر شکالات کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ غلط کیا ہے، اس کو یہ چیز نہیں کرنی چاہیے تھی، فلاں منصب فلاں کو نہیں دینا

چاہیے تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! جو آدمی ایسا زمانہ پالے اور اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ ترجیحی سلوک کئے جا رہے ہیں، نامناسب باتیں ہو رہی ہیں؛ تو وہ کیا کرے؟ تلوار نکال کر مقابلہ کے لئے میدان میں آجائے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: اپنا حق وصول کرنے کے لیے آستینیں مت چڑھاؤ، تلوار لے کر میدان میں مت اتر آؤ؛ یہی چیز فتنہ ہے، اور فتنہ چھوٹے انداز میں ہو یا بڑے انداز میں؛ بہت بری چیز ہے۔ اس لیے ان حاکموں کا تم پر جو حق ہے وہ تم ادا کرو، اور تمہارا ان پر جو حق ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو اور دعا کرتے رہو۔

عام طور پر آپ دیکھیں گے کہ جہاں کہیں بھی اس طرح کے فتنے، جنگیں اور لڑائیاں ہوتی ہیں، وہ انہی بنیادوں کے اوپر ہوا کرتی ہیں کہ فلاں ہمارا حق کیوں نہیں دے رہا ہے، ہم تو اپنا حق وصول کر کے رہیں گے، اسی میں دو پارٹیاں ہو جاتی ہیں اور مقابلہ کی نوبت آ جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سب کو صحیح سمجھ اور نیک توفیق عطا فرمائے۔

وَجُوبُ طَاعَةِ وَلَاةِ الْأُمُورِ فِي غَيْرِ
مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْبَعْصِيَةِ
حاکموں کی اطاعت کے احکام
(مجلس ۳)

۸/ رذی قعدہ ۲۱ھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۳۰ فروری ۲۰۰۶ء
 بیان چل رہا تھا کہ جو حکمران ہیں، چاہے وہ حاکم اعلیٰ اور بادشاہ وقت ہوں، یا
 حاکم اعلیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ماتحت حاکم ہوں، پھر وہ ایسی بات کا حکم دیتے ہوں
 جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم نہیں آتی ہو، تو اس صورت میں ان کی اطاعت اور
 فرماں برداری واجب اور ضروری ہے؛ البتہ گناہ کے کاموں کا وہ حکم دیں تو اس صورت
 میں اس کو ماننا نہیں جائے گا اور ان پر عمل نہیں ہوگا۔

جس نے امیر کی اطاعت کی.....

۶۷۱:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللَّهَ، وَمَنْ يُطِيعِ الْأَمِيرَ فَقَدْ أَطَاعَنِي، وَمَنْ يَعِصِ الْأَمِيرَ فَقَدْ عَصَانِي. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:
 جس نے میری اطاعت کی گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ اور جس نے میری نافرمانی کی
 گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی، اور
 جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

افادات:- اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر آدمی جس گناہ کا مرتکب شمار ہوتا ہے اور
 اس پر جو سزا مل سکتی ہے، نبی کریم ﷺ کی نافرمانی پر بھی وہی حکم ثابت ہوگا۔ اس لئے کہ
 اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو بھیجا ہی اس لئے ہے کہ آپ جن چیزوں کا حکم دیں ان پر
 تمام لوگ عمل کریں، اور جن چیزوں سے حضور اکرم ﷺ منع فرمائیں ان سے لوگ باز
 رہیں ﴿مَّا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ قرآن کریم میں ہے

کہ: رسول جس چیز کا حکم دیں اس کو لے لو، اس پر عمل کرو، اور جس چیز سے وہ منع کریں اس سے باز آ جاؤ۔ تو جس طرح اللہ تعالیٰ کا حکم ماننا اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری ضروری ہے، اسی طرح رسول پاک کا حکم ماننا اور آپ کی اطاعت و فرمانبرداری بھی ضروری ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کی طرف سے جو حکام اور ماتحت امراء مختلف امور کو انجام دینے کے لئے مقرر کئے جاتے تھے ان کے متعلق حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ میری طرف سے جو امراء مقرر کئے جائیں، جو ان کی اطاعت کرے گا گویا اس نے میری اطاعت کی۔ عام طور پر یہی ہوتا ہے جو حاکم اعلیٰ ہوتا ہے یا جو بڑی شخصیت ہوتی ہے، اس کا حکم اور اس کی بات تو لوگ خوشی خوشی مان لیا کرتے ہیں، اور اس پر عمل کرنے میں اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے، لیکن گڑ بڑ نہچے آ کر ہوتی ہے کہ جب ان کی طرف سے کچھ باتیں پیش کی جاتی ہیں تو لوگ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ حالاں کہ یہ بات بدیہی ہے کہ حاکم اعلیٰ تو پورے حدودِ سلطنت میں پہنچ نہیں سکتا، اس کو نظام چلانے کے لئے اور اپنے ماتحت مختلف شعبوں اور مختلف کاموں کو انجام دینے کے لئے آدمی مقرر کرنے ہی پڑیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ جو شعبہ جس کے حوالہ کیا جائے گا اس شعبہ سے متعلق اختیارات بھی اس کو دیئے جائیں گے، تو اس نے جن لوگوں پر اعتماد کیا ہے اور جن کی صلاحیتوں کو قابل سمجھتے ہوئے ان کو متعین کیا ہے، ان حضرات کے متعلق حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جس نے ان مقرر کردہ لوگوں کی اطاعت کی گویا اس نے میری اطاعت کی، اور جس نے ان کی نافرمانی کی اس نے گویا میری نافرمانی کی۔

گورنمنٹ کا اصول بھی یہی ہوتا ہے۔ گورنمنٹ کے عملہ اور اسٹاف کی طرف سے گورنمنٹ کے قوانین اور اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے جو حکم جاری کیا جائے گا، اس حکم کو ماننا اور اس پر عمل کرنا اسی طرح ضروری ہوتا ہے جیسا اوپر والے حاکم کی طرف سے

جاری کئے ہوئے حکم کو ماننا۔ اگر اس کی خلاف ورزی کی جاتی ہے تو اسی طرح سزا کا حقدار ہوتا ہے جس طرح حاکم اُعلیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی صورت میں سزا کا حقدار ہوتا ہے، اس کے بغیر کسی بھی سلطنت کا نظام، اور کوئی بھی نظم مملکت چل ہی نہیں سکتا، اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے خاص طور پر اس طرف متوجہ کیا ہے۔

ایک اہم اصول

ہمارے سماج اور معاشرہ میں مختلف طریقوں سے جو نظام چلائے جاتے ہیں، چاہے انجمنوں کی شکلوں میں ہوں، چاہے جماعتوں کی شکلوں میں ہوں، یا مسجد و مدرسہ کا نظام ہو، ہر ایک جگہ نظام چلانے کے لئے ایک تو سربراہ مقرر کیا جاتا ہے اور پھر وہ سربراہ اپنے ماتحت کاموں کو انجام دینے کے لئے مختلف لوگوں کو مقرر کرتا ہے، تو عام طور پر دوسروں کی طرف سے رکاوٹیں نیچے والوں کے معاملہ میں ہی پیش آتی ہیں، وہ یوں سمجھتے ہیں کہ میں اس کی کیوں مانوں؟ میں تو اس سے اونچا ہوں۔ تو ان کو یہ سوچنا چاہیے کہ دراصل وہ اس کی نہیں مان رہے ہیں، بلکہ اس کو جس نے مقرر کیا ہے اُس کی مان رہے ہیں، اگر یہی بات سمجھ لیں گے تو پھر کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی، اور کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ جتنے بھی جھگڑے اور اختلافات شروع ہوتے ہیں اور اس قسم کے نظاموں کو چلانے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہی ہوتی ہے۔

جاہلیت کی موت

۶۷۲- وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما أن رسول اللہ ﷺ قال: مَنْ كَرِهَ مِنْ أَمِيرٍ شَيْئًا فَلْيَصِدِّهِ، فَإِنَّهُ مَنْ خَرَجَ مِنَ السُّلْطَانِ شِدْرًا مِمَّتَهُ جَاهِلِيَّةً.

(متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اپنے بادشاہ اور امیر کی طرف سے کسی چیز کو ناپسند سمجھے (یعنی امیر نے کوئی حکم دیا، یا کوئی معاملہ اور سلوک اس کے ساتھ ایسا کیا جو اس کو ناگوار ہے، اس کی طبیعت اس کو پسند نہیں کرتی) تو اس کو چاہیے کہ صبر کرے (نہ کوئی مقابلہ کرے اور نہ اس کے خلاف کرے) اس لیے کہ جو آدمی حاکم کی فرمانبرداری سے ایک بالشت بھی باہر نکلا، وہ جاہلیت کی موت مرا۔

افادات:- اس لئے کہ مقابلہ کرنے، اس کی خلاف ورزی کرنے اور اس کی نافرمانی کرنے میں بڑی خرابیاں ہیں، ایسے ایسے نقصانات ہیں جس کی کوئی تلافی ہو ہی نہیں سکتی، لہذا جب یہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے تو صبر سے کام لے۔

اور چوں کہ زمانہ جاہلیت میں اس طرح کا کوئی نظام نہیں تھا، ہر قبیلہ اپنا ایک الگ نظام، اور اپنی الگ حکومت چلاتا تھا، اسلام نے آکر وہ سارے نظام ختم کر کے ایک امیر کے ماتحت سب لوگوں کو لا کر اس ایک امیر کی اطاعت کو ضروری قرار دیا، اور ایک اجتماعی نظام انسانوں کو عطا فرمایا، پھر اس نظام کو چلانے کے لئے حکام کی تعیین کی گئی اور ان کے ذریعہ سے پورے نظام کو چلایا گیا۔ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو اسلام نے آکر بتلائیں، ورنہ زمانہ جاہلیت میں عربوں میں ایسا کوئی نظام نہیں تھا، اس لئے حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: جو اس کی خلاف ورزی کرے گا گویا اس نے جاہلیت والا طریقہ اپنانا چاہا، اسی لئے وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

جس نے حاکم کی توہین کی

۶۷۲- وعن أبي بكرة بن أبي بكرة قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: من

أهان السلطان، أهان الله. (رواه الترمذی وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس نے حاکم اور بادشاہ کی بے عزتی اور توہین کی، اس کے ساتھ اس کی شان کے خلاف معاملہ کیا؛ اللہ تبارک و تعالیٰ ایسے آدمی کو بے عزت کرے گا۔

افادات:- اس لئے کہ جو حاکم اُعلیٰ ہوتا ہے اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جانا پورے نظم و نسق کو برباد کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، ہر ایک کو جرأت نہیں ہوتی لیکن کسی ایک آدمی نے جرأت کر لی تو گویا اس نے دوسروں کو بھی جرأت پر آمادہ کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نظام کا سارا ڈھانچہ ختم ہو جائے گا، اس ایک کی اہانت پورے نظام کی بربادی کی شکل میں ظاہر ہوگی، اور ظاہر ہے کہ اس کے نقصانات کتنے ہو سکتے ہیں؟ اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس نے حاکم کی توہین کی، اللہ تعالیٰ اس کی توہین اور بے عزتی کرے گا۔ وہ آدمی یہ نہ سمجھے کہ ایسا کر کے میرا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے، قدرت کی طرف سے تکوینی طور پر اس کے ساتھ اسی کے مناسب سزا کا معاملہ کیا جائے گا۔

اَللّٰهُمَّ عَنْ سُؤَالِ الْاِمَارَةِ
وَ اِخْتِيَارِ تَرْكِ الْوَلَايَاتِ اِذَا لَمْ يَتَّعَيَّنْ
عَلَيْهِ

عہدہ طلب کرنے کی ممانعت
اور اختیاری صورت میں عہدہ قبول نہ کرنا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اسلامی اصول

اگر کوئی آدمی اپنی طرف سے کوئی عہدہ مانگے اور طلب کرے؛ تو اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا، لیکن اگر کسی آدمی کے اندر صلاحیت ہے اور وہ باکمال شخصیت ہے اس میں ایسے اوصاف ہیں کہ ذمہ داری کے کاموں کو انجام دے سکتا ہے، تو خود حاکم اعلیٰ کو چاہیے کہ وہ اس کو ذمہ داری حوالہ کرے۔ ویسے بھی اسلام نے تو ایک اصول بتا دیا ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾ اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ تم امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ۔ حکومتوں کے یہ عہدے اور مناصب بھی ایک طرح کی امانت ہیں، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: کسی آدمی نے کسی کو کوئی عہدہ ومنصب دیا، اور اس قوم میں اس سے اچھا آدمی موجود ہے جو اس ذمہ داری کو اس سے بھی اچھی طرح ادا کر سکتا ہے؛ تو اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ خیانت کی۔ یعنی جس کو عہدہ دیا ہے، اس کے مقابلہ میں دوسرے آدمی میں اس سے اچھی صلاحیتیں موجود ہیں، اور حاکم بھی اس کو جانتا ہے اور اس کو دینے میں کوئی دوسری رکاوٹ اور مانع بھی نہیں ہے، اس کے باوجود اس کو نہ دے کر دوسرے کو وہ منصب وعہدہ دیا؛ تو اسلام کی تعلیم کے مطابق اس نے خیانت کی۔ حاکم اعلیٰ کی ذمہ داری ہے کہ مناصب وعہدوں کی تقسیم کے وقت جب کسی آدمی کو تجویز کیا جائے تو ان کمالات، صلاحیتوں اور اوصاف کی بنیاد پر تجویز کیا جائے جو اس کام کو انجام دینے کے لیے ہونے چاہئیں۔ جس میں جتنی زیادہ صلاحیت ہو اسی کو دینا چاہیے، اگر اس کو نہ دے کر اس سے کم صلاحیت والے کو دیا گیا تو اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ

کے ساتھ خیانت کی۔ جب اسلام کی تعلیم یہ ہے تو پھر کسی کو کوئی عہدہ مانگنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاکم اعلیٰ کو حکم دیا گیا ہے کہ جو باصلاحیت ہو اس کو پیشکش کرے۔ باقی خود ہی مانگنا کہ مجھے یہ عہدہ ومنصب دیا جائے، اسلام اس کو پسند نہیں کرتا۔

باصلاحیت آدمی کے لیے دوراستے ہیں

پھر یہ ہے کہ کسی کو اس کی صلاحیت اور کمالات کی وجہ سے کوئی عہدہ دیا جا رہا ہو، جیسے: صدر بنایا جا رہا ہو، سکریٹری بنایا جا رہا ہو؛ تو اس کو قبول کرنا چاہیے یا نہیں؟ بعض مرتبہ شکل ایسی ہوتی ہے کہ پورے سماج و معاشرہ اور پوری کمیونٹی (community) میں کوئی ایسا ہے ہی نہیں جو اس عہدہ کو سنبھال سکے، صرف یہی اکیلا ہے۔ کسی دوسرے میں ایسے اوصاف نہیں جو اس ذمہ داری کو امانت داری کے ساتھ کما حقہ پورا کر سکے، سب لوگ کہتے ہیں کہ یہ کام تو یہی کر سکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں کر سکتا؛ تو پھر اس کو انکار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایسی صورت میں تو اس کی یہ ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ اس ذمہ داری کو قبول کر لے، اگر انکار کر دے گا تو گنہگار ہوگا۔

لیکن اگر ایسا نہیں ہے، اس ذمہ داری کو انجام دینے کی صلاحیت رکھنے والا یہ اکیلا نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سارے لوگ اسی کے برابری اور لیول کے موجود ہیں جو اس ذمہ داری کو قبول کر سکتے ہیں، اور پھر اس سے کہا جا رہا ہے کہ آپ قبول کیجئے، تو اس صورت کے اندر اپنے آپ کو اس ذمہ داری سے بچانے کے واسطے یہ سوچتے ہوئے انکار کرتا ہے کہ ذمہ داری کا کام ہے، پتہ نہیں کہ مجھ سے پورے طور پر یہ ذمہ داری ادا ہوگی یا نہیں، اس امانت کو پورے طور پر انجام دے سکوں گا یا نہیں، اس لیے کہتا ہے کہ یہ عہدہ

مجھے نہیں چاہیے، میں اس ذمہ داری کو قبول کرنا اور یہ بوجھ اٹھانا نہیں چاہتا، یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا، یا میں اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہوں؛ تو شرعاً اس کی اجازت ہے۔

اسلام اس نظریہ کا قائل ہی نہیں

لیکن اسلام نے سامنے سے کسی عہدہ اور منصب کو مانگنے کی تو بالکل اجازت دی ہی نہیں۔ آج کل تو معاملہ بالکل بدل ہی گیا ہے۔ الیکشن میں خود ہی امیدواری کرتے ہیں کہ مجھے ذمہ دار بناؤ، حالاں کہ اسلام اس نظریہ کا قائل ہی نہیں اور اس نظریہ کو بالکل پسند ہی نہیں کرتا۔ اسلام تو کہتا ہے کہ آپ لوگوں سے نہ کہو، لیکن اگر ذمہ دار، اہل الرای، ارباب حل و عقد آپ کی ان صلاحیتوں کو دیکھ کر آپ سے کہیں کہ آپ کو ہی یہ کام کرنا ہے اور آپ منع کریں؛ تو یہ اصل بات ہے۔ ایسا نہیں کہ ساری دنیا منع کرتی ہے کہ ان کو نہیں دینا ہے، لیکن آپ کہتے ہیں کہ: ”میں ہی صدر بنوں گا، میں ہی سکریٹری بنوں گا، اور میں بھی دیکھتا ہوں کہ کون میرے مقابلہ پر آتا ہے؟“ اسلام اس نظریہ کا قائل نہیں ہے، یہ تو بڑی گڑبڑ والی چیز ہے۔

آخرت کا گھر کس کے لیے؟

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (القصص: ۸۳) اس آیت سے پہلے آخرت کی کچھ چیزیں بیان کی گئی تھیں، اس کے بعد باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آخرت کا وہ گھر ہم انہی لوگوں کو دیں گے، انہی کے لیے ریزروڈ (Reserved) رکھتے ہیں جو زمین میں بڑا بننا نہیں چاہتے، اور نہ زمین میں فساد پھیلانا چاہتے ہیں، اور انخابام تو نیکوکاروں کے واسطے ہی ہے۔ یعنی جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلتے ہیں اور نافرمانیوں سے

اپنے آپ کو بچاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے آپ کو بڑائی طلب کرنے سے بھی بچاتے ہیں؛ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ آخرت میں کامیاب کرتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو بندے آخرت کے حقدار ہیں ان کا مخصوص وصف ﴿لَا يَرْيَدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ﴾ ہے کہ وہ عہدہ نہیں چاہتے، ان کا مزاج ایسا ہے کہ ان کو کوئی عہدہ دیا جائے تب بھی وہ منع کرتے ہیں، ہاں! لوگوں کے اصرار کے نتیجہ میں قبول کر لیں؛ تو یہ بات اور رہی، لیکن وہ اپنی طرف سے اس کے خواہش مند نہیں ہوتے، بلکہ ان کی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ یہ عہدہ مجھے نہ سونپا جائے۔

اگر مدد چاہتے ہو تو عہدہ مت مانگو

۶۷۴: عن أبي سعيد عبد الرحمن بن سمره رضي الله عنه قال قال لي رسول الله ﷺ: يَا عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ سَمُرَةَ! لَا تَسْأَلِ الْإِمَارَةَ؛ فَإِنَّكَ إِن أُعْطِيتَ بِهَا عَنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا، وَإِن أُعْطِيتَ بِهَا عَنْ مَسْأَلَةٍ وُكِّلْتَ إِلَيْهَا، وَإِذَا حَلَفْتَ عَلَى يَمِينٍ، فَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْرًا مِنْهَا؛ فَأَتِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ وَكَفِّرْ عَنْ يَمِينِكَ. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت عبد الرحمن بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: اے عبد الرحمن! عہدہ مت مانگو، امارت مت طلب کرو، سرداری کا سوال مت کرو (کہ مجھے پریسڈنٹ بناؤ، مجھے سکریٹری بناؤ) اس لئے کہ (اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک اصول ہے کہ) جو عہدہ اور منصب بغیر مانگے ہوئے ملتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی مدد ہوگی، اور اگر آپ کے طلب کرنے اور مانگنے سے ملا ہے، تو (اللہ تعالیٰ کی مدد نہیں ہوگی، بلکہ) تمہارے حوالہ کر دیا جائے گا۔ اور جب تم نے کسی کام کی قسم کھائی اور دوسرا کام ایسا ہے جو اس سے بہتر ہے تو ایسی قسم کو چھوڑ کر دوسرے اچھے کام کو انجام دو اور قسم ٹوٹنے کا کفارہ دیدو۔

افادات:- آدمی نے کوئی عہدہ مانگا نہیں تھا، کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا، بلکہ ذمہ داروں نے اس کی صلاحیتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے بغیر طلب کے اس پر ڈالا ہے؛ تو اس صورت میں اس عہدہ کی جو ذمہ داریاں ہیں ان کو انجام دینے میں اور اس ڈیوٹی کو پورا کرنے میں اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا۔ اور اگر کوئی عہدہ سامنے سے مانگتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ میں اس کام کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہوں، باری تعالیٰ کہتے ہیں کہ: اچھا! اب اس کام کو تم ہی انجام دو۔

چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی آدمی کو چاہیے کہ اپنی ذات کے اوپر اعتماد نہ کرے، ہر کام میں اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہیے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی وہ کام کروا سکتا ہے، اور کسی کا سامنے چل کر عہدہ مانگنا؛ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بجائے اپنی ذات پر اعتماد کی دلیل ہے۔

عہدہ مثال

جیسے: ایک باپ کئی فیکٹریوں کا مالک ہے، اس کے ماتحت کئی طرح کے کام ہیں، اس کے بیٹوں میں سے ایک بیٹا کہتا ہے کہ: ابا جان! مجھے فلاں پوسٹ دیدو، میں اس عہدہ پر کام کروں گا، اپنی طرف سے اس نے ابا سے یہ فرمائش کی کہ مجھے اس عہدہ پر کام کرنا ہے۔ تو اس کی طرف سے یہ فرمائش کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ یوں سمجھتا ہے کہ میں اس عہدہ کا حقدار اور اہل ہوں، اور میں اس کام کو برابر انجام دوں گا۔ ویسے باپ کی خواہش تو یہ تھی کہ وہ دوسرے کو دیتا، لیکن یہ سامنے سے مانگ رہا ہے۔

ایک شکل یہ تھی کہ اس نے مانگا نہیں، بلکہ باپ نے کہا کہ تم یہ کام کرو، اور وہ منع کرتا ہے کہ ابا جان! مجھے نہیں چاہیے، اس کے منع کرنے کے باوجود جب باپ وہ کام

سونے گا، تو پھر اس پر برابر نظر بھی رکھے گا، ذرہ بھی ادھر ادھر ہوگا تو فوراً باپ اس کو ڈائریکشن دے گا کہ بیٹا! ایسا نہیں، بلکہ ایسا کرو۔ ہم تن اس کی طرف متوجہ رہے گا کہ کہیں چوک نہ ہو جائے۔ لیکن جس نے خود ہی مانگا ہے، اور کہیں گڑبڑ کا موقع آئے گا تو باپ سوچے گا کہ چلو! دیکھتے ہیں وہ کیا کرتا ہے؟ بہت اکڑتا تھا کہ میں کر کے دوں گا تو اب دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کرتا ہے؟ قدرت کی طرف سے بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

بہتر کام کو انجام دینے کے لیے قسم توڑنا

اس روایت میں دوسری چیز یہ بتلائی گئی کہ کسی بات پر قسم کھائی ہو، اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی کام تمہیں اچھا معلوم ہوا، جیسے: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی معاملہ پر آدمی قسم کھا لیتا ہے کہ فلاں جگہ نہیں جاؤں گا، لیکن وہاں جانے میں ہی خیر معلوم ہوتی ہے۔ یا کسی نے قسم کھائی کہ میں فلاں سے بات نہیں کروں گا، لیکن جب مسئلہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایسی قسم کھانا جائز نہیں ہے، اس لیے اس قسم کو توڑو اور اس سے بات کرلو۔ جب بات کرو گے تو قسم ٹوٹے گی، تو اس کا کفارہ دیدو۔ تو کسی کام کی قسم کھائی اور دوسرا کام سامنے آیا جو اس سے بہتر ہے تو ایسی قسم کو چھوڑ کر دوسرے اچھے کام کو انجام دینا چاہیے، اور قسم ٹوٹنے کا کفارہ دے دینا چاہیے۔

پہلے بھی کئی بار یہ قصہ بتا چکا ہوں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق قسم کھائی تھی کہ ان کو خرچہ نہیں دوں گا، پھر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی جس میں کہا گیا کہ: معاف کر دو، اللہ تعالیٰ معافی کو پسند کرتا ہے، کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کرے؟ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خرچہ دینا شروع کر دیا۔ کسی پر خرچ نہ کرنے کے مقابلہ میں اس پر خرچ کرنا اچھا کام

ہے، چنانچہ اس کو اختیار کرنے پر قسم کا کفارہ دیدیا۔

کسی دواؤ دمیوں کے اوپر بھی امیر مت بننا

۶۷۵: وعن أبي ذرٍّ رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: يَا أَبَا ذَرٍّ! إِيَّاكَ زَعِيفًا، وَإِيَّاكَ أَحَبُّ لَكَ مَا أُحِبُّ لِنَفْسِي. لَا تَأْمُرَنَّ عَلَى اثْنَيْنِ، وَلَا تَوَلَّيَنَّ مَالَ يَتِيمٍ.

ترجمہ:- حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے ابو ذر! میں تمہیں کمزور پاتا ہوں (یعنی تمہارا حال دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ تم میں ضعف و کمزوری ہے) اس لئے میں تمہارے لئے وہی بات پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں؛ لہذا دواؤ دمیوں پر بھی امیر مت بننا، اور کسی یتیم کے مال کا والی مت بننا۔

افادات:- امیر اور سربراہ بننا بڑی ذمہ داری کا کام ہے، چاہے کسی بھی شعبہ میں ہو، اس کی وجہ سے بہت بوجھ سر پر آ جاتا ہے۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم کمزور ہو، لہذا دواؤ دمیوں کے اوپر بھی امیر اور سربراہ مت بننا۔ اور کسی یتیم کے مال کا والی مت بننا، اس لئے کہ یتیم کے مال کی ذمہ داریاں بھی بہت بڑی ہیں، ذرّہ برابر بھی اس میں ادھر ادھر ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا سخت جواب دینا پڑے گا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ لوگوں میں بھی اس طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض وہ ہوتے ہیں کہ جن کو اس طرح کی ذمہ داری اگر سونپی جائے اور وہ اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کے پیش نظر یہ سمجھتا ہو کہ میں اپنی کمزوری کی وجہ سے اس ذمہ داری کو پورے طور پر کماحقہ ادا نہیں کر سکوں گا، تو پھر اس کو چاہیے کہ ایسی ذمہ داری قبول نہ کرے۔

امارت سببِ ندامت

۶۷۶:- وعنہ، قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَلَا تَسْتَعْمِلُنِي؟ فَضَرَبَ بِيَدِهِ

عَلَى مَنْكِبِي، ثُمَّ قَالَ: يَا أَبَا دَاوُدَ! إِنَّكَ ضَعِيفٌ، وَإِنَّهَا أَمَانَةٌ، وَإِنَّهَا مَأْيُومَةُ الْقِيَامَةِ عِزِّي وَنَدَامَتُهُ، إِلَّا مَنْ أَخَذَهَا بِحَقِّهَا، وَأَدَّى الَّذِي عَلَيْهِ فِيهَا. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں نے خود ہی حضور اکرم ﷺ سے درخواست کی: اے اللہ کے رسول! آپ مجھے کسی جگہ کا عامل (حکمران) نہیں بناتے؟ (فلاں کو آپ نے فلاں جگہ بھیجا، فلاں کو فلاں جگہ، مجھے بھی کسی جگہ کا امیر بنادو، حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میری اس درخواست پر) نبی کریم ﷺ نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: اے ابو ذر! تم کمزور ہو، اور کسی جگہ کا تم کو امیر بنادیا حسانا (ایک طرح کا منصب وعہدہ ہے، جو) ایک طرح کی امانت ہے (یہ دنیا میں تو بہت اچھا لگتا ہے کہ بڑائی ملتی ہے، عہدہ ومنصب ملتا ہے) لیکن (اگر اس کا حق ادا نہیں کیا گیا تو) قیامت کے روز یہی چیز رسوائی اور ندامت کا سبب ہوگی۔ ہاں! جو اس کا حق ادا کرے اور اس ذمہ داری کو قبول کرنے پر جو جو کام سر پر آتے ہیں، ان کو پورے طور پر انجام دے؛ تب تو ٹھیک ہے۔

افادات:- اس روایت کو لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اپنی طرف سے تو سوال کرنا ہی نہیں چاہیے؛ لیکن اگر سامنے سے کوئی ذمہ داری دی جا رہی ہو تو اس کو چاہیے کہ برابر دیکھ لے کہ یہ ذمہ داری جو میرے حوالہ کی جا رہی ہے اس کو میں پورے طور پر انجام دے سکتا ہوں یا نہیں؟ اس ذمہ داری کو انجام دینے کے لئے جن وسائل اور اسباب، جن کمالات و خوبیوں، جس صلاحیت اور قابلیت کی ضرورت ہے وہ مجھ میں ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو پھر اس کو قبول نہ کرے، اس لئے کہ اس صورت میں اس کا حق ادا نہ ہو سکے گا، اور حق ادا نہ ہونے کی صورت میں ظاہر ہے کہ امانت میں خیانت ہوگی اور قیامت کے روز رسوائی ہوگی۔

۶۷۷:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قال: إِذَا كُفِّرَ

سَتَخْرِصُونَ عَلَى الْإِمَارَةِ، وَتَكُونُ نَدَامَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم لوگ امارت (حکمرانی، کرسی ومنصب) کی حرص و لالچ رکھو گے، آرزو رکھو گے اور تمنا کرو گے؛ لیکن یہی چیز قیامت کے روز ندامت اور پچھتاوے کا ذریعہ بنے گی۔

افادات:- فلاں عہدہ مجھے مل جائے، میں صدر بن جاؤں، میں سیکریٹری بن جاؤں، لیکن یہی چیز قیامت کے روز ندامت اور خسارہ کا ذریعہ بنے گی۔ اس روایت میں بھی وہی بات ارشاد فرمائی گئی جو اوپر گزر چکی ہے کہ مانگنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد نہیں ہوگی، اور مدد نہ ہونے کی صورت میں اس کے حقوق کی ادائیگی میں جو حق تلفی ہوگی اور کمی رہ جائے گی، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے روز سزا بھگتنی پڑے گی۔ اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا: تم حرص تو رکھتے ہو، لیکن یہی چیز قیامت میں ندامت کا ذریعہ بنے گی۔

حَتُّ السُّلْطَانِ وَالْقَاضِي وَغَيْرِهِمَا مِنْ
 وَلَاةِ الْأُمُورِ
 عَلَى اتِّخَاذِ وَزِيرٍ صَالِحٍ وَتَحْذِيرِهِمْ مِنْ
 قَرَنَاءِ السُّوءِ

بادشاہ اور قاضی وغیرہ حکمرانوں کو اپنے لئے
 صالح مشیر رکھنے کی ترغیب
 اور برے ساتھیوں سے بچنے کی تاکید

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

صالح آدمی کو مشیر بناؤ

اس باب میں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ حکمران جن کے ہاتھ میں کرسی کی وجہ سے کچھ پاورس اور اختیارات ہیں، چاہے حاکم اعلیٰ ہو، کسی جگہ کا گورنر یا کلکٹر ہو، قاضی ہو، یا جتنے بھی سربراہانِ مملکت ہیں؛ ان کو چاہیے کہ کسی صالح آدمی کو اپنا مشیر مقرر کر لیں۔ اس لیے کہ جتنے بھی ذمہ دار اور حکمران ہوتے ہیں ان کے پاورس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کے آس پاس بہت سارے لوگ جمع ہو جاتے ہیں جو ان کو مشورہ دینے کا کام کرتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں کو چاہیے کہ کسی صالح اور نیک آدمی کو جو اس کام کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ اپنے لیے مشیر مقرر کر لیں۔ اور بُرے رفقاء اور ساتھیوں سے اپنے آپ کو بچائیں اور ایسوں کی بات ماننے سے بچیں؛ ورنہ یہی لوگ ان کے لیے ہلاکت کا اور جہنم میں ڈھکیلے جانے کا ذریعہ بن جائیں گے۔

دنیا کی دوستیاں قیامت کی دشمنیاں

اس سلسلہ میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن پاک کی ایک آیت پیش کی ہے جو اپنے عام مفہوم کے لحاظ سے یہاں بھی صادق آتی ہے: ﴿الْأَخْلَآءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ﴾ (سورہ زخرف: ۶۱) دنیا کے اندر آپس میں جو دوستیاں کی جاتی ہیں، خاص کر وہ دوستیاں جو اپنی اغراض کی بنیاد پر ہوتی ہیں، ایسی سب دوستیاں قیامت کے روز دشمنیوں میں تبدیل ہو جائیں گی، اور جب وہاں اس کا نتیجہ ظاہر ہوگا تو یہ سب ایک دوسرے کے خلاف بارگاہِ الہی میں مقدمہ دائر کریں گے کہ اس نے میرا یوں کیا اور توں کیا ﴿إِلَّا الْمُتَّقِينَ﴾ البتہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں، اور

جن کا تعلق آپس میں اپنی اغراض کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی نسبت پر ہے، ایسی دوستی دنیا میں بھی کارآمد ہے اور آخرت میں بھی کام آئے گی کہ یہ دوستی دشمنی سے نہیں بدلے گی، بلکہ باقی رہے گی، اور اس سے ان شاء اللہ فائدہ بھی پہنچے گا۔

قاعدہ کلیہ

۶۷۸:- وعن أبي سعيدٍ وأبي هريرة رضي الله عنهما أنَّ رسولَ الله ﷺ قال: مَا بَعَثَ اللَّهُ مِنْ نَبِيٍّ، وَلَا اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِيفَةٍ إِلَّا كَانَتْ لَهُ بِطَانَتَانِ: بَطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بِالْمَعْرُوفِ وَتَحْضُمُهُ عَلَيْهِ، وَبَطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بِالشَّرِّ وَتَحْضُمُهُ عَلَيْهِ، وَالْبَعْضُ مِنْ عَصَمَ اللَّهُ (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جو بھی نبی بھیجا، یا جس کو خلیفہ بنایا ہے، ان کے کچھ خصوصی مشورہ دینے والے ہوتے ہیں، جن میں کچھ لوگ اچھے بھی ہوتے ہیں جو اس کو اچھا مشورہ دیتے ہیں اور بھلائی کے لیے آمادہ کرتے ہیں، اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو برا مشورہ دیتے ہیں اور برائی کے لئے آمادہ کرنے والے اور برائی کی ترغیب دینے والے ہوتے ہیں؛ لیکن معصوم تو وہی رہتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ بچالے۔

افادات:- ”بَطَانَةٌ“ ایسا آدمی جو بالکل اندر گھسا ہوا ہو، جس کا اس کے اوپر پورا پورا اثر ہوتا ہے، اور وہ مشورہ کے طور پر اپنی ہی بات منواتا ہے۔ اس روایت کے الفاظ پر غور کیجئے ”مَا بَعَثَ اللَّهُ مِنْ نَبِيٍّ“ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کے پاس بھی دونوں طرح کے لوگ ہوں گے۔

اس روایت میں نبی کریم ﷺ نے ایک اصول اور قاعدہ کلیہ بتلادیا کہ اللہ

تعالیٰ کے یہاں یہی دستور ہے کہ اگر کسی کو کسی جگہ کی حکمرانی یا کسی جگہ کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔ اور یہ حکم عام ہے، چاہے وہ سربراہ اعلیٰ اور بادشاہ وقت ہو، یا کسی صوبہ کی سربراہی ہو، یا اپنی قوم، اپنے خاندان، اپنے قبیلہ کی سرداری، ذمہ داری اور امارت ہو۔ تو اس امیر کے پاس اثر انداز جو حلقہ ہوتا ہے، اس میں دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اچھائی کا مشورہ دینے والے، بھلائی کی ترغیب دینے والے بھی ہوتے ہیں اور برائی کے لیے ابھارنے والے بھی ہوتے ہیں۔ جتنے بھی صاحب اختیار لوگ ہوں گے، جیسے: کسی کو کسی جماعت و برادری کا پریسیڈنٹ بنادیا گیا، کسی کو مدرسہ کا مہتمم بنادیا گیا، کسی کو مسجد کا متولی بنادیا گیا، ان سب کے لیے یہی قانون ہے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے خیر مقدر فرمائی ہے تو وہ اچھے مشورے دینے والوں ہی کی سنے گا، اس کی سمجھ میں انہی کی بات بیٹھے گی اور وہی کرے گا، دوسروں کی بات پر دھیان بھی نہیں دے گا، لہذا اچھا مشورہ دینے والوں کی وجہ سے اگر اچھا فیصلہ کرے گا وہ کام اچھے طریقہ سے انجام پذیر ہوگا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق شامل حال نہیں ہے تو پھر غلط مشورے دینے والوں کی بات ہی اس کی کھوپڑی اور دماغ میں بیٹھے گی، اچھی راہ دکھانے والوں کی بات سمجھ میں ہی نہیں آئے گی اور ان کی نہیں مانے گا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی توفیق چھین رکھی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی آدمی ایسا ہے ہی نہیں جس کے پاس اچھی بات پہنچتی ہی نہ ہو۔

مصاحبین سے بدگمانیاں مت کرو

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کے آس پاس کے حلقہ کے بارے میں دور رہ کر بدگمانی میں مبتلا ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہمارے سماج و معاشرہ میں صاحب

اختیار کے پاس بیٹھنے والوں کے متعلق بھی بہت زیادہ بدگمانیاں کی جاتی ہیں، اگر صاحب اختیار نے کوئی غلط فیصلہ اور اقدام کیا، تو کہیں نہ کہیں سے وہ بات اس کے کان میں پڑی ہوگی، لیکن ہم لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ متعین ہی کر دیتے ہیں کہ فلاں نے ہی ایسا کہا ہوگا، اس لیے اس نے ایسا کیا۔ ارے بھائی! کیا تم سننے لگتے تھے کہ اس نے ہی یہ کہا ہے! ایسی بدگمانی بالکل غلط ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ دوسرا آدمی تو صرف بتلانے والا ہوتا ہے، کرنے والا تو خود وہی ہے، اور جب اس کی توفیق ہی چھین لی گئی ہے تو دوسرا کیا کرے گا۔ پھر بعض مرتبہ تو صرف بدگمانی کی بنیاد پر لوگ اس کے درپے آزار ہو جاتے ہیں، حالاں کہ اس بات میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی، بعد میں جب حالات کا پتہ چلتا ہے اور حقیقت سامنے آتی ہے، تو پھر بدگمانی کرنے والے پچھتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہاں بھائی! دراصل اس نے تو بہت اچھے اچھے مشورے دئے تھے، لیکن اُسی نے نہیں مانے، ہم نے خواہ مخواہ ہی بدگمانیاں کیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی کے متعلق بدگمانیوں میں مبتلا نہ ہوا جائے، بلکہ اگر حکمران و ذمہ دار کی طرف سے غلط چیزیں ہو رہی ہیں تو اس کی خیر خواہی یہی ہے کہ اس کے لیے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھلائی کی توفیق دے، اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے گا تو وہ بھلی باتیں مانے گا اور اس کے مطابق فیصلے کرے گا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ قدرت کا یہ ایک نظام ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی کو اچھے مشورے دینے والے موجود ہی نہ ہوں، اس کے ارد گرد ایسے لوگ ضرور ہوں گے۔ یہ اور بات رہی کہ توفیق نہ ہونے کی صورت میں وہ ان کی بات نہیں مانے گا اور جب توفیق ملے گی تو انہی کی مانے گا اور وہی کرے گا۔

اللہ تعالیٰ صاحب اختیار کے ساتھ جب بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں
 ۶۷۹:- وعن عائشة رضي الله عنها قالت: قال رسول الله ﷺ: إِذَا أَرَادَ اللَّهُ
 بِالْأَمِيرِ خَيْرًا، جَعَلَ لَهُ وَزِيرَ صَدِّقٍ، إِنْ نَسِيَ ذِكْرَهُ، وَإِنْ ذَكَرَ أَعَانَهُ، وَإِذَا أَرَادَ بِهِ
 غَيْرَ ذَلِكَ جَعَلَ لَهُ وَزِيرَ سُوءٍ، إِنْ نَسِيَ لَمْ يُذَكِّرْهُ، وَإِنْ ذَكَرَ لَمْ يُعِنِّهُ.

(رواہ أبو داود دیلمی و ترمذی علی شرط مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب
 اللہ تعالیٰ کسی امیر (حکمران اور سربراہ و ذمہ دار، صاحب اختیار) کے ساتھ بھلائی کا ارادہ
 فرماتے ہیں تو اس کو ایک مخلص اور خیر خواہ مشورہ دینے والا عطا فرماتے ہیں، اگر وہ بھلی بات کو بھولتا
 ہے تو یہ یاد دلاتا ہے، اور اگر اس کو یاد ہوتی ہے تو یہ مدد کرتا ہے، اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا
 ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کسی امیر کے ساتھ دوسرا کوئی (یعنی برائی کا) ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے
 لیے برا مشورہ دینے والا ساتھی مقرر کر دیتے ہیں، وہ اگر اچھی بات بھولتا بھی ہے تو یہ اس کو یاد نہیں
 دلاتا ہے، اور اگر اس کو یاد ہوتا ہے تو اس کو انجام دینے میں ساتھ نہیں دیتا (مدد نہیں کرتا، سپورٹ
 نہیں کرتا)۔

افادات:- قدرت کے اُسی نظام و دستور کے متعلق۔ جو اوپر بیان کیا گیا
 تھا۔ اس روایت میں بالکل صاف صاف ارشاد فرما دیا ہے۔

النہی عن تولیة الامارة والقضاء وغیرہا من الولايات لمن سألها أو حرص عليها فعرض بها امارت وقضاء وغیرہ عہدے، ان کا مطالبہ کرنے والوں یا لالچ رکھنے والوں کو دینے کی ممانعت

اس سلسلہ کا یہ آخری باب ہے۔ جو آدمی امارت، عہدہ قضاء، یا کسی بھی طرح کا عہدہ و منصب مانگے، اس کو وہ عہدہ و منصب دینے سے شریعت میں منع کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اسلام کا اصول تو یہی ہے کہ کوئی سامنے سے چل کر مانگے تو مت دو، بلکہ زبان سے نہیں بولا لیکن اس کی حرص و طلب اور لالچ دل میں ہے، اور اپنے دل کی بات اشاروں میں ظاہر کر رہا ہے، تاکہ سامنے والا سمجھ جائے کہ وہ فلاں عہدہ و منصب مانگ رہا ہے؛ ایسے آدمی کو بھی وہ عہدہ و منصب دینے سے منع کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کے دل میں عہدہ کی خواہش پیدا ہوئی اس کو اگر دو گے تو خیر نہیں ہے۔ پہلے بھی یہ بات آچکی کہ تمہارے مانگنے پر اگر دی گئی تو اس کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد نہیں ہوگی، اور اگر بغیر مانگے ملا تو اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری مدد کی جائے گی۔

جو کوئی عہدہ مانگے یا اس کی لالچ رکھے اس کو عہدہ نہیں دیتے

۶۸۰:- عن أبي موسى الأشعري رضي الله عنه قال: دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ: أَنَا وَرَجُلَانِ مِنْ بَنِي عَمِّي، فَقَالَ أَحَدُهُمَا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أُمِرْتُ نَأَى عَلَى بَعْضِ مَا وَلَّاكَ اللَّهُ - عَزَّ وَجَلَّ - . وَقَالَ الْآخَرُ مِثْلَ ذَلِكَ. فَقَالَ: إِنَّا وَاللَّهِ لَا نُؤَلِّي هَذَا الْعَمَلَ أَحَدًا سَأَلَهُ، أَوْ أَحَدًا حَرَصَ عَلَيْهِ.

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، میرے ساتھ میرے دو چچا زاد بھائی بھی تھے، ان دونوں میں سے ایک نے نبی کریم ﷺ سے درخواست کی کہ: اے اللہ کے رسول! فلاں ذمہ داری کا کام اور عہدہ جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے اختیار میں دیا ہے، وہ میرے حوالے کیجئے۔ دوسرے نے بھی ایسی ہی بات کہی۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی کوئی عہدہ ہم سے مانگے، یا دل میں کسی عہدہ کی لالچ رکھے، ہم اس کو وہ عہدہ نہیں دیتے۔

افادات:- دوسری روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: ابو موسیٰ! جاؤ! ہم تم کو مقرر کرتے ہیں، حالاں کہ ان کے دل میں اس کا خیال بھی نہیں تھا اور وہ اس مقصد کے لیے حاضر بھی نہیں ہوئے تھے، لیکن ان کو یمن کے ایک حصہ کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو آدمی خود عہدہ طلب کرے اسے نہیں دیا جائے۔ آج کل تو جمہوریت کا اصول ہی یہ ہے کہ الیکشن کے لیے آپ اپنا نام پیش کرو، جس میں پہلا کام ہی اپنی طرف سے مطالبہ پیش کرنے کا آتا ہے، حالاں کہ اوپر معلوم ہو چکا کہ جو عہدہ و منصب مانگنے سے ملا کرتا ہے اس میں سے اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد ہٹ جایا کرتی ہے، اور جو ذمہ داری بغیر مانگے ملا کرتی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہوتی ہے، اس لیے ہمیں اسلام کی ان ساری تعلیمات کو مد نظر رکھنی چاہئیں۔

مکتب الادب

باب الحیاء وفضله

والحث علی التخلق به

شرم کا بیان اور اس کی فضیلت

اور شرم اختیار کرنے کی ترغیب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حیاء اور شرم کسے کہتے ہیں؟

علامہ نووی رحمہ اللہ نے اس باب کے اخیر میں خود ہی حیاء کی وضاحت فرمائی ہے ویسے حیاء کی تشریح لغوی اعتبار سے یہ کی گئی ہے: ”تَغْيِيرٌ وَإِنْكَسَارٌ يَعْتَرِي الْإِنْسَانَ مِنْ خَوْفٍ مَا يَعْابُ بِهِ وَيُلَاظُهُ عَلَيْهِ“ ایسا کام جس کے کرنے کی وجہ سے آدمی پر کوئی داغ اور عیب آتا ہو، یا جس کے کرنے پر لوگ اس پر ملامت کرتے ہوں (کہ تم نے یہ کیا حرکت کی؟) ایسے ڈر سے آدمی کی طبیعت میں ایک طرح کی جو شکستگی پیدا ہوتی ہے اور پھر ایسے کام سے بچنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے؛ اسی کا نام حیاء ہے۔

جیسے: ایک آدمی کے دل میں سنیمانہ دیکھنے کا خیال آیا لیکن وہ سوچتا ہے کہ اگر میں دیکھنے گیا تو لوگ کیا کہیں گے۔ جو بھی کام ایسا ہو جس کے کرنے پر لوگوں کی طرف سے اس پر نکتہ چینی اور ملامت ہوتی ہو، اس پر عیب لگتا ہو، اس خیال سے اس کام کے کرنے کا جذبہ اور حوصلہ ٹوٹے، طبیعت میں شکستگی پیدا ہو؛ اسی کا نام حیاء ہے۔

بعضوں نے اس کو انقباضی کیفیت کہا ہے: ”إِنْقِبَاضُ الْإِنْسَانِ عَنْ إِزْتِكَافِ مَا يَكْرَهُ“ ناپسندیدہ چیز جس کے کرنے سے آدمی کی طبیعت میں جو جھجک پیدا ہوتی ہے، جس کو گجراتی زبان میں (بھگتی) کہتے ہیں، یعنی کسی برے کام کے کرنے سے طبیعت منقبض ہوتی ہے (بھگتی) محسوس کرتی ہے؛ اسی کا نام حیاء ہے۔ یہ تو لغت اور ڈکشنری کے لحاظ سے حیاء کا معنی ہوا۔

شریعت کے اعتبار سے بتایا ہے کہ یہ ایک وصف اور خلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر جو وصف انسان کے دل میں پیدا کیے ہیں؛ ان کو خلق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تو جو وصف آدمی کو برے کام کے چھوڑنے پر آمادہ کرتا ہے، اور کسی بھی حق والے کے حق کی ادائیگی میں (حق کوئی بھی ہو، اللہ کا حق، بندوں کا حق) کوتاہی کرنے سے آدمی کو روکتا ہو؛ اس وصف کو شریعت کی اصطلاح میں ”حیاء اور شرم“ کہتے ہیں۔

شرم تو ایمان کا حصہ ہے

۶۸۱:- عن ابن عمر رضی اللہ عنہما أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَرَّ عَلَى رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ وَهُوَ يَعْظُ أَخَاهُ فِي الْحَيَاءِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: دَعَهُ، فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيمَانِ. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا گزر ایک انصاری کے پاس سے ہوا جو اپنے بھائی کو شرم کے سلسلہ میں نصیحت کر رہا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اس نصیحت کرنے والے سے کہا: بھائی! چھوڑ بھی؛ (ایسی نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے) شرم والی خوبی بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔

افادات:- دوسری روایت میں موجود ہے کہ وہ کہہ رہا تھا کہ تو کتنی زیادہ شرم رکھتا ہے جس کی وجہ سے تجھے نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ جیسے: بعض آدمیوں کے مزاج میں اتنی حیاء ہوتی ہے کہ وہ اپنا حق جو دوسرے کے اوپر ہوتا ہے اس کے وصول کرنے میں بھی جھجک محسوس کرتے ہیں، حیاء کی صفت ان کو سختی کرنے سے روکتی ہے اور سامنے والا اس کا حق نہیں دیتا تو یہ شرماتا اور سوچتا ہے کہ اس سے سختی کے ساتھ کیسے بات کروں۔ اس انصاری کا بھائی بھی ایسا ہی تھا، تو وہ اپنے بھائی کو نصیحت کر رہا تھا کہ اگر تو ایسا ہی کرتا رہے گا تو لوگ تجھے جینے نہیں دیں گے، ایسی شرم اچھی نہیں ہے، اتنا نرم بھی مت رہ، تھوڑا بہت پھوٹ پھاں (۱۹۱ ۱۹۲) کرنی چاہیے۔ نبی کریم ﷺ نے اس نصیحت کرنے والے سے کہا: دَعَهُ! فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيمَانِ۔ بھائی! ایسی نصیحت کرنے کی

ضرورت نہیں ہے، اس کو ایسا ہی رہنے دو؛ یہ شرم تو ایمان کا ایک حصہ ہے۔ گویا یہ بڑی قیمتی چیز ہے۔ یہ جو کر رہا ہے وہ کوئی برا کام نہیں ہے کہ اس پر آپ اس کو ڈانٹ رہے اور روک رہے ہیں! بلکہ یہ تو ایمان کا تقاضہ ہے، اور یہ وصف جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی اچھا ہے، اس میں کوئی برائی نہیں ہے، اس میں خیر ہی خیر اور بھلائی ہی بھلائی ہے۔ اگرچہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہو کہ اس سے کچھ نقصان ہو رہا ہے لیکن حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

۶۸۲:- وعن عمران بن حصین رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: الْحَيَاءُ لَا يَأْتِي إِلَّا بِالْخَيْرِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

وفی روایۃ لیسلم: الْحَيَاءُ خَيْرٌ كُلُّهُ. أَوْ قَالَ: الْحَيَاءُ كُلُّهُ خَيْرٌ.

ترجمہ:- حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے (اسی واقعہ میں یہ بھی آیا ہے کہ وہ بھائی جو نصیحت کر رہا تھا اس سے) نبی کریم ﷺ نے فرمایا: حیاء اور شرم تو پوری کی پوری بھلائی اور خیر ہی خیر ہے، اس میں کوئی بری چیز ہے ہی نہیں (اس لئے اس بارے میں کوئی نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔)

ایمان کی ایک شاخ

۶۸۳:- وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: الْإِيمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ أَوْ بِضْعٌ وَسِتُّونَ شُعْبَةً: فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((البِضْعُ)) بکسر الباء و یجوز فتحها: وَهُوَ مِنَ الثَّلَاثَةِ إِلَى الْعَشْرَةِ.
وَ((الشُّعْبَةُ)): الْقِطْعَةُ وَالْخَصْلَةُ. وَ((الْإِمَاطَةُ)): الْإِزَالَةُ. وَ((الْأَذَى

((مَا يُؤْذِي كَجَبَرٍ وَشَوْكٍ وَطَبِينٍ وَرَمَادٍ وَقَذَرٍ وَمُخَوِّذٍ))

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایمان کی ستر (۷۰) سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، اور ایک روایت میں ہے کہ ایمان کی ساٹھ (۶۰) سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، جس میں سب سے اعلیٰ درجہ ”لا الہ الا اللہ“ ہے، اور سب سے کم درجہ تکلیف دینے والی چیز (پتھر یا کانٹا، وغیرہ) کو راستہ سے ہٹانا ہے، اور حیاء بھی ایمان کی ایک بڑی شاخ ہے۔

افادات:- حیاء اور شرم کی اہمیت کے پیش نظر اس کو الگ سے بیان کیا۔ ایمان کے نتیجے میں آدمی کو جتنے بھی اچھائی کے کام کرنے ہیں، یا جن برائی کے کاموں سے اپنے آپ کو بچانا ہے، ان تمام اچھائی کے کاموں پر آمادہ کرنے والی اور تمام برائی کے کاموں سے آدمی کو روکنے والی چیز حیاء ہی ہے۔

حقیقی حیاء اور شرم

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرات صحابہ سے ارشاد فرمایا: اسْتَحْيُوا مِنَ اللَّهِ حَقَّ الْحَيَاءِ. قَالَ: قُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّا لَنَسْتَحْيِي وَالْحَمْدُ لِلَّهِ. قَالَ: لَيْسَ ذَٰكَ. وَلَكِنَّ الْإِسْتِحْيَاءَ مِنَ اللَّهِ حَقَّ الْحَيَاءِ أَنْ تَحْفَظَ الرَّأْسَ وَمَا وَعَى، وَتَحْفَظَ الْبُطْنَ وَمَا حَوَى، وَتَتَذَكَّرَ الْمَوْتَ وَالْبَلَى، وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ تَرَكَ زِينَةَ الدُّنْيَا. فَمَنْ فَعَلَ ذَٰلِكَ فَقَدْ اسْتَحْيَا مِنَ اللَّهِ حَقَّ الْحَيَاءِ. (ترمذی شریف: ۲۶۲۶) اللہ تعالیٰ سے ایسی شرم رکھو جیسی شرم رکھنی چاہیے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم تو الحمد للہ شرم رکھتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ایسی بات نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے حقیقی شرم یہ ہے کہ آدمی اپنے سر کی اور جن چیزوں کو سر

لئے ہوئے ہے؛ ان سب کی حفاظت کرے۔ یعنی آنکھیں، زبان، کان، خیالات، عقائد، تصورات؛ یہ ساری چیزیں سر سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان سے کوئی ایسی بات نہ ہو جو شریعت کے تقاضہ اور حکم کے خلاف ہو۔ اور پیٹ کی اور جن چیزوں کو پیٹ اپنے اندر لئے ہوئے ہے؛ ان سب کی حفاظت کرے۔ یعنی حرام لقمہ سے پیٹ کو بچائے اور غلط طریقہ سے کسی کا مال ہڑپ کرنے سے اپنے آپ کو بچائے۔ اور آدمی موت کو اور موت کے بعد گل سڑ جانے کو یاد رکھے۔ اور جو آدمی آخرت چاہتا ہے وہ دنیا کی زینت کو چھوڑ دے یعنی آخرت کو دنیا کے مقابلہ میں ترجیح دے؛ اسی کا نام اللہ تعالیٰ سے حقیقی حیاء ہے گویا آدمی اپنے پورے جسم کی اس طرح حفاظت کرے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں مبتلا ہونے کی نوبت نہ آئے، اور سارے حقوق ادا ہوں، دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دے، گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے؛ اسی کو استحضار کی کیفیت کہا جاتا ہے کہ ہر وقت آدمی یہ سوچے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے۔ اسی لئے بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حدیث جبریل میں جس چیز کو احسان سے تعبیر کیا گیا ہے، ترمذی شریف کی اس روایت میں بھی وہی مقصود ہے۔ جب آدمی میں استحضار والی یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی؛ تو پھر ان شاء اللہ وہ کبھی گناہ نہیں کرے گا۔

اور ایک روایت میں یہ بھی ہے، حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: الْحَيَاءُ وَالْإِيمَانُ قُرْنَا جَمِيعًا، فَإِذَا رُفِعَ أَحَدُهُمَا رُفِعَ الْآخَرُ (المستدرک علی الصحیحین: ۸۵) حیاء اور ایمان دونوں جوڑی ہیں، ایک جاتا ہے تو دوسرا بھی جاتا ہے۔

بے حیائی کی منظم سازش

اسی لئے اسلام کے دشمنوں نے خاص کر یہودیوں نے آج سے دو صدی پہلے

اٹھارہویں صدی میں پورے عالم پر اپنا تسلط جمانے کے لئے کچھ فیصلے کئے تھے جو یہودیوں کا پروٹوکول (Protocol) کہلاتا ہے کہ آئندہ ہمیں اپنا نظام کس طرح کا چلانا ہے، ان فیصلوں میں انہوں نے ایک بات یہ طے کی تھی کہ بے حیائی کو ایسی عام کردہ آدمی کے مزاج میں سے حیاء اور شرم کا مادہ ہی ختم ہو جائے۔ آج کل ٹی وی اور انٹرنیٹ پر جتنے بھی پروگرام آتے ہیں اور میڈیا کے مختلف میگزین کے ذریعہ جن کی تشہیر کی جاتی ہے، جو مستقل ایک فن بن چکا ہے، ان ساری چیزوں کی جڑ اور بنیاد شرم و حیاء کے مادے کو ختم کرنا ہے۔ اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ حَيْسًا اَذْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِهِ النَّبُوَّةُ الْاُولٰٓئِ، اِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاَفْعَلْ مَا شِئْتُ (صحیح البخاری: ۵۱۲۰) تمہارے اندر سے جب شرم کا مادہ ختم ہو جائے تو پھر جو چاہو کرو۔ یہ حیاء ہی ہے جو آدمی کو گناہوں سے روکتی ہے، ایک مرتبہ کسی نے حیاء والی دیوار کو ڈھادیا؛ تو پھر وہ کسی بھی طرح کی حرکت کرنے میں جھجھک محسوس نہیں کرتا۔

عام طور پر عورت کے مزاج میں حیاء اور شرم ہوا کرتی ہے، لیکن بعض عورتوں کو دیکھا ہوگا کہ جب ان کے اندر سے صفتِ حیاء ختم ہو جاتی ہے، تو پھر کوئی بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا، سب ان سے ڈرتے ہیں۔ کوئی عورت جب بے حیا ہو کر سامنے آتی ہے تو پھر وہ نہ باپ کی عزت کو خاطر میں لاتی ہے، اور نہ بیٹے اور شوہر کو خاطر میں لاتی ہے، پھر تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ حیاء اور شرم ایک بڑا پردہ اور آڑ ہے، اور ہر انسان کے مزاج میں اللہ تعالیٰ نے یہ وصف رکھا ہے، اگر یہ وصف ختم کر دیا جائے، اور ایسی محنت کی جائے کہ مزاج میں سے یہ مادہ ختم ہو جائے؛ تو پھر وہ ہر طرح کا اقدام کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا اور کوئی طاقت اس کو روک سکتی نہیں ہے۔ ”بے حیاء باش و ہرچہ خواہی گن“ بے شرم بنو اور پھر جو چاہو کرو۔ گجراتی میں کہاوت ہے:

“naiva ne aivani ane niyosvani shu”

یعنی ننگے بن گئے تو بس پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔ جب آدمی میں سے حیاء ختم ہو جاتی ہے تو اس کا مزاج اسی قسم کا بن جاتا ہے۔ اسی لئے حیاء کی بڑی اہمیت ہے، اسلام نے اپنے اخلاقی نظام کی بنیاد جن چیزوں پر رکھی ہے اس میں عفت اور حیاء بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اسی لئے اخلاقی نظاموں کو برباد کرنے والے جتنے بھی لوگ ہیں ان کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ آدمی میں سے حیاء کے مادہ کو ختم کر دیا جائے، جب یہ مادہ ختم ہو جائے گا تو پھر آدمی ساری برائیاں آسانی سے قبول کرتا چلا جائے گا۔

حضور اکرم ﷺ کی شرم و حیاء

۶۸۴:- وعن أبي سعيدٍ الخدري رضي الله عنه قال: كان رسول الله ﷺ أشدَّ حياءً من العذراءِ في خدرِها، فإذا رأى شيئاً يكرهه عرفناه في وجهه. (متفقٌ عليه)
قال العلماء: حقيقة الحياء خلقٌ يبعث على ترك القبيح، ويمتنع من التَّقصير في حقِّ ذي الحقِّ.

وَرَوَيْنَا عَنْ أَبِي الْقَاسِمِ الْجُنَيْدِ رَحِمَهُ اللَّهُ قَالَ: الْحَيَاءُ: رُؤْيَةُ الْآلَاءِ - أَيْ النِّعَمِ - وَرُؤْيَةُ التَّقْصِيرِ، فَيَتَوَلَّى بَيْنَهُمَا حَالَةً تُسَمَّى حَيَاءً. (والله أعلم)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ شرم و حیاء میں کنواری لڑکی سے جو اپنے پردہ میں ہو کہیں زائد بڑھے ہوئے تھے، جب آپ کو کوئی بات ناگوار ہوتی تو ہم آپ کے چہرہ سے پہچان لیتے (حضور ﷺ غایت شرم کی وجہ سے اظہارِ ناپسندیدگی بھی نہ فرماتے تھے)

افادات:- ”کنواری لڑکی اپنے پردہ میں ہو“ کے دو مطلب علماء نے

لکھے ہیں۔ ایک جماعت علماء نے یہ فرمایا ہے کہ: اس سے پردہ نشین کنواری مراد ہے کہ وہ اس کنواری لڑکی سے جو باہر پھرتی ہو، بہت زیادہ شرمیلی ہوتی ہے، گو کنواری ہر ایک ہی شرم دار ہوتی ہے۔ اسی لیے شریعت نے کنواری لڑکی کے نکاح کی اجازت کے لیے اس کے سکوت کو کافی بتایا ہے کہ کنواری کے لیے شرم طبعی چیز ہے، اور بالخصوص پردہ دار لڑکی۔ اور بعض علماء نے پردہ نشین سے وہ لڑکی مراد لی ہے جو پردہ میں تربیت دی گئی ہو کہ اس کو عورتوں سے بھی پردہ کرایا گیا ہو۔ چنانچہ باہر پھرنے والی عورتوں سے اس کا پردہ کرانا بہت سے خاندانوں میں آج بھی مروج ہے۔ یہ لڑکی جس قدر شرمیلی ہوگی ظاہر ہے۔

دوسرا مطلب بعض علماء نے اپنے پردہ میں ہونے سے کنایہ بتایا ہے شبِ عروس کا۔ کہ کنواری لڑکی پہلی شب میں جس قدر شرمیلی ہوتی ہے وہ ظاہر ہے۔

باب حفظ السر

کسی کے بھید کی حفاظت کرنا

راز داری سے کام لینا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

راز داری کے اصول

نیا عنوان قائم کیا ہے کہ کسی آدمی نے اپنے کسی معاملہ میں، اپنی کسی بات میں، یا آپ کے ساتھ کئے گئے کسی سلوک میں آپ سے یہ امید قائم کی کہ آپ اس کو راز میں رکھیں گے، کسی کے سامنے اس کا اظہار نہیں کریں گے؛ تو پھر آپ کی یہ ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ اس راز کی حفاظت کریں، کسی کے سامنے اس کا اظہار نہ کریں، البتہ اگر وہ بات خلاف شرع ہے اور اس کی وجہ سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے، تو پھر اس کے راز کا لحاظ رکھنا لازم نہیں ہے۔ مثلاً: کسی نے آپ کو بتلایا کہ میں فلاں کے گھر میں چوری کرنے والا ہوں، اور دیکھو! یہ راز کی بات ہے، تم کسی کو بتلانا مت۔ اب آپ بھی یہ سوچیں کہ شریعت میں راز داری کی تاکید آئی ہے، اس کا لحاظ کرتے ہوئے آپ کسی کو واقف نہ کریں؛ تو یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ آدمی جو حرکت کرنے والا ہے وہ تو گناہ کا کام ہے، اس کے نتیجہ میں خدا کے دوسرے بندے کو نقصان پہنچنے والا ہے، اس کو نقصان سے بچانے کے لیے اس کے اس راز سے آگاہ کر دیا جائے تو یہ عمل شریعت کے راز داری والے حکم کے خلاف شمار نہیں ہوگا۔

صریح راز

اب یہ راز کی جو بات ہوتی ہے اس میں کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بات کرنے والا خود ہی زبان سے صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ یہ بات میں آپ کو راز کے طور پر بتا رہا ہوں؛ تب تو بات صاف ہے، اور اس صورت میں اس کو راز ہی سمجھا جائے گا، اس کی حفاظت کرنا ضروری ہو جائے گا، اس کا کسی کے سامنے اظہار کرنا غلط کام ہو جائے گا،

اس میں اپنی طرف سے کوئی دوسرا مطلب نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

راز کا انداز

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان سے اس بات کا اظہار تو نہیں کرتا کہ یہ راز ہے، لیکن وہ انداز ایسا اختیار کرتا ہے جس کی وجہ سے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اپنی بات کو راز میں رکھنا چاہتا ہے، جیسے: آپ کو اپنے پاس بلا کرواں موجود دوسرے لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ ذرا ہٹ جائیے، میں ان سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ یا آپ سے بات شروع کرنے سے پہلے ادھر ادھر برابر دیکھا کہ کوئی سن تو نہیں رہا ہے، اور اطمینان کرنے کے بعد آپ سے بات کی؛ تو اس صورت میں اگرچہ اس نے اپنی زبان سے یہ نہیں کہا ہے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ راز کے طور پر ہے، لیکن جو انداز اختیار کیا گیا وہ خود بتلا رہا ہے کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ بطور راز اور بھید کے ہے، آپ کو اس کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کرنا ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے، حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بات کرنے سے پہلے کوئی آدمی اگر دائیں بائیں دیکھے اور پھر وہ کوئی بات آپ سے کہے؛ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ راز کی بات ہے، اب آپ کو اس بات کی حفاظت کرنی ضروری ہے۔

یہ بھی راز ہے

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپس کے کچھ معاملات رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں ایک فریق کے دوسرے فریق کے ساتھ کچھ مخصوص تعلقات ہوتے ہیں جن کی شریعت کی طرف سے اجازت بھی دی گئی ہے، ان کی بنیاد پر ایک دوسرے کے ساتھ کوئی سلوک کرتے ہیں، مثلاً: میاں بیوی کا تعلق ورشتہ ہے جن کی بنیاد پر آپس میں

کچھ معاملات اور باتیں ایسی ہوتی ہیں جو سب کے سامنے انجام نہیں دی جاتیں؛ وہ بھی راز ہیں۔ شریعت اس کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی، جیسا کہ حدیث میں صراحتاً موجود ہے، اور اس کے اظہار پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ اس لیے آدمی یہ نہ سمجھے کہ مرد اپنے دوستوں کے سامنے، یا عورت اپنی سہیلیوں کے سامنے ان باتوں کو ظاہر کر سکتی ہے۔ شریعت نے اس کو سخت گناہ قرار دیا ہے۔

یا کاروباری اعتبار سے دو آدمی شریک اور پارٹنر ہیں، اپنے کاروبار سے تعلق رکھنے والے کچھ معاملات اور چیزیں ہیں جن سے کسی اور کو کوئی نقصان بھی نہیں ہے، تو وہاں پر بھی ان راز اور بھیدوں کا لحاظ کیا جائے گا، اگرچہ بعد یہ شراکت باقی نہ بھی رہے تب بھی ان کو ایک دوسرے کی ان چیزوں کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

حضور ﷺ کے رازدار کی رازداری

بہر حال! شریعت نے جن آداب اور حسنِ اخلاق کی تعلیم دی ہے، ان میں سے یہ بھی ہے کہ راز اور بھید سے تعلق رکھنے والی چیزوں کا کسی کے سامنے اظہار نہ کیا جائے۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نبی کریم ﷺ نے ایک راز کی بات بتلائی تھی۔ غزوہ تبوک کے موقع پر بعض منافقین جو ساتھ میں آئے تھے انہوں نے سازش اور اسکیم تیار کی تھی کہ تبوک جانے کا راستہ بڑا طویل ہے اور راستہ میں پہاڑیاں اور بڑی سخت گھاٹیاں آتی ہیں، ان میں سے ایک پہاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے (نعوذ باللہ) اندھیرے میں حضور اکرم ﷺ پر حملہ کر کے آپ کا کام تمام کر دیا جائے، وہ منافقین لشکر میں شامل تھے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس سازش سے حضور اکرم ﷺ کو آگاہ کر دیا اور ان منافقین کے نام بھی حضور اکرم ﷺ کو بتلا دیئے تھے، پھر حضور ﷺ نے ان کے ناموں کا تذکرہ

بطورِ راز کے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کیا اور ان منافقین کے نام بھی آپ ﷺ نے ان کو بتلائے جن کے متعلق بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ نے یہ بتلادیا تھا ان کی موت نفاق پر ہی آنے والی ہے، جن کو توبہ نصیب ہونے والی تھی ان کے نام نہیں بتلائے تھے، اس لیے کہ منافقین کی بڑی تعداد ایسی تھی جن کو موقع بموقع اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق عطا فرمائی تھی اور ان کی موت ایمان پر آئی تھی، لیکن بعض ایسے بھی تھے جن کی نفاق کی حالت ہی میں موت آئی، اور اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو ان کی نماز جنازہ پڑھنے سے بھی منع فرمادیا تھا، انہی میں سے منافقین کا سردار عبداللہ بن ابی بھی تھا۔ اس کے جو بیٹے تھے جن کا نام بھی عبداللہ تھا، وہ مخلص مؤمن تھے۔ اور چوں کہ عبداللہ بن ابی ظاہری طور پر اپنے آپ کو مسلمان بتلاتا تھا، جتنے بھی منافقین تھے وہ سب اپنی زبان سے تو ایمان ہی ظاہر کرتے تھے، اور حضور ﷺ کی طرف سے بھی ان کے ساتھ اہل ایمان والا ہی معاملہ کیا جاتا تھا، یعنی جیسے ایک مسلمان کی جان و مال محفوظ ہے اسی طرح ان کی بھی جان و مال محفوظ سمجھی جاتی تھی، اس کے علاوہ اور معاملات کا بھی حال تھا، ان کے ساتھ کافروں جیسا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ عبداللہ بن ابی کی طرف سے بہت سے مواقع پر ایسے کام رونما ہوئے تھے کہ جن کی وجہ سے اس کا منافق ہونا سب کے سامنے واضح ہو چکا تھا، بہت سے مواقع پر اس نے مسلمانوں کو اور خود حضور اکرم ﷺ کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کی تھیں۔ جب عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے حضرت عبداللہ نے نبی کریم ﷺ سے درخواست کی کہ میرے باپ کا انتقال ہو گیا ہے، آپ تشریف لا کر اس کے جنازہ کی نماز پڑھائیے۔ حضور ﷺ تشریف لے گئے، جب جنازہ رکھا گیا اور آپ نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھے اور نماز شروع کرنا ہی چاہتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آگے بڑھے اور حضور کا کرتہ پکڑ لیا اور کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! آپ اس کی نماز جنازہ

پڑھا رہے ہیں؟ اس نے فلاں وقت یہ حرکت کی تھی، فلاں وقت یہ حرکت کی تھی۔ اسلام کے خلاف اس نے جو جو حرکتیں تھیں وہ سب گنوائیں اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق خود فرمایا ہے کہ اگر آپ ستر مرتبہ بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کریں، تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے؛ پھر بھی آپ اس کی نماز جنازہ پڑھائیں گے؟ حضور اکرم ﷺ سب سنتے رہے، جب وہ خاموش ہو گئے تو حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان کی جنازہ کی نماز پڑھانے سے مجھے صاف صاف منع نہیں فرمایا ہے۔ خیر! آپ نے نماز جنازہ پڑھائی اور ابھی آپ وہاں سے ہٹے بھی نہیں تھے کہ آیت ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّتَّ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ﴾ نازل ہوئی، اور اس طرح آئندہ ان کی نماز جنازہ پڑھنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا، اور آپ کو یہ بھی بتادیا کہ منافقین میں کون کون ہیں جن کی موت نفاق پر آنے والی ہے، اور پھر آپ ﷺ نے ان کے نام حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی بتا دیئے تھے، لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کبھی کسی صحابی کے سامنے ان کے ناموں کا اظہار نہیں کیا اسی لیے ان کا لقب ”صاحب سر رسول اللہ“ یعنی ”حضور اکرم ﷺ کے رازدار“ تھا، البتہ چوں کہ ان کو معلوم تھا کہ فلاں فلاں کی موت نفاق پر آنے والی ہے اس لئے حضور ﷺ کی وفات کے بعد جب کسی کا انتقال ہوتا تو بعض محتاط صحابہ جیسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس بات کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے اور خبر نکلو اتے تھے کہ دیکھو! جنازہ کی نماز میں حضرت حذیفہ موجود ہیں یا نہیں؟ اگر وہ حاضر ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شریک ہو جاتے، ورنہ نہیں جاتے تھے۔ اور ان کا کسی کے جنازہ میں حاضر نہ ہونا اس بات کا قرینہ اور علامت سمجھی جاتی تھی کہ یہ منافق تھا۔ بہر حال! یہ تو دوسرے دیکھتے تھے اور اندازہ لگا لیتے تھے، لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ اور یہ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد ایسا کرتے تھے، اس لیے کہ جب تک نبی

کریم ﷺ موجود تھے وہاں تک تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، آپ ﷺ جس کی جنازہ کی نماز پڑھیں، اس سے معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ مؤمن ہے، تو سب لوگ بھی پڑھ لیتے تھے۔

راز امانت ہوتے ہیں

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی نے بھی کوئی چیز بطور راز اور بھید کے بتلائی ہو، اس کا لحاظ کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ راز ایک طرح کی امانت ہے، اور جس طرح امانت کی پاسداری ضروری ہے؛ اسی طرح راز اور بھید کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ چون کہ اس نے آپ پر اعتماد و بھروسہ کیا ہے اس لئے اس کے خلاف کوئی کام نہیں کیا جاسکتا؛ ورنہ وہ خیانت قرار دیا جائے گا۔

عہد کے بارے میں سوال ہوگا

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: ﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾ جو عہد و پیمان اور ایگریمنٹ ہیں ان کو پورا کرو، اس لیے کہ قیامت کے روز آپس کے عہد و پیمان کے متعلق پوچھ ہوگی کہ ان کو پورا کیا یا نہیں؟ ان کے حقوق کو ادا کیا یا نہیں؟ جو راز اور بھید ہوتے ہیں وہ بھی ایک طرح کے عہد ہی ہوتے ہیں، اس لیے ان کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں بدترین شخص

۶۸۵:- عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: إِنَّ مِنْ أَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللَّهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ الرَّجُلُ يُفْضِي إِلَى الْمَرْأَةِ وَتُفْضِي إِلَيْهِ، ثُمَّ يَنْشُرُ سِرَّهَا. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے بڑے مرتبہ والا اور سب سے بدترین آدمی وہ ہے کہ جو تنہائی میں اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کے لیے بے پردہ ہوا، اور بیوی بھی شوہر کے لیے بے پردہ ہوئی (میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ہے، ان کا اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے اور صحبت کے لیے ستر کھولا جائے گا) پھر وہ آدمی اپنی بیوی کا بھید لوگوں کے سامنے ظاہر کرتا پھرے۔

افادات:- یعنی شوہر ہونے کی حیثیت سے تنہائی میں جو معاملہ اپنی بیوی کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے، اور میاں بیوی کے تعلقات کے نتیجے میں آپس جو کچھ بھی ہو رہا ہے؛ ظاہر ہے کہ وہ سب ایک طرح کا بھید اور راز ہے، اس لیے اگر شوہر کسی کے بھی سامنے - چاہے وہ جگری دوست ہی کیوں نہ ہو - اس کا اظہار کرتا ہے؛ تو قیامت کے روز ایسا آدمی اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں بدترین شخص ہوگا۔ یہی حکم عورت کا بھی ہے کہ اگر عورت اپنی سہیلیوں کے سامنے ایسی چیزوں کا اظہار کرتی ہے۔

چوں کہ عام طور پر یہ چیزیں مردوں کی طرف سے زیادہ پیش آتی ہیں، اس لیے مردوں کا تذکرہ کیا گیا، لیکن آج ایسا زمانہ آ گیا ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلہ میں ایسی باتیں زیادہ کہنے لگی ہیں۔ بہر حال! یہ حکم دونوں کے لیے ہے کہ میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ایک طرح کا راز ہے جس کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کیا جاسکتا۔

راز داری کا ایک واقعہ

۶۸۶ھ - وعن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما: أنَّ عمرَ رضي الله عنه حين تأيَّمَتْ بِنُتْهِ حَفْصَةُ، قَالَ: لَقِيتُ عُمَرَ بْنَ عَفَّانَ رضي الله عنه، فَعَرَضْتُ عَلَيْهِ حَفْصَةَ، فَقُلْتُ: إِنَّ شَيْئًا أَكْثَرُكَ حَفْصَةَ بِنْتُ عُمَرَ؛ قَالَ: سَأَنْظُرُ فِي أَمْرِي. فَلَيْثُ لَيْسَ لِي شَيْءٌ

لَقِيتَنِي، فَقَالَ: قَدْ بَدَأَ إِلَيَّ أَنْ لَا أَتَزَوَّجَ يَوْجِي هَذَا. فَلَقِيتُ أَبَا بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، فَقُلْتُ: إِنَّ شِدَّتْ أَنْ كَحُتِكَ حَفْصَةَ بَدَتْ عُمَرُ؟ فَصَبَّتْ أَبُو بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، فَلَمْ يَرْجِعْ إِلَيَّ شَيْئاً! فَكُنْتُ عَلَيْهِ أَوْ جَدَّ مِثِّي عَلَى عُمَانَ. فَلِيتَ لِيَا لِي ثُمَّ خَطَبَهَا النَّبِيُّ ﷺ، فَأَنْكَحَهَا إِلَيْهَا. فَلَقِيتَنِي أَبُو بَكْرٍ، فَقَالَ: لَعَلَّكَ وَجَدْتَ عَلِيَّ حِينَ عَرَضْتَ عَلَيَّ حَفْصَةَ فَلَمْ أَرْجِعْ إِلَيْكَ شَيْئاً؟ فَقُلْتُ: نَعَمْ. قَالَ: فَإِنَّهُ لَمْ يَمْنَعْنِي أَنْ أَرْجِعْ إِلَيْكَ فِيمَا عَرَضْتَ عَلَيَّ إِلَّا أَنِّي كُنْتُ عَلِمْتُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ ذَكَرَهَا، فَلَمْ أَكُنْ لَأُفْشِي سِرَّ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، وَلَوْ تَرَكَهَا النَّبِيُّ ﷺ لَقَبِلْتُهَا. (رواه البخاری)

((تَأَيَّمْتُ)) أَيْ: صَارَتْ بِلاَ زَوْجٍ، وَكَانَ زَوْجُهَا تُوفًى. (وَجَدْتُ):

غَضِبْتُ

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما (راز سے تعلق رکھنے والا ایک واقعہ) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا (جو بعد میں اُم المؤمنین بنیں) کے پہلے شوہر کا جب انتقال ہوا (جن کا نام حُنَیْس بن حذافہ سہمی تھا، غزوہ بدر میں شریک ہوئے تھے، غزوہٴ احد میں زخمی ہوئے اور اسی میں ان کا انتقال ہوا) تو وہ بیوہ ہوئیں۔ جب عدت پوری ہوگئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے ملا اور ان سے کہا: اگر تم چاہو اور تمہارے دل میں رغبت ہو تو میں اپنی بیٹی حفصہ کو تمہارے نکاح میں دیدوں (گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی صاحبزادی کا پیغام نکاح لے کر بذاتِ خود گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بات کی) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں اس وقت تو یہ کہا کہ میں سوچوں گا، پھر چند دن گزرنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مجھ سے ملے اور کہا: سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں آپ کی صاحبزادی سے نکاح کرنا نہیں چاہتا (حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں) اس کے بعد میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملا اور

ان سے کہا: اگر تم چاہو تو میں اپنی بیٹی حفصہ کو تمہارے نکاح میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ میری اس پیشکش اور درخواست پر حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا (نہ ہاں کہا اور نہ منع کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں) مجھے ان پر حضرت عثمانؓ کے مقابلہ میں زیادہ ناراضگی ہوئی (اس لیے کہ انہوں نے اگرچہ ”نا“ کہا، لیکن جواب تو دیا، اور یہ تو کچھ بولتے ہی نہیں) خیر! پھر چند دن گزرے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے حفصہ کے لیے پیغام نکاح بھیجا، تو میں نے حضور ﷺ سے نکاح کر دیا۔ جب نکاح ہو گیا اس کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرے پاس ملاقات کے لیے آئے اور کہا: فلاں موقع پر تم نے مجھے اپنی صاحبزادی کے ساتھ نکاح کے لیے پیشکش کی تھی اور میں خاموش رہا تھا، شاید اس کی وجہ سے تم کو برا معلوم ہوا ہے، اور تم مجھ سے ناراض ہو؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: جی ہاں۔ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: بات دراصل یہ ہے کہ میں نے جواب اس لیے نہیں دیا تھا کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے میرے سامنے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ کیا تھا (اور آپ ﷺ کے انداز تذکرہ سے میں یہ سمجھا تھا کہ حضور اکرم ﷺ کا ارادہ ان کے ساتھ نکاح کرنے کا ہے۔ اگرچہ یہ بات آپ کو معلوم نہیں تھی لیکن مجھے تو معلوم تھی، اس لیے جب آپ نے میرے سامنے ان کے نکاح والی بات پیش کی تو چوں کہ وہ بات میرے علم میں تھی، اس لیے میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور یہ سوچا کہ آپ ﷺ نے جو تذکرہ کیا ہے جس سے آپ کا ارادہ معلوم ہو رہا ہے (لیکن آئندہ چل کر اگر نبی کریم ﷺ ان سے نکاح نہیں کریں گے، اور مجھے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ نبی کریم ﷺ کا ارادہ نکاح کرنے کا نہیں ہے، تو میں آپ کی پیشکش قبول کر لوں گا) (اس لیے جواب میں میں نے نہ ”نا“ کہا، اور نہ ”ہاں“ کہا۔ اگر ”نا“ کا جواب دیتا تو دروازہ بسند ہو جاتا، اور اگر ہاں کہتا تو جب حضور ﷺ نے ایک بات ارشاد فرمائی تھی اس کا لحاظ نہ رہتا۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ: پھر آپ مجھے بتا دیتے نا

کہ ایسی ایسی بات ہے۔ اس وقت کیوں نہیں بتایا؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا) میں حضور اکرم ﷺ کا بھید کیسے کھول سکتا ہوں (یعنی جو خلاصہ میں ابھی کر رہا ہوں۔ یہی خلاصہ اگر میں اس وقت کرتا تو چوں کہ حضور ﷺ نے میرے سامنے تذکرہ کیا تھا اس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ حضور ﷺ کا نکاح کرنے کا ادارہ ہے، اور یہ بات آپ ﷺ نے میرے سامنے ایک راز کے طور پر کہی تھی، اگر میں تمہارے سامنے وہ راز بتا دیتا تو مطلب یہ ہوتا کہ میں حضور ﷺ کے راز کو تمہارے سامنے کھول رہا ہوں، اب جبکہ وہ معاملہ ہو چکا ہے تو آپ کی ناراضگی دور کرنے کی غرض سے میں اس بات کی وضاحت کر رہا ہوں)

نکاح کا پیغام لڑکے والے بھیجیں یا لڑکی والے؟

افادات:- یہاں ایک مسئلہ اور آگیا کہ نکاح کا پیغام لڑکے والے بھیجیں یا لڑکی والے؟ ویسے عورت کے احترام کا تقاضہ یہی ہے کہ لڑکے والوں کی طرف سے پیغام بھیجا جائے اور رشتہ کے لیے مطالبہ کیا جائے کہ ہم اپنے لڑکے کا تمہاری لڑکی سے رشتہ چاہتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے برعکس دوسری شکل جائز ہی نہیں، بلکہ اگر کسی موقع پر دیکھا کہ کوئی لڑکا نیک ہے اور جگہ بھی اچھی ہے اور ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ ہے، تو اس صورت میں لڑکی والے سامنے چل کر درخواست کریں اور مطالبہ کریں کہ اگر تم اپنے لڑکے کا ہماری لڑکی سے نکاح کرانا چاہو، تو ہم رشتہ دینے کے لیے تیار ہیں؛ یہ بھی شریعت سے ثابت ہے۔ دیکھو! حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے رشتہ کے لیے خود حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ اگر تم چاہو تو میں اپنی بیٹی حفصہ کا نکاح تم سے کر دوں۔

ایک اور روایت بخاری شریف میں موجود ہے۔ اُم المؤمنین حضرت اُم حبیبہؓ

نے حضورِ اکرم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ میری بہن سے نکاح کر لیجئے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے پوچھا: کیا تم ایسا چاہتی ہو؟ اس لیے کہ کسی کے شوہر کے نکاح میں کوئی دوسری عورت آئے یہ تو عام طور پر عورت کا مزاج نہیں ہے، اس لیے حضور ﷺ نے ان کا امتحان لینے کے لیے پوچھا۔ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں آپ کے نکاح ہوں، اور آپ کسی اور سے بھی نکاح تو کر رہی رہے ہیں، اور کسی بھی عورت کا آپ کے نکاح میں آنا اس کے لیے دنیا و آخرت میں بڑی سعادت کی بات ہے، تو میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ سعادت میری بہن کو نصیب ہو جائے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ میرے لیے حلال نہیں ہے، اس لیے کہ کسی عورت کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی بہن سے نکاح کرنا حرام ہے۔ بہر حال! امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”الجامع الصحیح“ میں مستقل ایک عنوان قائم کیا ہے: باب عَرَضَ الْإِنْسَانِ ابْنَتَهُ أَوْ أُخْتَهُ عَلَى أَهْلِ الْخَيْرِ، اس کے تحت اس روایت کو لائے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی والوں کی طرف سے پیشکش کی جاسکتی ہے۔ (بخاری شریف: رقم الحدیث: ۵۱۲۳)

آج ہمارے سماج میں اس کو معیوب سمجھ کر لڑکی والے بیٹھے رہتے ہیں یہاں تک کہ لڑکی کی عمر بڑی ہو جاتی ہے اور پھر زندگی بھر اس کا نکاح نہیں ہو پاتا۔ اس لیے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اگرچہ بہتر شکل تو وہی تھی کہ انتظار کیا جاتا، لیکن جب دیکھ رہے ہیں کہ وہ شکل نہیں بن رہی ہے تو پھر اپنی طرف سے پیش قدمی کر کے معاملہ کو نمٹانے کی ضرورت ہے، اس انتظار میں بیٹھے رہنا کہ سامنے سے رشتہ آئے تو شادی کریں گے اور رشتہ نہ آئے تو لڑکیوں کے نکاح نہ کرنا، یہاں تک کہ ساری زندگی اسی طرح گزر جائے، یہ پسندیدہ نہیں ہے، اس کے نتیجے میں پھر بہت ساری برائیاں پھیلتی ہیں۔

فوائدِ حدیث

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر آپ کے کسی طرزِ غسل سے کسی کو ناراضگی ہوئی ہو، اور اسی وقت اس بات کا خلاصہ کرنے میں دوسری کوئی خرابی لازم آتی ہو تو آپ اس وقت خاموشی اختیار کر سکتے ہیں، بعد میں جب وہ خرابی نہ رہے، تو پھر آپ اس بات کا خلاصہ کر کے اس ناراضگی کو دور کر لیں۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے تذکرہ کیا تو انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ جب حضور ﷺ کا ارادہ ان سے نکاح کرنے کا ہے، تو آپ پیغام بھیجیں گے ہی! اس لیے اگر میں ابھی سے کہہ دوں تو اس میں کیا حرج ہے! اس لیے کہ اس وقت تو صرف آپ کا ارادہ معلوم ہوا تھا، اب معلوم نہیں کہ اس ارادہ میں پختگی آکر آپ اس کو عملی جامہ پہناتے ہیں یا نہیں؟ اس لیے یہ چیز راز ہی کی تھی، اور انہوں نے اس کا لحاظ کیا۔ لیکن ہم لوگ ایسے معاملات میں ذرا فاسط (Fast) چل جاتے ہیں، اور یہی سوچنے لگ جاتے ہیں کہ جب ارادہ کا اظہار کیا ہے تو اگر میں ابھی کہہ دوں تو اس میں کیا حرج ہے! اگر سامنے والے نے کہا ہو کہ آپ کہہ دینا تب تو ٹھیک ہے، لیکن جب اس نے کہا نہیں ہے، بلکہ صرف اپنے ارادہ کا اظہار کیا ہے تو ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ اس بات کا کسی کے سامنے اظہار کریں۔

اور یہاں حضور ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ یہ بات رازی کی ہے، بلکہ جس انداز سے تذکرہ کیا تھا اس سے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سمجھ گئے تھے کہ میرے سامنے اس کا تذکرہ فرما رہے ہیں، کسی اور کے سامنے اس کا تذکرہ نہیں فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی اپنے کسی ارادہ کا اظہار صرف ہمارے ہی

سامنے کرے، کسی اور کے سامنے نہ کرے، جس سے پتہ چلے کہ وہ آئندہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے، تو یہ بھی اس کا راز ہے جس کا کسی دوسرے کے سامنے اظہار ہونا نہیں چاہیے۔

حضور ﷺ کے مرض الوفات کا واقعہ

۶۸۷- وعن عائشة رضي الله عنها قالت: كُنَّا أَزْوَاجَ النَّبِيِّ ﷺ عِنْدَهُ، فَأَقْبَلَتْ فَاطِمَةُ رضي الله عنها تَمْشِي، مَا تُخْطِيُ مَشْيَهَا مِنْ مَشْيَةِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ شَيْعًا، فَلَمَّا رَأَاهَا رَحَّبَ بِهَا، وَقَالَ: مَرْحَبًا بِابْنَتِي. ثُمَّ أَجْلَسَهَا عَنْ يَمِينِهِ أَوْ عَنْ شِمَالِهِ، ثُمَّ سَارَهَا، فَبَكَتُ بُكَاءً شَدِيدًا. فَلَمَّا رَأَى جَزَعَهَا، سَارَهَا الثَّانِيَةَ، فَضَجَّكَتْ. فَقُلْتُ لَهَا: خَصَّكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنْ بَيْنِ نِسَائِهِ بِالسَّيْرِ، إِرَ، ثُمَّ أَنْتِ تَبْكِينَ! فَلَمَّا قَامَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ سَأَلْتُهَا: مَا قَالَ لِكَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ؟ قَالَتْ: مَا كُنْتُ لِأُفْشِي. عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ سِرُّهُ. فَلَمَّا تَوَقَّي رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قُلْتُ: عَزَمْتُ عَلَيْكَ بِمَا لِي عَلَيْكَ مِنَ الْحَقِّ لَهَا حَدَّثْتَنِي مَا قَالَ لِكَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَتْ: أَمَّا الْآنَ فَتَنَعَمْ. أَمَّا حِينَ سَارَنِي فِي الْمَرَّةِ الْأُولَى، فَأُخْبِرَنِي أَنَّ جَبْرِيلَ كَانَ يُعَارِضُهُ الْقُرْآنَ فِي كُلِّ سَنَةٍ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ، وَأَنَّهُ عَارَضَهُ الْآنَ مَرَّتَيْنِ، وَإِنِّي لَا أَرَى الْأَجَلَ إِلَّا الْقَدِ افْتَرَبَ، فَاتَّقَى اللَّهَ وَاصْبِرِي، فَإِنَّهُ نِعَمَ السَّلَفِ أَتَاكَ، فَبَكَيْتُ بُكَائِي الَّذِي رَأَيْتُ. فَلَمَّا رَأَى جَزَعِي سَارَنِي الثَّانِيَةَ فَقَالَ: يَا فَاطِمَةُ! أَمَا تَرْضَيْنِ أَنْ تَكُونِي سَيِّدَةً نِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ أَوْ سَيِّدَةً نِسَاءِ هَذِهِ الْأُمَّةِ؟ فَضَجَّكَتُ ضَجْجِي الَّذِي رَأَيْتُ.

ترجمہ مع شرح:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی تمام

ازواج مطہرات مرض الوفات میں آپ کے پاس بیٹھیں ہوئی تھیں، اسی درمیان حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا

تشریف لائیں، ان کی چال حضور اکرم ﷺ کی چال سے ذرہ برابر بھی فرق نہیں رکھتی تھی (جس طرح حضور اکرم ﷺ چلتے تھے، ہو بہو اسی انداز سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا چلتی تھیں۔ حضور ﷺ اپنی اس بیماری میں اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے جب آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آتے ہوئے دیکھا) تو ان کو مرحبا اور خوش آمدید کہا (معلوم ہوا کہ آنے والے کا ”We l Come“ کرنا چاہیے، تاکہ وہ یہ سمجھے کہ میری آمد پر ان کو مسرت ہے، یہ بھی آنے والے کا ایک طرح کا اکرام ہے کہ اس کا استقبال اس انداز سے کیا جائے جس سے اس کا جی خوش ہو جائے۔ مہمان کے ساتھ جو آداب برتے جاتے ہیں ان میں پہلا ادب یہی ہے۔ اس معاملہ میں بھی ہمارے یہاں بڑی کوتاہیاں ہوتی ہیں دیکھو! حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی آمد پر حضور ﷺ نے فرمایا: (”مَرَّ حَبَّاءُ بِنْتِی“ بیماری بیٹی! آؤ، تمہارا آنا باعث مسرت ہے۔ پھر حضور ﷺ نے ان کو اپنے پاس بٹھایا، اور ان کے کان میں راز دارانہ انداز میں کوئی بات ارشاد فرمائی، جس کو سن کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بہت روئیں۔ حضور ﷺ نے جب ان کی اس بے صبری اور تکلیف کو دیکھا تو پھر دوبارہ ان کے کان میں راز دارانہ طور پر کوئی بات ارشاد فرمائی جس کو سن کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہنس پڑیں اور خوش ہو گئیں، ان کا غم دور ہو گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: یہاں حضور ﷺ کی تمام ازواجِ مطہرات بیٹھی ہوئی ہیں ان کو چھوڑ کر حضور ﷺ نے تمہارے کان میں ایک بات کہی، جو تمہارے لیے بڑے فخر کی چیز تھی؛ پھر بھی تم رونے لگیں؟ پھر جب حضور ﷺ وہاں سے ہٹے۔ اور بعض روایتوں میں سے کہ جب وہ خود وہاں سے اُٹھیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے پوچھا: حضور ﷺ نے تمہارے کان میں کیا بات کہی تھی؟ ذرا مجھے بھی بتاؤ۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں حضور ﷺ کے بھید کو کھولوں گی نہیں (جب کہ سب موجود تھیں اور میرے کان میں یہ بات کہی، اس کا مطلب ہی یہ تھا کہ وہ بات ان سب کے سامنے ظاہر کرنے جیسی نہیں

ہے، اگر سب کو بتانی ہوتی تو حضور ﷺ میرے کان میں کیوں فرماتے؟ اس لیے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے انکار کر دیا اور نہیں بتلایا) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب حضور ﷺ کا انتقال ہو گیا اس کے بعد میں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو قسم دے کر کہا: میرا تم پر ماں ہونے کی حیثیت سے حق ہے، اس کا واسطہ دے کر میں تم کو تاکید کرتی ہوں کہ حضور ﷺ نے تم سے جو کہا تھا وہ مجھے بتاؤ۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ہاں! اب وہ بات بھی نہیں رہی، اس لیے اب بتانے میں بھی کوئی اشکال نہیں، لہذا میں بتاتی ہوں۔ پہلی مرتبہ حضور ﷺ نے راز دارانہ انداز میں میرے کان میں جو بات ارشاد فرمائی تھی وہ یہ تھی کہ: حضرت جبرئیل علیہ السلام ہر سال رمضان المبارک میں میرے ساتھ قرآن پاک کا دو ایک مرتبہ کرتے تھے، لیکن اس سال دو مرتبہ دور کیا (حضور ﷺ نے حضرت جبرئیل کو سنایا اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو سنایا) اس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ میری موت کا وقت قریب آ گیا ہے، اور اس بیماری میں ہی میری موت آنے والی ہے، اس لیے تم اللہ سے ڈرتی رہنا اور صبر سے کام لینا، اس لیے کہ میں تمہارے لیے بڑا اچھا پیش رو ہوں۔ اس پر میں رو پڑی تھی جیسا کہ آپ نے دیکھا تھا کہ بڑا سخت رونا آیا تھا۔ جب حضور ﷺ نے میری تکلیف کو دیکھا تو پھر دوبارہ راز دارانہ انداز میں مجھ سے ایک بات ارشاد فرمائی: اے فاطمہ! کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ تم ایمان والی عورتوں کی سردار بنائی جاؤ گی، یا اس امت کی عورتوں کی تم سردار ہو گی؟ (گویا اتنا بڑا شرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جائے گا) تو میں خوشی میں ہنس پڑی جیسا آپ نے دیکھا۔

افادات:- یہاں یہ روایت اسی لیے لائے ہیں کہ دیکھئے! حضور ﷺ نے ایک بات بطور راز کے ان کے کان میں ارشاد فرمائی تھی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس کا اتنا لحاظ کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو حضور ﷺ کی بڑی لاڈلی زوجہ مطہرہ ہیں، ان کے پوچھنے پر بھی ان کو نہیں بتلایا۔

”فَرَطٌ“، یعنی پیش رو۔ جیسے اگر ہمیں بمبئی جانا ہو، تو ہمارا کوئی آدمی ہم سے پہلے بمبئی پہنچ جائے اور ہمارے لیے وہاں قیام کی سہولت کا نظم کر لے؛ اسی کو ”فَرَطٌ“، یعنی پیش رو سے تعبیر کرتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں ایسا ہوتا تھا کہ کسی قافلہ کو سفر کر کے جہاں جانا ہوتا تھا، تو کچھ لوگ پہلے ہی وہاں پہنچ جاتے تھے، اور قیام کی تیاریاں کر لیتے تھے، خیمے لگا دیتے تھے، پانی وغیرہ کا انتظام کر لیتے تھے، تاکہ بعد میں آنے والوں کو دشواری پیش نہ آئے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: میں بھی پہلے جا رہا ہوں، تاکہ تم بعد میں آؤ تو وہاں تیاریاں ہو جائے۔

بہر حال! حضور ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنی وفات کی اطلاع دی اور حضور ﷺ کی تمام ازواجِ مطہرات وہاں بیٹھی ہوئی تھیں، اور کسی بھی عورت کے لیے اپنے شوہر کی موت کا تصور سوہانِ روح ہوتا ہے، اس لیے حضور اکرم ﷺ اس چیز کو ان کے سامنے ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے، اور یہ بات حضور ﷺ نے رازدارانہ انداز میں صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بتلائی۔ اور ظاہر ہے وہ بیٹی تھی اور ایک بیٹی کے لیے بھی اپنے باپ کی جدائی بڑی تکلیف دہ ہوا کرتی ہے، تو اس پر وہ رو پڑیں، ان کی تسلی کے لیے حضور ﷺ نے دوسری بات ارشاد فرما کر اپنی وفات کی اطلاع دینے سے ان کو جو رنج و تکلیف ہوئی تھی اس کی تلافی فرمادی۔

بعض بھید ہمیشہ کے لیے بھید ہوتے ہیں

۶۸۸:- وعن ثَابِتٍ عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: أَتَى عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَأَنَا أَلْعَبُ مَعَ الْغُلَّامِ، فَسَلَّمَ عَلَيْنَا، فَبَعَثَنِي إِلَى حَاجَةٍ، فَأَبْطَأْتُ عَلَى أُخِي، فَلَمَّا جِئْتُ، قَالَتْ: مَا حَبَسَكَ؟ فَقُلْتُ: بَعَثَنِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِلَى حَاجَةٍ، قَالَتْ: مَا

حَاجَّتُهُ؟ قُلْتُ: إِنَّهُ أَسْرَى. قَالَتْ: (لَا تُخْذِرَنَّ بِسْرٍ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَحَدًا). قَالَ أَنَسٌ: وَاللَّهِ لَوْ حَدَّثْتُ بِهِ أَحَدًا لَكُنْتُ ثَنَّتْ بِهِ يَا ثَابِتُ. (رواہ مسلم وروی البخاری بعضہ مختصراً)

ترجمہ:- (حضرت ثابت بنانی رضی اللہ عنہ جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے خاص شاگرد اور خادم خاص تھے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص تھے) تو حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ جب کہ میں بچہ تھا اور بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے، سلام کیا اور مجھے ایک کام کے لیے بھیجا۔ چوں کہ میں ایک کام سے گیا تھا اس وجہ سے گھر پر والدہ کے پاس دیر سے پہنچا، تو میری والدہ نے پوچھا: دیر سے کیوں آئے؟ میں نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کام کے لیے بھیجا تھا۔ کہا: کس کام کے لیے بھیجا تھا؟ میں نے کہا: وہ رازی کی بات ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بھید ہے، اس لیے میں نہیں بتاؤں گا۔ اس پر والدہ نے بھی کہا: ٹھیک ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھید کسی کو بھی مت بتانا۔ بعد میں جب اس واقعہ کو حضرت ثبات بنانی رضی اللہ عنہ نقل فرما رہے تھے اس وقت کہا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: اے ثابت! اگر وہ بات میں کسی سے کہتا تو تم سے کہتا (لیکن میں نے کسی سے نہیں کہی، اور نہ کبھی کسی کو کہوں گا)۔

افادات:- اس روایت کو لاکر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بعض بھید اور راز ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو کبھی بھی کسی کو نہیں بتائے جاتے۔ دیکھو! اوپر آیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کی خبر دی تھی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد وہ بات بھید نہیں رہی اس لیے اگر اس کا اظہار کیا جاتا ہے کہ فلاں وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بھید کھولا۔ یا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا ارادہ فرمایا تھا تو جب تک کہ نکاح نہیں ہوا تھا وہاں تک وہ بھید کی بات تھی، لیکن جب نکاح ہو گیا تو اب وہ بات بھید کی نہیں رہی، بلکہ ساری دنیا کے سامنے آ گئی۔ اب اگر کوئی کہے کہ پہلے

مجھ سے حضور ﷺ نے یہ کہا تھا تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ لیکن بعض بھید اور راز ایسے ہوتے ہیں کہ جو ہمیشہ کے لیے ہی بھید ہوتے ہیں۔ اس روایت کو یہاں لا کر یہی بتانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! حضور ﷺ کی وفات کے بعد حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ثبات بنانی رضی اللہ عنہ سے یہ کہتے ہیں کہ اگر وہ بات کسی سے کہتا تو وہ تم سے کہتا، لیکن میں کسی کو نہیں کہوں گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض راز ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے راز اور بھید کی ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب وہ کون سے بھید ہوتے ہیں؟ تو یہ ہر آدمی کی اپنی اپنی سمجھداری کی بات ہے، آدمی اپنی عقل سے اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

الوفاء بالعہد و انجاز الوعد عہد و پیمان اور وعدہ پورا کرنا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قال الله تعالى: ﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾. (الاسراء: ۳۴) ﴿

قال الله تعالى: ﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾. (النحل: ۹۱) ﴿

وقال تعالى: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾. (البائدة: ۱) ﴿

وقال تعالى: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ كَبُرَ

مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾. (الصف: ۲۳) ﴿

عہد و پیمان کو پورا کرنے کا اہتمام

عنوان قائم کیا ہے: عہد و پیمان (جس کو گجراتی میں قرار (Agreement) اور انگریزی میں ایگریمنٹ (Agreement) کہتے ہیں) اور کسی بھی طرح کے وعدہ کو پورا کرنے کا اہتمام کرنا۔

اسلام نے جن اخلاق اور اعمالِ صالحہ کی تعلیم دی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی کسی کے ساتھ جو بھی عہد و پیمان اور وعدہ کرے اس کو پورا کرنے کا اہتمام کرے، یہ ایک ضروری چیز ہے اور قرآن کریم اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں اس کی بڑی تاکید ہے۔ اس سلسلہ میں چند آیتیں پیش کی ہیں:-

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾

(الاسراء: ۳۴) جو عہد و پیمان، قرار (Agreement) اور ایگریمنٹ (Agreement) تم کسی کے

ساتھ کرو؛ اس کو پورا کرو۔ اس لئے کہ جو عہد و پیمان کیا جاتا ہے، اس کے متعلق کل کو

قیامت میں سوال ہوگا اور پوچھا جائے گا کہ جو عہد و پیمان تم نے کیا تھا اس کو پورا کیا یا

نہیں؟ مطلب یہ ہے کہ اگر اس کو پورا کرنے میں کوتاہی کا ارتکاب کیا ہے یا اس کو پورا

نہیں کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر سزا دی جائے گی۔

کامیاب اہل ایمان کی نشانیوں میں سے یہ ہے

قرآن پاک میں ایک اور جگہ ارشاد ہے: ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ﴾ (المؤمنون: ۱) کامیاب ہونے والے اہل ایمان کے کچھ اوصاف، نشانیاں اور علامتیں بتلائی گئی ہیں، ان میں ایک وصف یہ بھی بیان کیا ہے: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَسَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ﴾ (۸) جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی رعایت کرتے ہیں، اس کا خیال رکھتے ہیں۔ جو عہد و پیمان کسی کے ساتھ کیا گیا ہے اس کو نبھانے کی کوشش کرتے ہیں، اس میں اپنی طرف سے ذرہ برابر بھی کوتاہی کا ارتکاب نہیں کرتے۔ جب یہ ایسی چیز ٹھہری کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے متعلق سوال ہوگا تو ظاہر ہے کہ اس کا اہتمام کرنا بھی ضروری ٹھہرا۔

اسی کو دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ﴾ (النحل: ۹۱) جب تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد و پیمان کر لیا تو اس کو پورا کرنے کا اہتمام کرو۔

قرآنی ایک اصول

فقہاء نے لکھا ہے کہ قرآن پاک اور احادیث سے جو احکام ثابت ہوتے ہیں ان کی اصولی چیزوں میں سے یہ بھی ہے کہ جس چیز کا حکم امر کے صیغہ کے ساتھ دیا جائے اس کا کرنا ضروری ہوتا ہے، الا یہ کہ اگر اسی کلام میں کوئی ایسا قرینہ، یا دلیل موجود ہو جس سے وجوب کے علاوہ دوسرا کوئی حکم ثابت ہوتا ہو۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو اس صورت میں اس پر عمل کرنا ضروری اور واجب ہوتا ہے۔

یہاں بھی امر کا صیغہ استعمال کیا گیا یعنی حکم دیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر

جو تم عہد و پیمان کرتے ہو؛ اس کو پورا کرو، اس میں تمہاری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ لہذا ان احکام پر عمل کرنا ضروری اور لازم ہے۔

زندگی کے معاملات عہد و پیمان ہیں

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ (البائعات: ۱) ﴿اے ایمان والو! وہ عقد جو آپس میں کرتے ہو؛ ان کو پورا کرو۔ آپس میں جو عقد اور معاملات کئے جاتے ہیں وہ بھی ایک طرح کا عہد و پیمان ہے۔ جیسے: آدمی کسی کے ساتھ اجارہ کا معاملہ کرتا ہے، بیع و شراء یعنی خرید و فروخت کا معاملہ کرتا ہے؛ یہ بھی ایک طرح کا عہد و پیمان ہے۔ خرید و فروخت میں جب سب باتیں طے ہو گئیں، اس کے بعد ان میں سے کوئی ایک آدمی اپنے اس کئے گئے وعدہ اور عہد و پیمان سے پھر جائے، جیسے: دیکھا کہ دوسرا آدمی زیادہ پیسے دے رہا ہے، تو پہلے والے کو انکار کر دیا کہ اب میں تیرے ساتھ معاملہ نہیں کرنا چاہتا، حالاں کہ شرائط کے خلاف کوئی ایسی بات پائی نہیں گئی ہے، محض اس لئے کہ اس کو قیمت زیادہ مل رہی ہے اور نیوی اعتبار سے کچھ زیادہ فائدہ نظر آ رہا ہے، یا اس سودے کو مکمل کرنے کی صورت میں بظاہر اپنا کچھ نقصان نظر آ رہا ہے، جیسے: اس مال کا بھاؤ گھٹ گیا اس لئے سودے سے پھر رہا ہے؛ ایسی بہت ساری صورتیں ہیں جو اس حکم میں داخل ہیں۔

اس آیت ”أَوْفُوا بِالْعُقُودِ“ میں باری تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ وہ عقد جو آپس میں کرتے ہو؛ ان کو پورا کرو۔ خرید و فروخت اور اجارہ وغیرہ کے بھی جتنے معاملات آپس میں کئے جاتے ہیں وہ سب اس حکم میں داخل ہیں، یہاں تک کہ نکاح کا معاملہ بھی اس میں داخل ہے۔ ایک مرد جب کسی عورت کے ساتھ نکاح کرتا ہے، تو عقدِ نکاح کے ذریعہ گویا وہ اس بات کی گارنٹی (Guarantee) دیتا ہے کہ میں بیوی کے حقوق کو ادا

کروں گا۔ اب اگر شوہر کی طرف سے اس کے حقوق کی ادائیگی میں کمی آئے گی تو اس عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے کا جو حکم اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا تھا اس میں اس کی طرف سے کوتاہی پائی گئی، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی پوچھ ہوگی۔

اس آیت میں گویا آدمی کی پوری زندگی کو سمیٹ لیا گیا ہے، اس لئے آدمی یہ نہ سمجھے کہ زندگی کا میرا کوئی حصہ اور پارٹ (Part) ایسا ہے جو اس میں داخل نہیں ہے؛ بلکہ زندگی کی تقریباً ساری چیزیں اس حکم میں آ جاتی ہیں۔

یہ بڑی خطرناک چیز ہے

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جس کو کرتے نہیں؟ یعنی آپ نے جب کسی کے ساتھ کوئی معاملہ کیا، عہد و پیمان، عقد اور وعدہ کیا، اب اگر اس کو آپ پورا نہیں کرتے تو اسی حکم میں آ گئے کہ ایک بات جو تم نہیں کرتے تو پھر کہتے ہی کیوں ہو! اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ بات بڑی ناراضگی کی اور اللہ کے غضب کو جوش میں لانے والی ہے۔ تم نے کسی سے وعدہ کیا اور اس کو پورا نہیں کیا تو یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جن چیزوں کی خاص طور پر تعلیم دی ہے، جو اخلاق اپنی اُمت کو سکھلائے ہیں، جن چیزوں کی طرف متوجہ کیا ہے، اس میں ایک یہ بھی ہے کہ وعدہ کو پورا کرو، عہد و پیمان کو بجالاؤ، اس عہد و پیمان کے خلاف کوئی چیز نہ کرو۔

معاشرہ میں ہونے والی کوتاہیاں

جیسے: ایک آدمی کسی کے یہاں ملازم ہوا، تو ملازمت اور سروس کے لئے جو ایگریمنٹ کیا جاتا ہے، اس میں دونوں طرف سے معاملات کئے جاتے ہیں اور ساری

باتیں طے ہوتی ہیں، مثلاً: آپ کو اپنا اتنا وقت دینا ہے، اور سامنے والے کی طرف سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اتنی تنخواہ دی جائے گی۔ اس کو یوں کرنا ہے، اور اس کے بدلہ میں اُس کو یوں کرنا ہے۔ یہ ایک معاملہ اور معاہدہ ہوا، اب دونوں کے لئے اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔

آج کل عام طور پر ہمارے معاشرہ میں ایسا مزاج بنتا جا رہا ہے کہ دونوں طرف سے کوتاہیاں برتی جا رہی ہیں، ادھر جس کے ذمہ کچھ کام دیئے گئے وہ بھی اپنے کام کو انجام دینے میں کوتاہی کا ارتکاب کرتا ہے، اس کو جو وقت دینا چاہیے وہ پورا وقت نہیں دیتا، اس میں کمی کرتا ہے، تو یہ اس کے عہد و پیمان کے خلاف ہو جائے گا۔ ادھر سامنے والی جو پارٹی (Party) اور فریق ہے اس کی طرف سے یہ ہوتا ہے کہ اس نے اگر کام پورا کر دیا، تو وہ پورا (Payment) نہیں کرتا، پوری تنخواہ نہیں دیتا، اس میں سے کچھ کاٹ لیتا ہے، یا وقت پر نہیں دیتا۔ جب آپ نے کسی ٹھیکیدار کو کوئی کام سونپا اور پورا معاملہ طے کر لیا اور کام پورا ہو گیا؛ تو پھر اسے پیسے کیوں نہیں دیے جا رہے ہیں؟ ٹال مٹول کی جا رہی ہے کہ کل دیں گے، بعد میں دیں گے، لیٹ (Late) کرتے جا رہے ہیں، تاخیر ہوتی جا رہی ہے، یہاں تک کہ اگر کسی مزدور سے کوئی مزدوری کروائی جاتی ہے تو اس کی مزدوری ادا کرنے تک میں سخت کوتاہی اور حق تلفی کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ اس کی داستانیں ہیں کہ جب ہم سنتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ اور ایسا بھی نہیں کہ آدمی کے پاس پیسے نہ ہوں، بلکہ پیسے موجود ہوتے ہوئے بھی مزدور کی مزدوری نہیں دیتے، حالاں کہ حضور اکرم ﷺ نے تاکید فرمائی ہے کہ مزدور کا پسینہ سوکھے اس سے پہلے اس کی مزدوری ادا کر دو۔ اور حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جس نے کسی

مزدور کی مزدوری ادا نہیں کی، تو کل کو قیامت میں میں اس کی طرف سے دعویٰ دائر کروں گا اور مدعی بنوں گا۔ قیامت میں حضور ﷺ جس کے وکیل بن کر آجائیں اور اس کی طرف سے دعویٰ دائر کر دیں؛ تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتنا اہم معاملہ ہے!

علامہ نووی رحمہ اللہ نے یہ چند آیتیں نمونہ کے طور پر پیش کی ہیں، ورنہ قرآن پاک میں اس سلسلہ میں بہت ساری آیتیں ہیں۔ آگے روایتیں پیش کر رہے ہیں۔

منافق کی نشانی اور ہمارا معاشرہ

۶۸۹:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قال: آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا أُؤْتِمِنَ خَانَ. (متفق عليه)

زاد فی روایتہ لمسلم: وَإِنْ صَامَ وَصَلَّى وَرَعِمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: منافق کی نشانیاں تین ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے، جب اس کے پاس کوئی چیز امانت کے طور پر رکھی جائے تو اس میں خیانت کا ارتکاب کرے

مسلم شریف کی روایت میں ہے:- وہ آدمی چاہے نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو، اور یہ سمجھتا ہو کہ میں مسلمان ہوں۔

افادات:- جس آدمی میں یہ علامتیں پائی جائیں گویا اس کو خالص مؤمن نہیں کہہ سکتے، اس میں نفاق والی صفات پائی جاتی ہیں۔ مؤمن کی شان یہ ہے کہ اپنے آپ کو ایسی چیزوں سے بچانے کا پورا اہتمام کرے۔ ہمارے اس عنوان اور موضوع سے تعلق رکھنے والی چیز دوسری ہے: ”وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ“ جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے۔ ”وعدہ“ میں یک طرفہ معاملہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی سامنے والے سے کہے۔

اور ”عہد و پیمان“ میں دونوں طرف سے وعدے ہوتے ہیں۔ تو جہاں دونوں طرف سے وعدہ ہو، اس کو ”عہد“ سے تعبیر کرتے ہیں، اور جہاں ایک طرف سے عہد ہوتا ہے اس کو ”وعدہ“ کہا جاتا ہے، دونوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ جہاں دونوں طرف سے وعدہ کیا گیا ہے وہاں دونوں کے لئے ضروری ہے کہ اس کی پابندی کریں، اور جہاں ایک طرف سے وعدہ کیا گیا ہو تو وہاں اس ایک کے لئے ضروری ہے کہ اس کی پابندی کرے، تو وعدہ کرنے کے بعد وعدہ خلافی کرنا منافق کی علامت قرار دی گئی ہے، ایک مؤمن کے لئے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو ایسی بری باتوں سے بچانے کا اہتمام کرے۔

اب وعدہ کے سلسلہ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر آدمی نے وعدہ کیا، اس وقت تو دل میں پختہ ارادہ تھا کہ میں اس کو پورا کروں گا، لیکن اس کے بعد حالات کچھ ایسے بدلے کہ اب اُس وعدہ میں جو چیز کی ذمہ داری لی تھی اس کو ادا کرنے کی اس میں طاقت نہیں رہی، اس کے خلاف صورتیں پیدا ہو گئیں، تو اس صورت کے اندر شرعاً اس کو معذور سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر ایسی صورت نہیں ہے، یا یہ ہے کہ جس وقت وعدہ کیا تھا اسی وقت دل میں چور تھا، جیسے بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسی وعدہ خلافی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا جس میں وعدہ کرتے وقت ہی آدمی کے دل میں یہ ہوتا ہے کہ اس وعدہ کو پورا نہیں کرنا ہے؟

آج کل یہ چیزیں عام ہوتی جا رہی ہیں کہ جب کہہ رہا ہوتا ہے اسی وقت دل میں خیال ہوتا ہے کہ یہ بات پوری نہیں کرنی ہے۔ بعض مرتبہ کہتے ہیں کہ سوچو! کیا کہہ رہے ہو؟ تو وہ کہتا ہے: مولوی صاحب! آپ کیوں فکر کرتے ہو، یہ تو ایسے ہی کہنے کی باتیں ہیں، جو کہہ رہا ہوں اس کو کرنا کہاں ہے؟ تو یہ پورے نفاق کی علامت ہے جس پر نبی کریم ﷺ نے بڑی سخت وعیدیں اشاد فرمائی ہیں۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے: ”وَإِنْ صَامَ وَصَلَّى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ“ وہ آدمی چاہے نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ میں مسلمان ہوں، پھر بھی حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جس میں یہ تین باتیں پائی جاتی ہیں تو وہ منافق ہے۔ کتنی سخت وعید ہے! اس لیے ایسی بری باتیں جن کو نبی کریم ﷺ نے نفاق کہا ہے، ان سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

باطن کچھ، اور ظاہر کچھ

نفاق کیا ہے؟ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ایک گروہ اور جماعت تھی جو اپنے آپ کو اپنی زبان سے مؤمن اور مسلمان ظاہر کرتے تھے، لیکن دل میں وہ بات نہیں تھی دل میں ان کا عقیدہ اس کے خلاف تھا۔ گویا باطن کچھ تھا اور ظاہر کچھ اور کرتے تھے؛ ایسے لوگ منافق کہے جاتے تھے۔ تو یہ آدمی بھی جب اپنے آپ کو کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں تو اس کو چاہیے کہ ایمان کے تقاضوں کو پورا کرتا رہے، اور ایمان کے تقاضوں میں سے یہ ہے کہ آدمی جو وعدہ اور عہد و پیمان کرے؛ اس کو پورا کرے۔ جب وہ وعدہ کو پورا نہیں کر رہا ہے تو گویا مؤمن والی شان اور مؤمن والی بات نہیں ہے، بلکہ منافقوں والا عمل اور خصلت ہو گئی۔ اسی لئے حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ آدمی منافق ہے؛ گویا ایسا آدمی مخلص مؤمن نہیں کہا جائے گا۔

منافق کی چار علامتیں

۶۹۰:- وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله عنهما: أنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ الْإِثْقَانِ: إِذَا أَوْثَمَنَ خَانَ، وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ،

وَإِذَا عَاهَدْتَ غَدْرًا، وَإِذَا خَاصَمْتَ فَجْرًا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی میں چار باتیں ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا، اور جس میں ان میں سے کوئی ایک بات ہوگی گویا اس میں نفاق کی ایک بات پائی جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کو چھوڑ دے (جب تک کہ چھوڑے گا نہیں وہاں تک گویا یہ برائی اس میں موجود ہے) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب کوئی عہد و پیمان کرے تو اس کو توڑ دے، اس کی خلاف ورزی کرے۔ اور جب کسی کے ساتھ جھگڑا کرے تو گالی گلوچ پر اتر آئے۔

افادات:- گویا منافق کی چار علامتیں بتلائی ہیں۔ اس روایت کو یہاں اس جزو "وَإِذَا عَاهَدْتَ غَدْرًا" کی وجہ سے لائے ہیں، کہ جب کوئی عہد و پیمان کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، اس کو توڑ دے؛ یہ نفاق کی ایک علامت ہے۔

وعدہ پورا کرنے کا عجیب و غریب واقعہ

دیکھو! وعدہ کو پورا کرنے کا نبی کریم ﷺ نے کتنا زیادہ اہتمام فرمایا۔ غزوہ بدر کا واقعہ ہے۔ حضرت حذیفہ بن یمان اور ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہما دونوں اپنے گھر پر مسلمان ہوئے، اسلام لانے کے بعد ہجرت کر کے وہ مدینہ منورہ جا رہے تھے، ابو جہل مشرکین کا لشکر لے کر مسلمانوں کے مقابلہ اور اپنے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے جا رہا تھا۔ غزوہ بدر اسی لئے تو پیش آیا تھا۔ راستہ میں یہ دونوں باپ بیٹا حضرت حذیفہ اور حضرت یمان رضی اللہ عنہما کو ابو جہل کے لشکر نے گرفتار کر لیا، ان کو ابو جہل کے پاس لایا گیا۔ اس نے پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ کہا: مدینہ منورہ جا رہے ہیں۔ پوچھا: کیوں؟ کہا: نبی کریم ﷺ کی ملاقات و زیارت اور ان کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے۔ اس

نے کہا: وہ تو لشکر لے کر ہمارے مقابلہ کے واسطہ نکلے ہیں، اس لئے تم دونوں کو ہم نہیں چھوڑیں گے، اپنی تحویل ہی میں رکھیں گے، اس لئے کہ اگر ہم نے تم کو چھوڑ دیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے دشمن کے لشکر میں ہم نے دو سپاہیوں اور لڑنے والوں کا اضافہ کر دیا، اس لئے ہم تم کو جانے نہیں دیں گے۔ ان دونوں باپ بیٹوں نے وعدہ کیا کہ ہم کو چھوڑو، تمہارے مقابلہ میں لڑنے کے لئے ہم نہیں آئیں گے، ہم تو خالص ملاقات اور زیارت کرنے جا رہے ہیں، چنانچہ اس وعدہ پر ان دونوں کو چھوڑ دیا گیا۔

اب یہ دونوں حضرات نبی کریم ﷺ سے جا کر ملے، آپ ﷺ لشکر لے کر نکل رہے تھے، انہوں نے اپنا پورا قصہ سنایا کہ ایسی صورت پیش آئی۔ اس کے بعد انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ مشرکین اور کفار کے مقابلہ کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں، ہمیں بھی ساتھ چلنے کی اجازت دیجئے۔

اس وقت حالات یہ تھے کہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان یہ پہلی جنگ تھی جس کو قرآن پاک نے یوم الفرقان، فیصلہ کے دن سے تعبیر کیا گیا۔ گویا یہ وہ جنگ ہے جس نے کفر اور اسلام کے درمیان امتیازی خط کھینچ دیا اور فیصلہ کر دیا۔ آپ ﷺ ایسی جنگ کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں، اور پھر حالات ایسے تھے کہ اُدھر مشرکین کا لشکر ہر طرح کے ساز و سامان سے لیس تھا، تمام ہتھیار ان کے پاس موجود تھے، تعداد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ایک ہزار کی تعداد تھی۔ اور ادھر مسلمان صرف تین سو تیرہ تھے اور ساز و سامان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو صرف ستر (۷۰) اونٹ، دو (۲) گھوڑے اور آٹھ (۸) تلواریں تھیں۔ تلواریں بھی سب کے پاس نہیں تھیں، کسی کے پاس ڈنڈا تھا، کسی کے پاس نیزہ تھا، تو کسی کے پاس اور کچھ تھا۔ ایسے موقع پر ظاہر ہے کہ جتنے آدمی زیادہ بڑھیں، اتنی ہی قوت اور طاقت بڑھے گی۔ جنگی حکمت عملی اور وقتی مصلحت کا

تقاضہ بھی یہی تھا کہ اپنے کسی ایک آدمی کو بھی کھویا نہ جائے، بلکہ اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اور ادھر یہ باپ بیٹے دونوں نبی کریم ﷺ سے درخواست کر رہے ہیں کہ اللہ کے رسول! ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم بھی آپ کے ساتھ شریک ہوں۔ لیکن حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں! تم ان سے وعدہ کر چکے ہو۔ انہوں نے کہا: اللہ کے رسول! وہ تو گردن پر تلوار رکھ کر لیا گیا وعدہ تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! جب تم نے وعدہ کر لیا ہے، تو اب تم کو ہم شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔

دیکھو! آدمی کے عمل کی پختگی کا پتہ ایسے موقع پر ہی چلتا ہے جب حالات ناسازگار اور ناموافق ہوں، ایسے حالات میں کوئی آدمی شریعت پر عمل کر کے بتلائے تو سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ شریعت پر عمل کے معاملہ میں پختہ ہے۔ حالات کی سازگاری کے موقع پر تو ہر آدمی آسانی سے عمل کر لیتا ہے۔ یہاں ان کی طرف سے اصرار ہو رہا تھا لیکن نبی کریم ﷺ نے عملی طور پر ان کے وعدہ کو پورا کر کے بتلا دیا۔ ہم اور آپ ہوتے تو تاویل میں کر لیتے کہ دشمن کے مقابلہ کا وقت ہے، اسلام اور کفر کا سوال ہے، اسلام کو قوت پہنچانا ضروری ہے، ایسے موقع پر یہ سب تھوڑا ہی دیکھا جاتا ہے، اور معلوم نہیں کیا کیا تاویل میں جاتیں، لیکن نبی کریم ﷺ نے ان کو اجازت نہیں دی اور وہ شریک نہ ہو پائے۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام میں وعدہ اور عہد و پیمان کو پورا کرنے کا کتنا زیادہ اہتمام اور کتنی سخت تاکید ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسے موقع پر بھی ان کو اپنے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی۔

عہد پورا کرنے کا بے مثال نمونہ

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق بعض حضرات اعتراض کی باتیں کرتے ہیں،

اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے زمانہ خلافت میں چوں کہ ان کا پایہ تخت شام میں تھا اور رومی سلطنت کی سرحدیں اس وقت شام کے ساتھ ملی ہوئی تھیں، تو رومیوں کے ساتھ ان کا مقابلہ ہوتا رہتا تھا۔ ایک موقع پر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رومی بادشاہ کے ساتھ ایک مدت تک کے لئے صلح کر لی کہ اتنی مدت تک ہم اور آپ آپس میں جنگ اور لڑائی نہیں کریں گے۔ جب صلح کی وہ مدت ختم ہونے جا رہی تھی اور کچھ دن باقی تھے، تو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوچا کہ ابھی کچھ دن باقی ہیں، میں اپنے لشکر کو لے جا کر سرحدوں (Boarder) پر بٹھا دوں، ان کو یہ اندازہ ہی نہیں ہوگا کہ صلح کی مدت پوری ہوتے ہی یہ لوگ حملہ کر دیں گے، وہ تو سمجھ رہے ہوں گے کہ صلح کی مدت پوری ہوگی اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوتا ہے؟ اس لئے انہوں نے ایک تدبیر سوچی کہ اپنا لشکر وہاں لے جا کر لگا دوں، چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سرحد پر اپنا لشکر لگا دیا۔ ابھی صلح کا زمانہ چل رہا تھا اور صلح کے زمانہ کے درمیان لڑائی شروع کرنے کا ارادہ بھی نہیں تھا، بلکہ ارادہ یہ تھا کہ جہاں صلح کی مدت پوری ہوگی۔ جیسے آج بارہ بجے ٹائم ختم ہوگا اور بارہ بج کر ایک منٹ پر۔ فوراً حملہ کر دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پہلے سے وہاں لشکر بٹھا دیا گیا تھا اور اچانک ایسا کیا گیا جس کا رومیوں کو وہم و گمان اور خیال بھی نہیں تھا اس لیے انہوں نے دفاع کی کوئی تدبیر بھی نہیں کی تھی۔ جب اس طرح حملہ کیا گیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لشکر دشمن کے علاقہ میں آگے بڑھتا ہی چلا گیا اور بہت سارا علاقہ فتح کر لیا، اور برابر آگے بڑھ رہے تھے کہ دیکھا پیچھے سے ایک گھوڑے سوار آ رہا ہے اور کہہ رہا ہے:

اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ! وَفَاءٌ لِّاَعْدَا، وَفَاءٌ لِّاَعْدَا“ اے ایمان والو! ٹھہر جاؤ، مؤمن

کا شیوہ عہد و پیمان کو پورا کرنا ہے، اس کی خلاف ورزی کرنا نہیں ہے۔

یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رک گئے۔ جب وہ قریب آئے تو دیکھا وہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: میں نے نبی کریم ﷺ کا ارشاد سنا ہے: مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ، فَلَا يَجْلِسُ عَقْدَةً، وَلَا يَشْدُ ثَمًّا، حَتَّى يَنْقُضِيَ أَمْدَهَا أَوْ يُبْذِلَ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ۔ (تفسیر ابن کثیر، الانفال، آیت نمبر: ۵۸) جب کسی قوم کے ساتھ صلح کے لئے کوئی عہد و پیمان کیا ہو، تو نہ اس کی گرہ کو کھولے، اور نہ اس کو سخت مضبوط کرے، جب تک کہ اس کی مدت پوری نہ ہو، یا یہ ہے کہ ان کو پہلے سے کھلم کھلا بتلا دیا جائے کہ ہمارا اور آپ کے درمیان عہد و پیمان باقی نہیں ہے۔

ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب صلح کا زمانہ چل رہا ہے اس میں آپ کا اپنے لشکر کو لے جا کر سرحدوں کے اوپر بٹھا دینا، جب کہ وہ یوں سمجھ رہے ہیں کہ ابھی کوئی ایسی تدبیر کی نہیں جائے گی، یہ آپس کی صلح کے تقاضہ کے خلاف ہے، یہ کاروائی بھی آپ کو صلح کی مدت کے پوری ہونے کے بعد کرنی چاہیے تھی، صلح کی مدت چل رہی ہے اور آپ یہ کاروائی کر رہے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے، اس لئے آپ نے یہ جو کیا ہے وہ ایک طرح کی عہد شکنی ہے۔ یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لشکر کو واپسی کا حکم دیا اور دشمن کا وہ پورا علاقہ جو فتح کر لیا گیا تھا خالی کر دیا اور اپنے لشکروں کو واپس بلا لیا گیا۔

تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے اور علماء فرماتے ہیں کہ مذاہب کی تاریخ میں کوئی دوسرا مذہب ایسا نمونہ پیش نہیں کر سکتا جس میں فسخ شدہ علاقہ اس طرح واپس کر دیا گیا ہو۔

آج کے حالات کا موازنہ

دشمن کے معاملہ میں تو آج کی تہذیب یافتہ دنیا جو اپنے آپ کو حقوق انسانی کی

علم بردار کہتی ہے، وہ کیا کچھ دھندھے نہیں کرتی ہے؛ وہ ہم اور آپ سب جانتے ہیں۔ آپ لوگ بھی اخبارات پڑھتے ہیں اس میں دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کیسی کیسی حرکتیں کرتے ہیں۔ لیکن یہاں دیکھئے کہ نبی کریم ﷺ کے ماننے والے، آپ پر ایمان لانے والے، آپ کے گرویدہ لوگوں نے دنیا کو یہ نمونہ بتا دیا کہ فسح کیا ہوا علاقہ بھی محض اس شک کی وجہ سے واپس کر دیا کہ کہیں ہمارا یہ عمل حضور اکرم ﷺ کے اس ارشاد کے خلاف نہ ہو جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انصاف کی ایک جھلک

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس زمانہ میں بیت المقدس کو فتح کیا تو وہاں جو غیر مسلم یہود و نصاریٰ وغیرہ آباد تھے، ان کے ساتھ عقدِ جزیہ کا معاملہ کیا گیا، یعنی ان کو معاہدہ بنایا گیا اور ان کے ساتھ عہد کیا گیا۔ اسلامی حکومت میں رہنے والے غیر مسلم جن کو اس بات کی گارنٹی دی جاتی ہے کہ تمہاری جان و مال کی ہماری طرف سے حفاظت کی جائے گی، لیکن اس کے معاوضہ میں تم سے ایک مخصوص مقدارِ رقم جزیہ اور ٹیکس کے طور پر لی جائے گی، جن کے ساتھ اس طرح کا معاہدہ ہوتا ہے اس کو عربی زبان میں ”مُعَاهِدٌ“ کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ عہد اور عقدِ ذمہ کیا گیا ہے، اسی لیے ان کو ذمی بھی کہا جاتا ہے

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں دشمن کے مقابلہ کے لئے ایک موقع پر زیادہ لشکر کی ضرورت پیش آئی، تو مشورہ میں یہ بات آئی کہ وہ لشکر جو بیت المقدس والے علاقہ کی حفاظت کے لئے رکھا گیا ہے، اس کو وہاں سے ہٹا کر سرحد (Boarder) پر بھیج دیا جائے، اس لئے کہ وہاں اس وقت شدید ضرورت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: ٹھیک ہے، اس لشکر کو وہاں سے بلا کر اس جگہ بھیجا تو جائے گا، لیکن چوں کہ یہ لشکر ہم

نے وہاں غیر مسلموں کی جان و مال کی حفاظت کے لئے رکھا تھا، اور ہم نے ان سے حفاظت کا عہد کیا ہے اور اسی پر ہم جزیہ بھی لیتے ہیں، اس لئے اس سال کا جو جزیہ ان سے لیا ہے وہ ہم واپس کریں گے۔ چنانچہ اعلان کیا گیا اور جو رقم ان سے جزیہ کے طور پر وصول کی گئی تھی ان کو واپس کی گئی کہ ہم اپنے اس لشکر کو یہاں سے ہٹا رہے ہیں اور ہم نے تم سے تمہارے تحفظ کا وعدہ کیا تھا، اسی تحفظ کے لئے یہ لشکر یہاں رکھا تھا، لیکن جب اس لشکر کو یہاں سے ہٹا رہے ہیں تو تمہاری وہ رقم بھی واپس کی جا رہی ہے۔ یہی وہ اخلاق تھے جن کو دیکھ کر غیر مسلم اسلام قبول کرتے تھے۔

آج ضرورت ہے اس بات کی.....

آج اس زمانہ میں بھی کوئی مسلمان اگر نبی کریم ﷺ کی انہی ساری تعلیمات کو اپنا کر زندگی گزارے گا، تو اس گئے گزرے دور میں بھی اس کا وہ عمل لوگوں کے لئے ایمان کی دعوت کا ذریعہ بنے گا۔ دعوت صرف زبانی چیز نہیں ہے، بلکہ اصل دعوت تو عمل کی ہے۔ آپ دیکھئے کہ جاو اسمٰ ترا اور چین کے علاقہ میں اسلام کہاں سے پہنچا! وہاں کیا کوئی داعی پہنچے تھے؟ نہیں! بلکہ وہاں تجارت کرنے والے پہنچے تھے، لیکن انہوں نے نبی کریم ﷺ کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق تجارت کی، تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں اپنائیں۔

آج ہمارا اسلام مسجدوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، ہم یوں سمجھتے ہیں کہ پانچ وقت نماز پڑھ لی، بس کافی ہے۔ نماز اپنی جگہ پر بہت اہم چیز ہے، بلکہ ساری ہی عبادتیں اہم ہیں، لیکن اسلام صرف عبادات کا نام نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ میں بار بار بتلا چکا ہوں

کہ اسلام کئی شعبوں کا نام ہے، اس میں اخلاق بھی ہیں، معاملات بھی ہیں، معاشرت بھی ہے، اور عبادات بھی ہیں۔ اس لئے ہمیں ہر چیز کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ لوگوں کے ساتھ جن چیزوں کا واسطہ پڑتا ہے وہ تو معاشرت، معاملات اور اخلاق ہے۔ آپ بازار میں جائیں گے تو بازار والوں کو معلوم نہیں ہے کہ آپ نماز کیسی خشوع و خضوع والی پڑھتے ہیں۔ جس کے ساتھ آپ سودا اور خرید و فروخت کر رہے ہیں اس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ آپ کتنی لمبی نماز پڑھتے ہیں، اور نماز میں کتنی تلاوت کرتے ہیں، یہ سب وہ نہیں جانتا، وہ آپ کی نماز نہیں دیکھتا، بلکہ آپ اس کے ساتھ جو سودا کریں گے اور اس میں امانت کے تقاضوں کو جب پورا کریں گے، تو یہی چیز اس پر اثر انداز ہوگی۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان چیزوں کا اہتمام کریں۔

وعدہ پورا کرنے کا ایک اور نمونہ

۶۹:- وعن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ لِي النَّبِيُّ ﷺ: لَوْ قَدْ جَاءَ مَالُ الْبَحْرَيْنِ أُعْطِيتُكَ هَكَذَا وَهَكَذَا وَهَكَذَا. فَلَمْ يَجْعَلْ مَالُ الْبَحْرَيْنِ حَتَّى قُبِضَ النَّبِيُّ ﷺ، فَلَمَّا جَاءَ مَالُ الْبَحْرَيْنِ أَمَرَ أَبُو بَكْرٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ. فَنَادَى: مَنْ كَانَ لَهُ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ عِدَّةٌ أَوْ دَيْنٌ، فَلْيَأْتِنَا، فَأَتَيْتُهُ وَقُلْتُ لَهُ: إِنَّ الدَّيْنَ ﷺ قَالَ لِي كَذَا وَكَذَا. فَجَعَلِي لِي حَشِيَّةً فَعَدَدْتُهَا، فَإِذَا هِيَ خُمْسِيَّةٌ، فَقَالَ لِي: خُذْ مِثْلَهَا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے وعدہ فرمایا کہ اگر بحرین کا مال آگیا تو میں تمہیں اتنا دوں گا، اتنا دوں گا، اتنا دوں گا (لپ بھر کر تین مرتبہ فرمایا کہ اتنا دوں گا۔ نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں سب سے زیادہ خراج بحرین

کے علاقہ سے آتا تھا اسی کے متعلق آپ ﷺ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جب آئے گا تو تم کو میں اتنا دوں گا (اب بحرین کا وہ خراج والا مال آئے اس سے پہلے حضور اکرم ﷺ کی وفات ہو گئی۔ پھر جب بحرین کا مال آیا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے۔ جو نبی کریم ﷺ کے جانشین بنائے گئے تھے۔ اعلان کرایا کہ حضور اکرم ﷺ نے کسی سے وعدہ فرمایا ہو، یا حضور اکرم ﷺ پر کسی کا کوئی مطالبہ باقی ہو تو وہ آئے اور اپنا مطالبہ، یا نبی کریم ﷺ نے ان سے جو وعدہ کیا ہو تو وہ میرے پاس سے وصول کر کے لے جائے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں گیا اور عرض کیا کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے تین لپیں بھر کر یہ فرمایا تھا (کہ اگر بحرین کا مال آیا تو میں تمہیں اتنا اتنا اتنا دوں گا) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک لپ بھر کر مجھے درہم دیئے، میں نے جب وہ گنے تو پانچ سو (۵۰۰) تھے، پھر مجھ سے کہا کہ ایسے ڈبل یعنی ایک ہزار اور لے لو (آپ ﷺ نے تین لپوں کا وعدہ فرمایا تھا تو اس طرح حضور اکرم ﷺ کے وعدہ کے مطابق کل پندرہ سو (۱۵۰۰) درہم دیئے۔)

افادات:- دیکھو! اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک حکمران ہونے کی حیثیت سے وعدہ فرمایا تھا، تو جب آپ ﷺ کے انتقال فرما جانے کے بعد آپ کی جگہ پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقرر کئے گئے تو انہوں نے اس بات کا اہتمام کیا کہ مجھ سے پہلے اس جگہ پر حضور اکرم ﷺ تھے، اور آپ ﷺ نے بحیثیت حکمران کے جو جو وعدے کئے تھے وہ مجھے پورے کرنے ہیں۔

آج کل ہمارے یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ کوئی پیڑھی (گھنٹہ) چل رہی ہے، اس کے ذمہ دار نے کسی کے ساتھ کوئی معاملہ کیا، اب وہ نہیں رہا اور اس کی جگہ پر کوئی دوسرا آیا، جیسے بیٹا آیا، تو وہ کہتا ہے کہ انہوں نے کہا تھا، ہم نہیں جانتے۔ ارے بھائی! یہ کوئی بات ہوئی؟ اس طرح دنیا میں زندگی گزاری جاتی ہے؟ یہ غلط طریقہ ہے، اسلام اس کی

اجازت نہیں دیتا۔ آپ جب اس کے ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے آئے ہیں تو آپ اسی طرح کا معاملہ کیجئے۔ بہر حال! یہ عہد و پیمان بہت اہم چیز ہے۔

یہ عملی عہد و پیمان ہے

اب عہد و پیمان اور وعدہ کے متعلق ایک اہم چیز یاد رکھیے۔ وعدہ اور عہد و پیمان کبھی صرف زبان سے ہوتا ہے، کبھی تحریر سے ہوتا ہے، اور کبھی زبان سے تو نہیں بولا جاتا، لیکن عملی طور پر عہد و پیمان ہوتا ہے، جیسا کہ ہم اس ملک میں اس ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے رہتے ہیں تو گویا ہم نے اس ملک کے ساتھ یہ عہد و پیمان کر رکھا ہے کہ یہاں کے قوانین کی ہم پابندی کریں گے، الا یہ کہ کوئی قانون ایسا ہو جو شریعت کے خلاف ہو، اور جس پر عمل کرنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آئے، تو وہاں پھر قاعدہ یہ ہے: **لَا طَاعَةَ لِمُخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ** ”خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی بات مانی نہیں جائے گی۔ اگر کوئی مسلمان حکمران ہوتا اور وہ کوئی حکم شریعت کے خلاف دیتا تو اس کو بھی ہم بجا نہیں لاتے، گناہ کے کام میں کسی کی بھی فرمانبرداری نہیں کی جاتی، یا ظلم کی کوئی بات ہے تو ظلم کی بات میں تو اپنے بچاؤ کے لئے کچھ کیا جاسکتا ہے، لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے تو پھر ان قوانین کی پابندی ضرور کرنی چاہیے، اُس میں اپنی طرف سے کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، مثلاً ٹرافک (Traffic) کے قانون ہیں، تو ان کا بھی لحاظ کرنا چاہیے، جو لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں، اس لئے اس کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے، تمام قوانین کی رعایت ہونی چاہیے۔ اگر آپ یوں سمجھ کر کریں گے کہ میں اکیلا کروں گا تو اس سے کیا نقصان ہو جائے گا؟ تو آپ کا یہ سوچنا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ

جب آپ نے خلاف ورزی کی تو اس کو دیکھ کر دوسرے نے بھی کی، اس طرح یہی چیز قانون شکنی اور لوگوں کی جان و مال کے غیر محفوظ ہونے کا ذریعہ بنے گی۔ اس لئے ایسے تمام امور میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر ٹرین (Train) میں سفر کر رہے ہیں تو یہ صحیح نہیں ہے کہ بغیر ٹکٹ کے سفر کریں، ہر حال میں ٹکٹ (Ticket) لے کر ہی سفر کرنا چاہیے۔

اسی طرح آپ نے جب الیکٹریٹی والوں کے پاس سے لائن لی ہے تو آپ کے یہاں اس کا میٹر بھی لگا یا گیا ہے، اب اس میں ذرہ برابر بھی کمی نہ کیجئے، بلکہ اس کا بل پورا پورا دیجئے اور اس عہد و پیمان کی حفاظت کیجئے، ورنہ اس حکم کی خلاف ورزی لازم آئے گی۔ اور بھی بہت سی چیزیں اس حکم میں آ جاتی ہیں۔

الامر فی البحافۃ علیٰ

ما اعتادہ من الخیر

نیک کاموں کی عادت کو باقی رکھنا

۲۱/ ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۱۷/ مارچ ۲۰۰۶ء

معمولات کی پابندی کیجئے

علامہ نووی رحمہ اللہ نے یہ باب قائم کیا ہے اس میں بتلانا چاہتے ہیں کہ شریعت نے جن آداب کی ہمیں تعلیم دی ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ کسی آدمی نیکی کے نیکی کے جو کام شروع کئے ہیں اور جن کاموں کا اپنے آپ کو عادی بنایا ہے، جو اچھے معمولات اور نیکی کے مختلف کام اپنارکھے ہیں؛ تو اب اس کو چاہیے کہ ان پر پابندی سے عمل کرتا رہے۔ شریعت یہ چاہتی ہے کہ اس سلسلہ کو باقی رکھو، بلاوجہ اس کو چھوڑ مت دو۔

مطلب یہ ہے کہ فرائض اور واجبات تو وہ ہیں کہ جو شریعت نے آدمی کے اوپر ضروری قرار دیئے ہیں، ان کو تو کرنا ہی کرنا ہے، اگر نہیں کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کا نافرمان اور گنہگار قرار دیا جائے گا۔ ان کے علاوہ ایسے اچھے کام جو اس نے اپنے طور پر اپنارکھے ہیں، مثلاً: ہر مہینہ، یا ہر سال میں ایک مرتبہ، یا عید کے موقع پر یا رمضان میں دوسو، پانچ سو، ہزار روپے کسی کو دینے کا معمول بنایا ہے، تو اب شریعت یہ تعلیم دیتی ہے کہ یہ سلسلہ ختم نہ کرو، بلکہ جاری رکھو۔ کسی بھی نیکی کے کام کو شروع کرنے کے بعد چھوڑ دینا شریعت کو پسند نہیں ہے، شریعت یہ چاہتی ہے کہ وہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ یہ تو گویا ایک پودا ہے جو آپ نے لگایا ہے، اب جب لگا ہی چکے ہیں تو اس کو پانی دیتے رہو، اس کی حفاظت کرتے رہو، تاکہ وہ پلے اور بڑھے، پھل پھول لائے، اور اس سے آپ کو بھی اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو معمول چھوڑنے نہیں دیا

پہلے بھی کئی مرتبہ یہ قصہ گزر چکا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے ایک

عزیز اور رشتہ دار حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ جو ان کی خالہ زاد بہن کے بیٹے تھے اور غریب تھے، مہاجر تھے اور نیک آدمی تھے، اصحاب بدر میں سے تھے ان کی مدد کرتے تھے اور یہ سلسلہ انہوں نے جاری رکھا تھا۔ ایک موقعہ ایسا آیا کہ منافقین کی طرف سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی گئی، تو یہ بھی منافقین کے جھانسنے میں آ گئے، اور آزمائش میں پھنس گئے، ان کی زبان سے بھی وہی چیزیں نکل گئیں۔ بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت نازل ہوئی، معاملہ صاف اور واضح ہو گیا کہ ان پر جو تہمت لگائی گئی تھی وہ غلط تھی۔ تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے۔ بلا وجہ نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں پر لگائی گئی تہمت والے معاملہ میں حصہ لیا تھا۔ یوں سوچا کہ میں ان کی جو مدد کیا کرتا تھا وہ نہیں کروں گا۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی کا کوئی سلوک کرتا رہتا ہے، پھر کبھی موقع آتا ہے کہ اسی رشتہ دار نے کوئی نادانی کر لی، کوئی غلط کام کر لیا، تو اب یہ سوچتا ہے کہ اس نے ایسا کام کر لیا؟ اب اس کو نہیں دیں گے۔ اسی طرح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی قسم کھالی کہ اب ان کو نہیں دوں گا اور وہ سلسلہ بند کر دیا، اس پر باری تعالیٰ نے مستقل آیت نازل فرمائی: ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولَى الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ ایسی قسم کوئی کھاتا ہے کہ میں نیکی کا کام نہیں کروں گا؟ اللہ تعالیٰ نے تعلیم دی کہ ایسی قسمیں نہیں کھانی چاہئیں۔ بھائی! نیکی کے یہی کام تو تمہاری نجات کا ذریعہ ہیں۔ کون سائیکی کا کام اللہ تعالیٰ کو پسند آجائے، اور کل قیامت میں ہماری نجات کا ذریعہ بن جائے، یہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام ہی ہماری نجات اور ہمارے

گناہوں کو بخشوانے کا ذریعہ بن جائے، اسی کو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کرے؟ فوراً حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بات سے رجوع کر لیا۔

بتلانا یہ ہے کہ ہر نیکی کے کام کے لیے یہی طرز ہے، حالاں کہ وہ کام کوئی فرض اور واجب نہیں تھا، لیکن شریعت یہ کہتی ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو جب ایک بھلائی کے اوپر ڈالا ہے، تو سیدھی سادی بات یہ ہے کہ اب اس راستہ سے اپنے آپ کو ہٹانے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں ہے۔

اس سے نقصان پہنچتا ہے

کسی کے ساتھ آپ نے دوستی کی، اس کے پاس آتے جاتے ہیں، اُٹھتے بیٹھتے ہیں، ایک زمانہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا، اور پھر ایک دم سے جانا بند کر دیا، تو صحیح نہیں ہے۔ ارے بھائی! پہلے سے دوستی ہی نہ کرتے تو کوئی بات نہیں تھی، لیکن جب دوستی کی اور تعلقات بڑھائے، پھر اچانک سے کٹ کر دئے، تو یہ کوئی اچھی بات ہے؟ یہ ناپسندیدہ ہے، اور اس سے نقصان پہنچتا ہے۔

معمولات کا ایک ادب یہ بھی ہے

تو نیکی اور بھلائی کے جتنے بھی کام ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے اور رشتہ استوار کرنے کا ذریعہ ہیں، اور ایسے تمام کاموں سے متعلق یہ ایک ادب ہے کہ کوئی بھی معمول ہو، اس کو بلا وجہ نہ چھوڑئیے، مثلاً: روزانہ قرآن پاک کے ایک پارہ کی تلاوت کا آپ نے معمول بنایا، تو اب بلا وجہ اس کو نہ چھوڑیئے۔ یا آپ کسی کلمہ کی تسبیح پڑھتے ہیں، تو اب پڑھتے رہیے، یا کوئی نیکی کا کام کرتے ہیں، تو کرتے رہیے۔ چوں کہ

علامہ نووی رحمہ اللہ آداب سکھلا رہے ہیں تو نیکی کے معمولات کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ آپ اس کی محافظت اور پابندی کیجئے، اگرچہ کوئی فرض اور واجب نہیں ہے لیکن آپ نے بھلائی کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے تو اس کو جاری رکھیے، نیکی اور بھلائی کا کوئی بھی سلسلہ ایسا نہیں ہے کہ اس کو شروع کرنے کے بعد چھوڑ دیا جائے بلکہ اس کو ترقی دینی چاہیے۔

اس آیت کے ساتھ ایک ظلم ہوا

چنانچہ پہلی آیت پیش کی ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ﴾ اس آیت کے ساتھ ایک ظلم یہ ہوا کہ لوگ اس کو علامہ اقبال کے ایک شعر کے ساتھ جوڑ کر۔ جو انہوں نے اپنی جگہ کہا ہے۔ اس آیت کا مطلب بھی وہی بیان کرتے ہیں، حالاں کہ وہ مطلب بیان کرنا بالکل غلط ہے۔ اس آیت کی تفسیر اپنی جگہ پر ہے۔ وہ شعر یہ ہے:-

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی

جسے نہ ہو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

پھر اس کے ساتھ یہ آیت بھی ایٹچڈ (Attached) کر دیتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ اس آیت کا مطلب الگ ہے، آپ قرآن پاک کی کسی بھی تفسیر کو اٹھا کر دیکھ لیجئے اس میں وہ مطلب نہیں ملے گا۔

اس آیت صحیح مطلب

اس آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ کوئی قوم و خاندان، کوئی جماعت و کمیونٹی نے نیکی کا راستہ اپنے لیے چن لیا اور اس راہ پر وہ چل رہی ہے، اور اس نیکی کے راستہ پر چلنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر اپنی نعمتوں کا سلسلہ جاری کر دیا ہے۔ اس لیے

کہ ظاہر ہے کہ کوئی خاندان کسی نیکی کا سلسلہ شروع کر دے، مثلاً: نمازوں کا اہتمام، زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام، غریبوں کی مدد، مسکینوں اور یتیموں کے حال پر توجہ، لوگوں کے ساتھ سخاوت وغیرہ، اور بھی نیکی کے جتنے سلسلے ہیں، ان کو اگر کوئی خاندان اپنالے، ان پر عمل شروع کر دے؛ تو ظاہر ہے کہ اس کی برکتیں بھی تو ظاہر ہوں گی۔ نیکی کے ان کاموں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان کے ساتھ اسی جیسا معاملہ کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی برکتوں کے سلسلے شروع ہوں گے۔

اسی کو اس آیت میں بتلایا گیا ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ﴾ کسی قوم کے نیک راہ پر چلنے کی وجہ سے، بھلائی کے راستہ پر لگنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے انعامات کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کبھی ختم نہیں کریں گے جب تک کہ وہ قوم خود اپنا راستہ نہ بدل دے، اور نیکی کا وہ راستہ نہ چھوڑ دے۔ جیسے نیکی کے کاموں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو تندرستی دے رکھی ہے، عزت و دولت بھی دے رکھی ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنی یہ نعمتیں اس وقت تک نہیں چھینیں گے جب تک کہ نیکی کا اختیار کردہ راستہ وہ خود نہ بدلے گی، لیکن جہاں اس نے اپنا راستہ بدل دیا تو اب وہ نعمتیں بھی باقی نہیں رہتیں۔

نعمتوں کے سلسلے اس وقت تک بند نہیں ہوتے

عام طور پر ہوتا ایسا ہی ہے کہ کسی خاندان اور قوم کے بڑوں نے، اسلاف اور (ancestors) نے کوئی نیک سلسلہ شروع کیا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتیں بھی اس خاندان کو شامل حال ہوتی ہیں، اور وہ خاندان ترقی پر آتا ہے، وہ جماعت و کمیونٹی ایک طرح کی ترقی پر آتی ہے، لیکن اس خاندان و قوم کی اور اس جماعت و کمیونٹی کی بعد

میں آنے والی نسل کو یہ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمتیں ہمارے بڑوں کی کن نیکیوں اور اچھے کاموں کی وجہ سے ملی ہیں، وہ اچھے کام جو ان کے بڑے کرتے تھے اور وہ سلسلہ جو اس خاندان میں جاری تھا، جیسے: نمازوں کا اہتمام، زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام، نیکی کے کاموں کا اہتمام، غریبوں کے ساتھ بھلائی؛ یہ سارے سلسلے جاری تھے، انہیں کی وجہ سے یہ نعمتیں بھی اللہ تعالیٰ نے جاری کر رکھی تھیں۔ تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ہم نے نعمتوں کے یہ سلسلے جو ان کے ساتھ جاری کئے ہیں وہ ہم بند نہیں کریں گے ﴿لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ﴾ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو جو نعمتیں دیتا ہے وہ ان سے ہٹاتا نہیں ہے، واپس لیتا نہیں ہے۔ کب تک؟ ﴿حَتَّىٰ يُغَيِّرُ أَمْرًا بِأَنفُسِهِمْ﴾ یہاں تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہیں بدلتے۔ ان کی نیکی والی حالت بدل گئی، تو پھر نعمتوں والی حالت بھی بدل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے نیکی کی وجہ سے عزت دی تھی، اب دوسری پیڑھی (نسل) آئی اور نیکی و بھلائی کے راستہ پر قائم نہیں رہی، انہوں نے دیکھا کہ دولت کی ریل پیل ہے، تو یہ نہیں سوچا کہ یہ ریل پیل اللہ تعالیٰ نے کیوں دی تھی (وہ تو بڑوں کی نیکی کی وجہ سے دی تھی) اب دولت کی ریل پیل میں آکر وہ گناہوں میں مبتلا ہو گئے، نیکی کا راستہ چھوڑ دیا، بھلائی کے وہ کام جو ان کے بڑوں کی طرف سے کئے جاتے تھے اور ایک سلسلہ جاری تھا وہ سلسلہ باقی نہیں رہا، تو پھر دھیرے دھیرے نعمتیں بھی ان سے چھنتی جائے گی اور ایک دن آئے گا کہ وہ سب ختم ہو جائے گا۔ اس آیت کا صحیح مطلب یہی ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ کسی آدمی نے کسی نیکی کا راستہ اختیار کیا ہو تو اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے، چونکہ نیکی کے راستہ کو اختیار کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی نعمتوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اگر نیکی کا راستہ چھوڑ دو گا تو نعمتوں کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ باقی اس کا وہ جو مطلب لیتے ہیں کہ ”خدا نے آج تک اس قوم کی حالت

نہیں بدلی، وہ بالکل صحیح نہیں ہے، اس آیت کی صحیح تفسیر تو وہی ہے جو ابھی میں نے آپ کے سامنے بیان کی۔

حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سوال

ایک بات لطیفہ کے طور پر سناتا ہوں، ہمارے اکابر میں حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کا قیام ایک طویل مدت تک مدینہ منورہ میں رہا اور حضرت وہاں جانے والے حجاج کے ساتھ بڑی شفقتیں فرمایا کرتے تھے، جنہوں نے ان کی وہ شفقتیں دیکھی ہیں وہ جانتے ہیں۔ میرا جب بھی جانا ہوتا تھا تو حضرت کے پاس جا کر بیٹھا کرتا تھا، حضرت ہماری دعوت بھی کیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا کی عادت یہ تھی کہ کوئی مولوی اور عالم ملاقات کے لیے آتے تو کچھ سوالات بھی فرماتے تھے ان سوالات میں ایک سوال اس آیت کی تفسیر کے متعلق بھی فرماتے تھے ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا أَمَانًا بِأَنفُسِهِمْ﴾ مولوی صاحب! اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ عام طور پر مولوی صاحبان وہی ”خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی“ والی بات چلا دیتے تھے، حالاں کہ اس آیت کی وہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔ وہ ایک الگ بات ہے جو کہی گئی ہے، اور اس آیت کا مطلب تو یہی ہے جو میں نے ابھی بیان کیا۔ آپ کسی بھی تفسیر کی کتاب کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، اس میں یہی وضاحت ملے گی، اور اسی مطلب کی بنیاد پر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کو اس عنوان کے تحت ذکر کیا ہے۔

تم اس پگلی بوڑھیا کی طرح نہ بنو

دوسری آیت پیش کی ہے: ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَقَظَتْ غَزَاهُمْ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا﴾ اے لوگو! تم اس پگلی بوڑھیا کی طرح نہ بنو، جو محنت سے سوت کا تتی، پھر اس کو

ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی۔

مکہ مکرمہ کے اندر ایک مجنوںہ عورت تھی، اس کی عادت یہ تھی کہ دن بھر سوت کاتی تھی، اور دن پورا ہونے پر اپنا کاتا ہوا سوت توڑ پھوڑ کر ختم کر دیتی تھی، پھر دوسرے دن پھر سے سوت کاتی تھی۔ گویا دن بھر جو محنت کرتی وہ ضائع کر دیتی۔ اسی کو باری تعالیٰ نے مثال کے طور پر پیش فرما کر ایک نصیحت کی کہ: تم اپنے اعمال کے معاملہ میں ایسا مت کرنا کہ نیکی کے کام کرو اور پھر کوئی ایسی حرکت کر بیٹھو کہ تمہارے وہ سارے کام ضائع و برباد ہو جائیں۔

معمولات چھوڑنے سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے

﴿وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلَ فَطَالَ عَلَيْهِمْ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے، اس سے پہلے یہ ہے ﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ ایمان والوں کے لیے کیا وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کی یاد کی طرف جھکیں؟ اور اللہ تعالیٰ نے جو احکام اتارے ہیں ان کی اطاعت و ادائیگی کے لیے اور ان پر عمل کرنے کے لیے متوجہ ہوں؟ اور ایمان والوں کو چاہیے کہ ان لوگوں کی طرح نہ بنیں جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی یعنی امت محمدیہ سے پہلے جو اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) آئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو چھوڑ دیا اور ایک زمانہ تک نافرمانیوں میں مبتلا رہے، توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوئی اور نافرمانیوں کا زمانہ ان پر طویل ہو گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل سخت ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اگر طویل زمانہ تک نیکیوں کا سلسلہ چھوڑے رہتا ہے تو اس کی وجہ سے دل میں سختی آ جاتی ہے، پھر اس نیکی کا دوبارہ شروع کرنا بھاری اور مشکل ہو جاتا ہے۔

رہبانیت کیسے شروع ہوئی؟

﴿وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهَ رَأْفَةً وَرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کے متعلق باری تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے دلوں میں ہم نے شفقت اور رحمت کا مادہ بھر دیا، اور رہبانیت (یعنی دنیا کو چھوڑ چھاڑ کر اللہ کی عبادت میں مشغولی) والا طریقہ ان لوگوں نے اختیار کیا (باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) وہ طریقہ ہم نے ان پر لازم نہیں کیا تھا۔ ”رہبان“ کا اصلی ترجمہ تو ”اللہ کا ڈر اور خوف“ ہے۔

بنی اسرائیل کے اندر ہوا یہ تھا کہ جب ایسے بادشاہ آئے جو دنیا کے اندر ایسے منہمک ہوئے جس کے نتیجے میں انہوں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکامات کو توڑنا شروع کیا، تو دین دار طبقہ جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنے والا تھا انہوں نے ان کو ان غلط حرکتوں سے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن چون کہ ان کے پاس حکومت کی طاقت تھی، حکومت و پیسے کی طاقت ہی کی وجہ سے وہ نافرمانی میں مبتلا ہوئے تھے، تو انہوں نے ان روکنے والوں کو قتل کر دیا۔ پھر دوسرا طبقہ آیا، انہوں نے دیکھا کہ اگر ہم ان کو روکنے جائیں گے تو یہ ہمیں بھی قتل کر دیں گے۔ گویا انہوں نے اپنے اندر ان کو روکنے کی طاقت نہیں پائی اور ان کو یہ بھی ڈر لگا کہ اگر ہم ان کے ساتھ رہیں گے تو ہم بھی ایسے ہی بن جائیں گے، تو اپنے دین کی حفاظت کی نیت سے انہوں نے لوگوں سے علاحدگی اختیار کر لی اور جنگلوں میں اور ایسے علاقوں میں چلے گئے جہاں زیادہ لوگ نہ بستے ہوں تاکہ وہاں رہ کر اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنا ان کے لیے آسان ہو جائے اور سنسان علاقوں میں بند مکان بسا کر عبادتوں میں مشغول ہو گئے اور لوگوں سے میل جول بالکل ختم کر لیا۔ یہی رہبانیت والا

طریقہ کہلایا۔ اللہ تعالیٰ کے ڈر سے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس طرح آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے احکام پر باقی اور قائم رکھ سکے۔

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے

ویسے شریعت محمدیہ میں رہبانیت نہیں ہے، بلکہ اصل تو یہ ہے کہ آدمی لوگوں میں مل جل کر رہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرے، لیکن اگر کسی آدمی کے لیے اپنے دین کو بچانا سوائے اس کے ممکن ہی نہ ہو کہ لوگوں سے علاحدگی اختیار کر لے، تو جیسا کہ حدیث کی کتابوں میں ہے اور بخاری شریف میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس پر مستقل باب قائم کیا ہے: ”إِنَّ مِنَ الدِّينِ الْفِرَارُ مِنَ الْفِتَنِ“ فتنوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے لوگوں سے دوری اختیار کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ فتنے ایسے عام ہو جائیں گے کہ لوگوں کے درمیان میں رہتے ہوئے آدمی کے لیے اپنے دین کی حفاظت مشکل ہو جائے گی، اس وقت بعض لوگ ایسے ہوں گے جو بکریاں وغیرہ مویشی لے کر پہاڑ کی ایسی چوٹیوں پر چلے جائیں گے کہ جہاں گھاس پانی ملتا ہوگا، وہاں بکریاں چراتے رہیں گے اور اپنے دین کی حفاظت کریں گے۔

دینداروں کے لیے بھی یہی وقت آزمائش کا ہوتا ہے

بہر حال! ان لوگوں نے بھی رہبانیت والا طریقہ اختیار کر لیا۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کو ایسا طریقہ اختیار کرنے کے لیے کہا نہیں تھا، بلکہ انہوں نے اپنے طور پر اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے اور دین پر قائم رہنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔ جب اس نیت سے یہ طریقہ اختیار کیا تھا تو پھر چاہیے تھا کہ اس کا اہتمام کرتے رہتے اور اس کو نہ چھوڑتے، لیکن جب ان کی توجہ الٰہی اللہ، دینداری، تقویٰ و

پرہیزگاری، ان کی نیکوکاری کو دیکھ کر لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ آدمی جب تقویٰ اختیار کرتا ہے تو پھر لوگوں کا رجحان و میلان بھی ادھر ہوتا ہے۔ تو پھر یہ لوگ اپنے دین پر اور جس احتیاط پر ان کو قائم رہنا چاہیے تھا اس پر قائم نہیں رہے اور دنیا کی طلب میں پڑ گئے۔ تو رہبانیت والا طریقہ اصل میں تو اپنے آپ کو بے دینی اور دنیا طلبی سے بچانے کے لیے شروع کیا تھا، لیکن اسی کے نتیجہ میں جب لوگوں کا اُدھر رجوع ہوا تو دنیا طلبی میں پڑ گئے۔

آج بھی جب آدمی دین کی محنت کرتا ہے اور دین کے لیے قربانیاں دیتا ہے، تو لوگ اس کی نیکی اور تقویٰ کی وجہ سے عقیدت مندی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور یہی اس کے لیے زیادہ آزمائش کا وقت ہوتا ہے، اگر لالچ میں آ کر شریعت والے طریقہ کو چھوڑ کر دنیا طلبی میں پڑ جائے گا تو پھر ناس مار لے گا اور اپنا نقصان ہی نقصان کر لے گا۔ اسی کو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَمَن رَّعَاهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ جو طریقہ اختیار کیا تھا اس کی پوری حفاظت اور رعایت نہیں کر سکے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تو واجب نہیں کیا تھا لیکن جب انہوں نے اس طریقہ کو اپنے دین کی حفاظت کے لیے شروع کیا تھا تو پھر چاہیے تھا کہ اس کی پابندی کرتے، لیکن انہوں نے پابندی نہیں کی۔ اس آیت میں ان کی جو مذمت اور برائی کی گئی ہے، وہ ان کے اس طریقہ کو اختیار کرنے پر نہیں کی گئی ہے، بلکہ اس راہ کو اختیار کرنے کے بعد چھوڑ دینے پر کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر عمل جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب نہیں کیا گیا، لیکن کوئی آدمی اپنے طور پر نیکی اور بھلائی کا کام سمجھ کر اس کو شروع کر رہا ہے تو پھر اس کو چاہیے کہ اس کو نہ چھوڑے، بلکہ اس کی پوری پابندی کرے؛ یہی شریعت کی نگاہوں میں مطلوب ہے۔ اس آیت کو یہاں لا کر یہی بتلایا چاہتے ہیں۔

اے عبد اللہ! فلاں جیسے مت بنیو

۶۹۲:- وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله عنهما قَالَ قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: يَا عَبْدَ اللَّهِ، لَا تَكُنْ مِثْلَ فُلَانٍ، كَانَ يَقُومُ اللَّيْلَ فَتَرَكَ قِيَامَ اللَّيْلِ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے (کسی کی طرف اشارہ فرما کر) مجھ سے فرمایا: اے عبد اللہ! فلاں جیسے مت بنیو کہ وہ راتوں کو اٹھا کرتا تھا (تہجد پڑھتا تھا) پھر اس نے رات کو اٹھنا چھوڑ دیا۔

افادات:- دیکھئے! تہجد پڑھنا فرض اور واجب نہیں ہے، لیکن جب کسی نے یہ عمل شروع کیا تو شریعت یہ چاہتی ہے کہ اس کو چھوڑا نہ جائے، اب تو ہر حال میں اس کو باقی رکھنا ہی چاہیے۔

آج کل ہمارے طبقہ میں یہ مزاج عام ہو گیا ہے کہ جوش میں آ کر ایک دو مہینہ تک کچھ معمولات: تہجد، ادا بین یا چاشت شروع کرتے ہیں، اور یہ صرف عبادتوں کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے، بلکہ نیکی کا کوئی بھی کام ہو، جیسے: کسی کے ساتھ بھلائی کرنے کا سلسلہ شروع کیا؛ پھر اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔ گویا ہماری طبیعتوں میں تلون مزاجی ہے یعنی ہماری طبیعت ایک طرح کی نہیں ہے بلکہ رنگ بدلتی رہتی ہے۔ اگر نیک بن گئے تو جنید بغدادی کو بھی شکست دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ پھر برائی پر آتے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو بھی ہر ادیس گے۔ بھائی! ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ کوئی بھی طریقہ ہو، اس میں اعتدال و میانہ روی سے چلئے۔ شریعت یہ چاہتی ہے کہ آپ اعتدال کو اختیار کریں، جیسا کہ پہلے بھی آچکا کہ نیکی کے جس کام پر مداومت کی جائے وہی اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے، چاہے وہ چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو۔

پانی کا صرف ایک قطرہ اگر ایک زمانہ تک برابر ٹپکتا رہتا ہے تو پتھر کے اندر بھی سوراخ کر دیتا ہے، لیکن اگر پانی کا ایک ٹینک بھی ایک ساتھ بہاؤ لو، تو اس سے کچھ فرق پڑنے والا نہیں ہے۔

مداومت کا نتیجہ

انگلینڈ میں ہمارے ایک ملنے والے دوست ہیں، انہوں نے ایک مولوی صاحب کا مقولہ میرے سامنے نقل کیا۔ پاکستان کے ایک مولانا صاحب آئے ہوئے تھے، انہوں نے ایک پتھر لی زمین میں جہاں صرف پتھر ہی ہوتے ہیں، اس میں کسی جگہ کچھ سبزہ نکلا ہوا دیکھ کر مجھ سے بہت اچھی بات کہی کہ: دیکھو! پتھر بھی جب ایک جگہ پڑا رہا اور اس نے جگہ نہیں بدلی اور اس کے آس پاس تھوڑی سی مٹی تھی تو اس پر بھی سبزہ نکل آیا۔ لیکن اگر کسی جگہ مٹی ہی مٹی ہو اور اس کی بار بار کھدائی کرتے رہو، الٹ پلٹ کرتے رہو، تو کبھی اس میں گھاس کا ایک تنکا بھی اُگنے والا نہیں ہے۔ حالاں کہ پتھر کی خاصیت یہ ہے اس میں کچھ بھی نہیں اُگتا، لیکن وہ بھی جب ایک جگہ پڑا رہا تو اس میں نمو اور اُگانے کی کچھ صلاحیت آگئی، اور مٹی میں نمو کی خاصیت ہے لیکن اس میں جب الٹ پلٹ ہوتی رہی تو اس میں کچھ بھی نہیں اُگتا۔ معلوم ہوا کہ درحقیقت کسی بھی عمل کو اثر انداز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر مداومت ہو۔

ساری خرابی یہیں سے آتی ہے

ہمارا مزاج تو ایسا ہے کہ ہم دو روز تہجد پڑھتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ تیسرے دن جبرئیل آنے ہی چاہئیں، تب کچھ بات بنے گی۔ نہیں بھائی! ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ کرتے رہو، کرتے رہو، اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس نیکی کے کام کی توفیق دی

ہے، یہی بہت بڑی بات ہے، اب آپ اور کیا چاہتے ہیں؟ دوسرا کوئی بدلہ چاہو ہی مت۔ دراصل ساری خرابی یہیں سے آتی ہے کہ ہم دوسرے بدلے چاہنے لگتے ہیں۔ ارے بھائی! یوں سوچو کہ ہم اپنی زبان سے ”اللہ“ کا جو نام لے رہے ہیں؛ یہی اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کا مقابلہ اور کوئی چیز نہیں کر سکتی، اگر اس پر جنت نہ بھی ملے تب بھی ”اللہ“ کا نام لینا خود جنت سے بڑی نعمت ہے؟ پھر اس پر ہی کیوں خوش نہ ہوؤں؟ دوسرا کوئی بدلہ کیوں چاہوں؟

ہم لوگ ذکر اسی لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ ہم اپنے جی میں ایسا سوچتے ہیں کہ جب ہم نے ذکر شروع کیا تو پھر ہمارے کاروبار میں برکت کیوں نہیں ہوتی؟ ہماری آمدنی (income) بڑھ کیوں نہیں گئی؟ ابھی تک تین ہزار کا نفع ہوتا تھا، اب چار ہزار کا نفع کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ میں کئی سال سے چلہ دے رہا ہوں، برابر نماز پڑھ رہا ہوں، اب تو تہجد، اشراق و چاشت بھی شروع کر دی ہے، پابندی سے درس میں حاضری دیتا ہوں، اتنا سب کر رہا ہوں، لیکن کوئی ”Response“ نہیں مل رہا ہے۔ گویا یہ سب کر کے کیا ہم اللہ تعالیٰ پر احسان کر رہے ہیں؟ ارے بھائی! اللہ تعالیٰ نے اس سب کی توفیق دی اور ہم نے اپنی زبان سے اس کا نام لیا؛ یہی بہت بڑی اور اصل نعمت ہے، اب اس کے بدلہ میں اور کیا مانگتے ہو!

ذکر میں دل نہیں لگتا، پریشان کیوں ہوتے ہو؟

سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا: حضرت! میں ذکر کرتا ہوں لیکن اس میں جی نہیں لگتا؟ حضرت نے فرمایا: بھائی! اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے ایک عضو یعنی زبان کو اپنی یاد میں لگا دیا ہے۔ درحقیقت یہ

بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس لیے کہ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ یہی زبان اللہ کا نام لینے کے بجائے گالیاں بکتی، یا اور کوئی گناہ کا کام کرتی، اللہ تعالیٰ نے اس کو گناہ سے بچا کر اپنی یاد میں لگایا؛ یہی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اب اس پر اس کا شکر ادا کرو، تو قاعدہ ہے ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں نعمتوں میں اضافہ کروں گا، اس لیے اگر اس پر شکر کرو گے تو پھر آگے چل کر دل بھی لگے گا۔ پریشان کیوں ہوتے ہو کہ دل نہیں لگتا، زبان سے ذکر کرنے پر بھی ثواب تو ملتا ہے۔

خلاصہ باب

اگر آپ نماز پابندی سے پڑھتے ہیں، تو بس! پڑھتے رہیے، یہ نہ سوچیے کہ میں پابندی سے نماز پڑھتا ہوں، پھر بھی مجھے بخار کیوں آیا؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی یہ اس کی بہت بڑی نعمت ہے۔ کسی کو کروڑ ہا کروڑ روپے مل جائیں اور وہ نماز سے محروم ہے، اس کے مقابلہ میں آپ جو پنج وقتہ نماز پڑھتے ہیں؛ یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کے کروڑ ہا کروڑ روپے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر آپ کا ایمان یہ ہے تو پھر آپ دوسرے کسی چکر میں کیوں پڑتے ہیں؟ اس لیے اس کا اہتمام کرتے رہیں۔

یہ ساری باتیں ہیں، ان کو ذہن میں بٹھا لیجئے، اور دوسرے کسی چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

استحباب طیب الکلام
 وطلاقة الوجه عند اللقاء
 خوش کلامی اور ملاقات کے وقت چہرے کو
 مسکراتا ہوا رکھنے کا پسندیدہ ہونا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قال الله تعالى: ﴿وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمُؤْمِنِينَ﴾ (الحجر: ۸۸)

وقال تعالى: ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَضًّا مَّعْلُوظًا لَقَلْبُكَ لَافْتَضَ وَ اَمِنْ حَوْلِكَ﴾ (آل عمران: ۱۵۰)

ہر کس و ناکس کو مسخر کرنے والا نسخ

آداب کا بیان چل رہا ہے، اسی سلسلہ میں ایک عنوان قائم کیا ہے: خوش کلامی اور ملاقات کے وقت چہرے کو مسکراتا ہوا رکھنے کے پسندیدہ ہونے کا بیان۔

یہ بھی ایک ادب ہے کہ آدمی جب کسی کے ساتھ ملاقات کرے، اس وقت اپنا چہرہ ہنستا ہوا رکھے، اور جب بات کرے تو اچھے طریقہ سے بات کرے۔ بھائی! اس میں توجیب میں سے کچھ پیسے بھی خرچ نہیں ہوتے ہیں۔ یہ ایسا عجیب و غریب نسخہ اور عمل ہے جو ہر کس و ناکس، دشمنوں اور دوستوں، اپنوں اور پرایوں کو مسخر کرنے والا ہے جو لوگ اس قسم کا مزاج رکھتے ہیں ان سے لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اور آج کل تو تجارت میں یہ بہت ہی بنیادی اصول سمجھا جاتا ہے کہ لوگوں کا بڑی خوش دلی کے ساتھ چہرہ ہنستا رکھتے ہوئے استقبال کیا جائے، بلکہ اب تو یہ ایک مستقل فن ہو چکا ہے جس کی تربیت دی جاتی ہے، لوگ اس طرز کو سیکھ کر سلیس مین شپ (Sales Man Ship) کرتے ہیں اور اسی پرسروس اور ملازمتیں ملتی ہیں۔ حالاں کہ شریعت نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ جب بھی آپ کسی سے ملیں تو ملاقات کے وقت دو چیزوں کا خیال رکھئے، ایک یہ کہ بات چیت اچھے انداز سے کیجئے، جس کو خوش کلامی کہا جاتا ہے، اور دوسرا یہ کہ چہرہ ہنستا ہوا رکھئے۔ اور کمال تو یہ ہے کہ اس کو نیکی کا کام قرار دیا، گویا آپ اس عمل کو کریں گے تو اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوگا اور نبی کریم ﷺ کی سنت بھی ادا ہوگی۔

یہ آپ ﷺ کا طریقہ ہے

حضورِ اکرم ﷺ کا طریقہ تو یہ تھا کہ ایسے لوگ جو واقعہ اپنے غلط رویے اور اپنی بد عملی کی وجہ سے لوگوں کے ساتھ اچھی طرح سے پیش نہیں آتے تھے، اور ان کا معاملہ ٹھیک نہیں ہوتا تھا، جس کی وجہ سے وہ اس قابل نہیں ہوتے تھے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، اس کے باوجود بھی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں جب ایسے لوگ حاضر ہوتے تو آپ ﷺ ان سے بھی نرم گفتگو فرماتے اور ہنس کربات فرماتے۔ آپ ﷺ کا طریقہ یہی تھا۔

مدارات؛ جس کو دل جوئی کرنا کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے ساتھ خوش خلقی سے اور ظاہری طور پر اچھے انداز سے پیش آنا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بخاری شریف میں ایک عنوان قائم کیا ہے: ”بَابُ الْمُدَارَاةِ مَعَ النَّاسِ“ اس میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ نقل کیا ہے کہ: بہت سے لوگوں کے سامنے ہم مسکراتے ہیں، حالاں کہ ہمارے دل ان پر لعنت کر رہے ہوتے ہیں (۱) یعنی ان کے اعمال کی وجہ سے دل ان سے خوش نہیں ہوتے، لیکن اس کے باوجود جب ہم ان سے ملتے ہیں تو ہم ان کے ساتھ ہنستے ہوئے چہرہ سے ملاقات کرتے ہیں۔

اسلام نے جو آداب سکھائے ہیں ان میں سے یہ بھی ہے: ”ادْخَالَ السُّرُورِ“ کسی کے دل میں مسرت داخل کرنا۔ کوئی بھی ہو، جب آپ اس سے ہنس کر ملاقات کریں گے، اور نرم طریقہ سے اچھی بات کریں گے، تو اس کا دل خوش ہوگا، یہ بھی بہت بڑی نیکی کا کام ہے۔ یہ ایک ایسا ادب اور شریعت کی ایسی تعلیم ہے کہ آج ہم اس کی طرف سے بہت

(۱) عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ: إِنَّا لَنَكْشِرُ فِي وُجُوهِ أَقْوَامٍ وَإِنْ قُلُوبُنَا لَتَلْعُنُهُمْ.

غفلت اور بے پرواہی سے کام لیتے ہیں۔

آدمی کے لئے بڑی بری چیز ہے

ایک مرتبہ ایک صاحب نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے آپ کے گھر کے باہر سے اجازت مانگی کہ میں اندر آ سکتا ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے جب ان کی آواز سنی تو ان کو پہچان لیا اور فرمایا: ”يٰۤاَبْنُ الْعَشِيْرَةِ“ یہ آدمی اپنے قبیلہ کا بڑا برا آدمی ہے، اس کے بعد ان کو آنے کی اجازت دی۔ جب وہ آ کر بیٹھے تو حضور اکرم ﷺ نے ان کے ساتھ بہت ہی نرمی سے گفتگو کی۔ جب وہ صاحب چلے گئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے ان کے متعلق تو یہ فرمایا تھا، لیکن جب وہ آپ کے پاس آئے تو آپ نے ان کے ساتھ بڑے نرم انداز میں گفتگو فرمائی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! آدمی کے لئے یہ بات بڑی بری ہے کہ اس کی بدخلقی کی وجہ سے لوگ اسے چھوڑ دیں (بخاری شریف: باب الْمَكَارِ اَفْضَحُ النَّاسِ) مطلب یہ ہے کہ میں نے اس کے متعلق جو کہا تھا کہ یہ اپنے قبیلہ کا بڑا برا آدمی ہے، وہ ان حالات کی وجہ سے کہا تھا جو اس میں تھے، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں بھی اس کے ساتھ برائی سے ہی پیش آؤں؟ مجھے تو اپنے اخلاق کو باقی رکھنا ہیں۔

میں اپنے اخلاق کیوں خراب کروں!

قاضی یحییٰ بن اکثم رحمہ اللہ بڑے قاضی گزرے ہیں، ایک مرتبہ ان کو ہارون الرشید کے یہاں رات گزارنے کا موقع ملا۔ ہارون الرشید اپنے وقت کا بہت بڑا بادشاہ تھا۔ پہلے بھی کسی موقع پر میں بتلا چکا ہوں کہ ان کی سلطنت اور حکومت اتنی بڑی تھی کہ ایک مرتبہ ایک بادل جا رہا تھا جس کو خطاب کرتے ہوئے ہارون الرشید نے کہا تھا: اے

بادل! تو کہیں بھی جا کر برس، تیرے پانی سے جو غلہ پیدا ہوگا، اس کا خراج میرے ہی خزانہ میں آنے والا ہے۔ خیر! قاضی یحییٰ بن اکثم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ رات میں بادشاہ سلامت کو پانی کی ضرورت پیش آئی تو کسی خادم کو آواز دی کہ ذرا پانی پلاؤ۔ تو وہ نیند میں سے اُٹھا اور کہنے لگا: دن میں بھی چین نہیں، رات میں بھی چین نہیں لینے دیتے، اور اس طرح بڑبڑاتے ہوئے پانی لا کر دیا، اپنے وقت کے اتنے بڑے بادشاہ کو اس طرح کہہ رہا تھا، وہ تو اس کی گردن کٹوا سکتا تھا، لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ قاضی یحییٰ بن اکثم رحمہ اللہ نے ان سے کہا: امیر المؤمنین! ایک زر خرید غلام (یعنی کوئی نوکر نہیں تھا بلکہ غلام تھا جس کو آقا اپنی ملکیت میں رکھتا ہے) نے آپ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا اور آپ نے اس کو کچھ بھی تنبیہ نہیں کی؟ اس پر کوئی اکیشن بھی نہیں لیا؟ تو ہارون الرشید نے کہا: بھائی! وہ بد خلقی سے پیش آیا تو اس کی وجہ سے میں اپنے اخلاق کیوں خراب کروں؟ جیسے: کتے کی عادت کاٹنے کی ہے، تو اگر وہ آپ کو کاٹ لے، تو کیا آپ بھی اس کو کاٹ لیں گے؟ نہیں نا! سیدھی سی بات ہے۔ اس لئے حقیقت تو یہ ہے کہ کسی کی بد خلقی کی وجہ سے ہمیں اپنے اخلاق خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شریعت ہمیں یہی تعلیم دیتی ہے، اور سمجھ لیجئے کہ شریعت کی تعلیم کا خلاصہ یہی ہے۔

اندازہ لگائیے کہ کتنا اچھا ادب سکھایا ہے! آج اسی تعلیم کو اگر ہم اپن لیں تو ہمارے سماج و معاشرہ کے بہت سارے مسئلے حل ہو سکتے ہیں، لیکن ہمارا حال تو یہ ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر دوسروں سے بدگمان ہو جاتے ہیں اور اسی بدگمانی کی بنیاد پر بد خلقی کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، تعلقات میں کشیدگیاں آتی ہیں اور پھر بہت سارے لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر شریعت کی اس تعلیم پر ہم عمل کر لیں تو معاملہ بہت ہی آسان ہو جائے۔

یہ ہمارا مزاج ہے

پھر اپنے گھر کے لوگوں کے ساتھ تو اور زیادہ اس کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ آج کل معاملہ الٹ گیا ہے، آدمی پرائیوں کے ساتھ تو بہت ہنس بول کر باتیں کرتا ہے، لیکن جب گھر میں جاتا ہے تو اس کا موڈ ہی چینج (Change) ہو جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ آدمی ہے، ہی نہیں۔ چہرہ بھی بڑا بھیا نک بنا کر جاتا ہے، گھر والے بھی اس کو دیکھ کر سہم جاتے ہیں کہ پتہ نہیں آج کیا بلا اور اُفتاد ہم پر آنے والی ہے، وہ بھی ”یَا رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ“ کا وظیفہ پڑھتے ہیں۔ ہمارا مزاج ایسا ہے، حالاں کہ آدمی کے اخلاق تو گھر والوں کے ساتھ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی پرایا آدمی آگیا اور اس کے ساتھ آپ نے ہنس بول کر باتیں کر لیں؛ تو یہ اخلاق نہیں ہیں۔ اخلاق تو یہ ہیں کہ ۲۴ گھنٹے جن کو آپ سے واسطہ پڑتا ہے، وہ آپ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ آپ کے متعلق ان کا (Opinion) کیا ہے؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک عورت کے متعلق آپ ﷺ سے عرض کیا کہ: وہ نماز بھی خوب پڑھتی ہے، روزے بھی خوب رکھتی ہے، اور بڑی عبادت گزار ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: اس کا معاملہ پڑوسیوں کے ساتھ کیسا ہے؟ عرض کیا: ٹھیک نہیں ہے؛ تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ جہنمی ہے۔ دوسری عورت کے متعلق عرض کیا: وہ فرض نماز تو پڑھ لیتی ہے، لیکن نوافل کا اہتمام نہیں کرتی۔ پوچھا: پڑوسیوں کے ساتھ معاملہ کیسا ہے؟ کہا: بہت اچھا ہے؛ تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ جنتی ہے۔ (مسند احمد - حدیث نمبر: ۹۶۷۳)

وہ اخلاق کس کام کے!

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ آدمی کے

اخلاق کا ساری دنیا میں خوب چرچہ ہو، اور اس کے گھر والے ہی اس سے خوش نہ ہوں؛ تو وہ اخلاق کس کام کے! جیسے: آپ کی سخاوت سے پوری دنیا فیض اٹھا رہی ہو، اور گھر والے ہی بھوکے مرتے ہوں؛ تو ایسے آدمی کو کوئی تخی کہے گا؟ آپ کے اخلاق کی ساری دنیا تعریف کرتی ہو، اور گھر والوں کو شکایت ہو کہ وہ تو گھر میں آ کر کبھی ہمارے ساتھ ہنس کر بات ہی نہیں کرتے۔ عام طور پر بیویوں کو شوہروں سے یہی شکایت رہتی ہے کہ ابھی باہر تو خوب ہنس بول رہے تھے، اور گھر میں جب آئے تو ان کا چہرہ ہی بدل گیا، گھر میں آ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالکل ہی بدل گئے۔ یہ مناسب طریقہ نہیں ہے۔ اگر کسی چیز پر تنبیہ کی تھی وہ اپنی جگہ پر ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب ۲۴ گھنٹے آپ منہ بسورے ہوئے، لیجیو دیکھو، اپنے آپ کو لئے دے رہتے ہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ آدمی ہنس بول کر رہے۔ حدیث پاک میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ آدمی گھر والوں کے ساتھ کس طرح رہے، ان کے ساتھ بالکل بے تکلف رہے، ان کے اوپر بوجھ بن کر نہ رہے کہ آپ جب گھر میں جائیں تو وہ یہی دعا کرتے رہیں کہ یہ مصیبت یہاں سے کب ٹلے، بلکہ گھر کے اندر ایسے بن کر رہیے کہ وہ یہ چاہیں کہ یہ گھر میں سے نہ جائیں؛ تب کوئی بات ہے۔

بہر حال! بوقت ملاقات لوگوں سے ہنستے ہوئے ملنا اور اچھے طریقہ سے بات کرنا مستحب ہے، یہ شریعت کی نگاہوں میں پسندیدہ اور کارثواب ہے، اور یہ نیکی ہم مفت میں حاصل کر سکتے ہیں، اس کے لئے پیسے خرچ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، اور بہت ہی آسان بھی ہے۔

اپنے بازوؤں کو جھکائے رکھنا

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: ﴿وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ الْمُنِىٰنِ﴾ نبی کریم ﷺ

کو تاکید کی گئی: ﴿لَا تَمْنُوا لَكُمْ عَيْنُكُمْ إِلَىٰ مَأْمُوتِ عَنَابِهِ أَزْوَاجَهُمْ وَلَا تَحْزَنُوا عَلَيْهِمْ﴾ دنیا کے مختلف گروہوں (کفار اور مشرکین، یہود و نصاریٰ) کو دنیا کی نعمتیں ہم نے برتنے کے لئے دی ہیں، ان کے پاس دولت کتنے دنوں تک رہے گی؟ جب تک دنیا میں ہیں وہاں تک ہے، پھر ان کے ہاتھ سے چھین لی جائے گی، اور پھر ان کے ساتھ جو معاملہ ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا، اس لیے ان کی طرف آپ اپنی آنکھیں بھی نہ اٹھائیے۔ اور اپنے لوگوں کے ساتھ کیا کرنا ہے؟ ﴿وَاحْفَظْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾ ایمان والوں کے سامنے اپنے بازوؤں کو جھکائے رکھیے۔

دیکھو! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق قرآن پاک میں کہا گیا ہے: ﴿أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ آپس میں رحمدل اور کفار کے معاملہ میں سخت تھے۔ آدمی کے دل میں ایمان جتنا زیادہ سرایت کرتا جاتا ہے، اتنا ہی یہ وصف آدمی کے اندر پیدا ہوتا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اپنوں کے ساتھ شفقت کا معاملہ ہونا چاہیے۔

اگر آپ بدخلق اور سخت دل ہوتے

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَضًّا مَغْلِظًا الْقُلُوبَ لَانْفَضَّتْ وَآمِنٌ حَوْلِكَ﴾ دیکھو! باری تعالیٰ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کر کے یہ فرما رہے ہیں کہ اگر آپ بدخلق اور سخت دل ہوتے، تو یہ لوگ (یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) آپ کے پاس سے بکھر جاتے۔ حالاں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو محبت تھی وہ سب جانتے ہیں، اس کے باوجود باری تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہیں کہ: اے ہمارے رسول! اگر آپ ایسے ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے کب سے بکھر جاتے، کوئی آپ کے پاس نہ ٹھہرتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اچھے اخلاق اور اچھا سلوک، لوگوں سے ہنس کر ملنا، اچھی طرح سے باتیں کرنا اور اچھے طریقہ سے پیش آنا؛ یہ لوگوں کو آدمی سے قریب کرتا ہے، اگر یہ طریقہ اپنایا جائے گا تو غیر بھی آپ سے قریب ہو جائیں گے، اور اگر اس کے برخلاف معاملہ کیا جائے گا تو اپنے بھی دور ہو جائیں گے۔ اس لئے شریعت نے ہمیں اس ادب کی تعلیم دی ہے۔

کم از کم اسی کی عادت ڈال لی جائے

۶۹۳:- عن عدی بن ابی حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ:

اتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ، فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فِي كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عدی بن ابی حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے

ارشاد فرمایا: اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ؛ چاہے کھجور کے آدھے حصہ کے ذریعہ سے ہی ہو۔ اگر کسی کے پاس صدقہ کرنے کے لئے آدھی کھجور بھی نہیں ہے؛ تو اچھی بات کسی کو کہہ کر ہی سہی۔

افادات:- یعنی اگر آپ کے پاس کھجور کا آدھا دانہ ہے اور اس کا آپ

نے صدقہ کر دیا تو اس سے اللہ تعالیٰ کی جو خوشنودی حاصل کی جائے گی، وہ بھی آپ کو جہنم کے عذاب سے بچانے کا ذریعہ بنے گی۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کے ساتھ اچھی طریقہ سے بات کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی ایسی خوشنودی اور رضا مندی عطا کرتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں آدمی جہنم سے بچ جاتا ہے۔ کتنا آسان نسخہ ہے! دوسرے اعمال کے مقابلہ میں یہ بہت آسان عمل ہے، اگر کوئی آدمی کم از کم اسی کی عادت ڈال لے، تو دن بھر میں جتنے آدمیوں سے ہنس کر ملے گا اور اچھی طرح بات کرے گا، اتنی ہی نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں بڑھتی جائیں گی۔

اس پر بھی صدقہ کا ثواب

۶۹۴:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه أن النبي ﷺ قَالَ: وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: اچھی بات بھی صدقہ ہے۔

افادات:- یعنی صدقہ کرنے سے جس طرح ثواب ملتا ہے، اسی طرح اگر آپ لوگوں سے اچھی طرح بات کریں گے، اس پر بھی اتنا ہی ثواب ملے گا۔ بھائی! صدقہ میں آپ نے پیسے خرچ کر کے ظاہری بھلائی کا معاملہ کیا، اور اس میں آپ نے اپنے اخلاق کے ذریعہ معنوی طور پر بھلائی کا معاملہ کیا، تو جو ثواب اس میں ملتا ہے، وہی ثواب اس میں بھی ملے گا۔ اس لئے اگر کسی کے پاس روپیہ پیسے نہیں ہیں کہ وہ خرچ کر کے صدقہ کا ثواب حاصل کر سکتا ہو، تو بھلی باتیں کہہ کر اور لوگوں سے اچھے طریقے سے پیش آ کر بھی صدقہ کا ثواب حاصل کر سکتا ہے۔

ہنستے چہرے سے ملاقات بھی نیکی ہے

۶۹۵:- وعن أبي ذرٍّ رضي الله عنه قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ شَيْئًا، وَلَوْ أَنْ تَلْقَى أَخَاكَ بِوَجْهِ طَلْقٍ.

ترجمہ:- حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی بھی نیکی کے کام کو معمولی مت سمجھو، چاہے تم اپنے بھائی سے ہنستا ہوا چہرہ رکھ کر ملاقات کرو۔

افادات:- اس روایت میں ایک تعلیم تو یہ ہے کہ نیکی کا کام چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں ہو، اس کو معمولی نہ سمجھو۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی گنہگار ہے، برائیوں میں پھنسا ہوا ہے، نیکی کے کام نہیں کرتا، پھر کبھی اس کو چھوٹی سی نیکی کا کام کرنے کا موقع

مل گیا، تو شیطان اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ تیری تو ساری زندگی گناہوں میں گزر رہی ہے، تو نماز تو پڑھتا نہیں، روزے تو رکھتا نہیں، دوسرے فرائض بھی ادا نہیں کرتا؛ اب یہ چھوٹی سی نیکی کرنے سے تجھے کیا فائدہ ملے گا؟ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسا مت سوچو، کسی بھی نیکی کے کام کو حقیر نہ سمجھو۔ اس لئے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی چھوٹا سائیکے کا کام خلوص دل سے کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسا مقبول ہو جاتا ہے اور اس کام سے اللہ تعالیٰ ایسا خوش ہو جاتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں پھر نیکی کے بڑے بڑے کام کرنے کی بھی توفیق دی جاتی ہے۔ وہاں تو شاہی معاملہ ہے، کبھی چھوٹی سی بات پر خوش ہو جائیں تو بخش دیں۔ اس لئے کسی بھی نیکی کے کام کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، اور اسی طرح کسی بھی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر کرنا بھی نہیں چاہیے۔

دوسری تعلیم یہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے ہنستا ہوا چہرہ رکھ کر ملاقات کرو، یہ بھی ایک نیکی ہے، اس کی اپنے اندر عادت ڈالو، اس کو معمولی مت سمجھو، اگر اسی کا اہتمام کرو گے، تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دوسری نیکیوں کی توفیق دے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہنستے ہوئے چہرہ کے ساتھ ملاقات کرنا، چاہے اندرونی طور پر حالات اور معاملات جو کچھ بھی ہوں، لیکن کسی کے ساتھ جب ملاقات کرو تو اس طرح سے ملو کہ اس کی طبیعت پر کوئی کدورت نہ آئے۔ ایسا نہ ہو کہ ہر وقت اپنا منہ ایسا رکھتے ہیں جیسا کہ (ارنڈی کا تیل) دیویل (devil) پیا ہوا ہو۔ نہیں بھائی! اپنا چہرہ ہمیشہ ہنستا ہوا رکھنا بھی ایک ادب و نیکی ہے۔

استحباب بیان الکلام
 وإيضاحه للمخاطب
 وتكريره ليفهم إذا لم يفهم إلا بذلك
 بات کو مخاطب کے سامنے صاف اور واضح انداز
 میں کرنا
 اور اگر بغیر تکرار کے نہ سمجھتا ہو؛ تو مکرر کرنا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ گفتگو کے آداب

ایک اور عنوان قائم کیا ہے کہ: جو آپ کا مخاطب ہے یعنی جس سے آپ گفتگو کر رہے ہیں اس کے سامنے آپ کا اپنی بات کو ایسے انداز سے واضح طور پر کرنا کہ وہ آپ کی بات سمجھ جائے۔ اور اگر آپ کا خیال یہ ہو کہ ایک مرتبہ کہنے سے آپ کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہے تو دوسری مرتبہ کہہ دیجئے، اور دوسری مرتبہ سے بھی وہ نہیں سمجھا تو تیسری مرتبہ کہئے۔ آپ کی طرف سے کوشش یہ ہو کہ اس کو سمجھانے کا اہتمام کریں، خاص کر کہ جب استاذ پڑھاتا ہے اور شاگرد کی طرف سے مطالبہ ہو تو اس میں اس چیز کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے۔ دین کی کوئی بات آپ کسی کو بتلا رہے ہیں اور اسے سمجھ میں نہیں آئی تو دوبارہ بتلائیے، تیسری مرتبہ بھی سمجھائیے، جب تک کہ اس کی سمجھ میں نہ آئے آپ اس کو سمجھانے کی کوشش کیجئے۔ اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرے دو یا تین مرتبہ بولنے سے وہ سمجھ جائے گا تو پھر آپ کی طرف سے اس میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ نبی کریم ﷺ اس چیز کا اہتمام فرماتے تھے۔

کلام کا ایک ادب

۶۹۶:- عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَعَادَهَا ثَلَاثًا حَتَّى نَفَهُم عَنْهُ، وَإِذَا أُنِى عَلَى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ سَلَامًا عَلَيْهِمْ ثَلَاثًا.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کوئی بات ارشاد فرماتے تھے تو تین مرتبہ اس کو دہراتے تھے تاکہ لوگ سمجھ جائیں۔ اور جب سلام فرماتے تھے تو وہ بھی تین مرتبہ فرماتے تھے۔

افادات:- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پہلی مرتبہ بولنے میں سب تک آواز نہیں پہنچتی، اس لئے دوسری مرتبہ بولنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یا کوئی جملہ کسی کے کانوں میں پورا نہیں پہنچ پایا، بولنے والا تو پورا بولا لیکن سامنے والے کے کانوں تک آواز نہیں پہنچی اس لئے دوسری مرتبہ بولنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو سمجھانے کے لئے اور ان کے کانوں تک پوری بات پہنچانے کے لئے دوسری مرتبہ کہنا پڑے گا؛ تو پھر دوسری مرتبہ بولنے۔ یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ مخاطب کے انداز اور اس کے چہرے سے یہ سمجھ جاتے ہیں کہ اس نے پوری بات سنی نہیں ہے اور آپ کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دوبارہ بولوں گا تو وہ سمجھ جائے گا؛ تو پھر آپ کو اعادہ کرنا چاہیے۔ حضور ﷺ کا یہی معمول تھا۔ اسی طرح جب کوئی اہم بات ہوتی تھی تب بھی آپ ﷺ لوگوں تک پہنچانے کے لئے تین مرتبہ ارشاد فرماتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ دوسری یا تیسری مرتبہ بولنے سے سامنے والے تک آواز پہنچ جائے گی اور وہ سمجھ جائے گا تو پھر آپ کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ایسے موقع پر یہ نہ سوچئے کہ دوبارہ کون بولتا ہے، خواہ مخواہ زحمت اٹھانی پڑے گی۔

اور آپ ﷺ جب سلام فرماتے تھے تب بھی تین مرتبہ فرماتے تھے۔ اس کی تشریح علماء نے یہ لکھی ہے کہ کبھی بڑا مجمع ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ میں آواز سب تک نہیں پہنچتی تو تین مرتبہ سلام فرماتے کہ پہلے سامنے سلام کیا، پھر دائیں کیا، پھر بائیں کیا، تاکہ تمام لوگوں تک آواز پہنچ جائے۔

آپ ﷺ کا کلام بھی ایسا ہی ہوتا تھا

۶۹۷:- وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: كَانَ كَلَامُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ كَلَاماً

فَصَلًّا، يَفْهَمُهُ كُلُّ مَنْ يَسْمَعُهُ. (رواہ ابو داود)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی گفتگو بالکل واضح اور الگ الگ ہوتی تھی، ہر سننے والا اس کو سمجھ جاتا تھا۔

افادات:- یعنی آپ ﷺ اتنا جلدی نہیں بولتے تھے کہ ایک کلمہ دوسرے میں اس طرح جڑ جائے کہ سننے والے کو سمجھنے میں دشواری پیش آئے، جیسے بعض لوگ جلدی جلدی بولتے ہیں تو اس میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک کلمہ دوسرے میں مل جانے کی وجہ سے سننے والوں کو سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ آپ ﷺ اس طرح گفتگو فرماتے کہ ہر حرف آپ کی زبان مبارک سے اچھی طرح سے ادا ہوتا تھا۔ یہ بھی بولنے کے آداب میں سے ہے۔ متکبر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بات پوری نہیں بولتے، ایک آدھ بات ادھوری چھوڑ دیتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کی عادت شریفہ ایسی نہیں تھی، آپ اطمینان سے ہر کلمہ اور ہر لفظ الگ الگ کر کے ارشاد فرمایا کرتے تھے تاکہ ہر سننے والا اس کو سمجھ جائے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مضمون ہی دقیق اور باریک ہوتا ہے، بولنے والا الفاظ تو پورے بولتا ہے اور بات بھی پوری پہنچ جاتی ہے، لیکن سامنے والے کی عقل اس کو حل نہیں کر پاتی؛ وہ ایک الگ چیز ہے۔ اور ایک یہ ہوتا ہے کہ بات پورے طور پر کانوں تک نہ پہنچنے کی وجہ سے آدمی وہ بات سمجھ نہیں سکتا، یہاں اسی کو بتلانا مقصود ہے کہ آپ اس طرح بولو کہ بات ہر ایک تک پورے طور پر پہنچ جائے تاکہ کسی کو دشواری نہ ہو۔ یہ بھی زندگی گزارنے کے آداب میں سے ایک ادب ہے۔

بابِ اصغاء الجلیس لحديث جلیسہ
 الذی لیس بحرام واستنصات
 العالم والواعظ حاضری مجلسہ
 اپنے ہم نشین کی بات کی طرف دھیان دینا
 اور عالم و واعظ کا حاضرین کو اپنی بات سنانے
 کے لئے خاموش کرنا

مجلس کے آداب

ایک اور عنوان قائم کیا ہے کہ ایک ہم نشین کا اپنے دوسرے ہم نشین کی ایسی بات کی طرف کان دھرنا اور دھیان سے سننا جو بری نہیں ہے؛ یہ بھی آداب میں سے ہے۔ یعنی کوئی آدمی جب کوئی بات کہتا ہے تو آپ اس بات کو دھیان سے سنیں۔

نبی کریم ﷺ کی مجلس کا جو حال حدیث پاک میں بیان کیا جاتا ہے وہ شامل میں موجود ہے کہ آپ کی مجلس میں جب کوئی آدمی بات کرتا تھا تو سب لوگ خاموشی سے اس کو سنتے تھے اور دھیان دیتے تھے، ایسا نہیں ہوتا تھا کہ سب ہی بول رہے ہیں۔ اس لیے ایک آدمی جب اپنی بات سے فارغ ہو جائے، پھر دوسرا بولے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ایک کا کلام چل رہا ہے، اسی درمیان میں دوسرا اور تیسرا بھی بولنا شروع کر دے کہ اب کوئی بھی کسی کی بات صحیح طریقہ سے سن ہی نہیں پا رہا ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ ہم نشین اور ایک ہی مجلس میں پاس بیٹھنے والا آپ سے کوئی بات کرتا ہے تو اس کی بات کی طرف دھیان دینا اور غور سے سننا؛ یہ بھی اس کا حق ہے۔ ہاں! اگر وہ کوئی نامناسب اور غلط بات کر رہا ہے جو کرنی نہیں چاہیے، جیسے: کسی کی غیبت کر رہا ہے اور کوئی غلط بات کر رہا ہے؛ تو پھر اس کو سننے کی ضرورت نہیں ہے، اس کی طرف سے آپ دھیان ہٹا لیجئے۔ لیکن اگر وہ بات غلط نہیں ہے اور شرعاً کوئی ناجائز بھی نہیں ہے، تو پھر آپ کو اس کی بات کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اور عالم و واعظ کا مجلس کے حاضرین کو خاموش کرنا، جیسا کہ کبھی ہوتا ہے کہ مجلس میں شور و شغب اُٹھ رہا ہے، تو اگر کوئی کہے کہ بھائی! چپ رہو، اور دھیان سے سنو۔ تو اپنی بات سنوانے کے لیے خاموشی کا مطالبہ کرنا اور چپ ہونے کے لیے کہنا؛ یہ بھی جائز ہے، بلکہ یہ مجلس کے آداب میں سے ہے۔

لوگوں کو خاموش کر دو

۶۹۸:- عن جریر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ: اسْتَنْصِبِ النَّاسَ. ثُمَّ قَالَ: لَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّارًا يَصْطَرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ: لوگوں کو خاموش کر دو (ان کو خاموش رہنے کی تاکید کرو۔ جب لوگ خاموش ہو گئے اور نبی کریم ﷺ کی طرف متوجہ ہو گئے اس کے بعد حضور ﷺ کو جو خطبہ دینا تھا وہ شروع فرمایا) اس میں ایک بات یہ بھی ارشاد فرمائی اور صحابہ کرام کو تاکید فرمائی کہ میرے دنیا سے جانے کے بعد کافروں جیسے مت بن جائیو کہ کافر آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارتے ہیں، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں، تم لوگ آپس میں ایسا معاملہ مت کرنا۔

افادات:- نبی کریم ﷺ کچھ نصیحت اور وعظ فرمانا چاہتے تھے، اور لوگ اپنی اپنی باتوں میں مشغول تھے، اگر آپ ﷺ اسی حالت میں بولنا شروع فرمادیتے، تو بہت سی مرتبہ ایسی حالت میں پتہ بھی نہیں چلتا کہ کوئی بات کہی جا رہی ہے، اس لیے بولنے والے کو بھی چاہیے کہ پہلے ان کو خاموش کرے، پھر جو کچھ کہنا ہو وہ کہے۔ دیکھو! حضور اکرم ﷺ نے بھی اس بات کا اہتمام فرمایا کہ حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ لوگوں سے کہو کہ خاموش ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اعلان کیا۔ جیسا کہ ماسک میں کہا جاتا ہے کہ بھائیو! خاموش ہو جاؤ اور دھیان دو اور سنو، پھر بات کہی جاتی ہے۔ یہاں اس روایت کو لا کر یہی بتانا چاہتے ہیں کہ یہ طریقہ ثابت ہے، اور اسی طرح ہونا بھی چاہیے۔

باب الوعظ والاقتصاد فیہ

وعظ و نصیحت میں میانہ روی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شریعت کی ایک اہم تعلیم

نیا عنوان قائم کیا ہے: وعظ کہنا، نصیحت کرنا اور اس میں میانہ روی سے کام لینا۔
یہ بھی شریعت کی ایک اہم تعلیم ہے۔ دیکھو! کوئی کام کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، لیکن اس میں بھی شریعت یہ کہتی ہے کہ اعتدال سے کام لو۔ بڑے سے بڑا صاحب علم اور بڑے سے بڑا شیریں کلام اور نصیحت کی اچھی باتیں کہنے والا بھی اگر بار بار کہتا رہے گا تو لوگ تنگ آ جائیں گے، اُکتا جائیں گے، اُوب جائیں گے، اکتاہٹ پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے نصیحت کے معاملہ میں کوئی ایسا انداز اختیار کرنا کہ لوگ دین کی باتوں سے اُکتاہٹ محسوس کرنے لگیں؛ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ جیسے: اگر بریانی بھی روزانہ کھاتے رہیں گے تو کیا ہوگا؟ دو دن کے بعد طبیعت کہے گی کہ بس کرو، اب تو کچھ دال آجائے تو اچھا ہے۔

معلوم ہوا کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، لیکن ہر ایک چیز کے لیے موقع محل ہوتا ہے۔ شریعت نے دین کی باتیں لوگوں تک پہنچانے اور وعظ و نصیحت اور تقریر کرنے کے معاملہ بھی یہی تاکید کی ہے کہ اس میں بھی آپ اتنا مبالغہ سے کام نہ لیں، اس کی اتنی کثرت نہ کریں کہ پھر لوگ آپ کو دیکھ کر ہی چھپنے لگیں۔ بعض لوگوں کا ایسا مزاج ہوتا ہے تو پھر لوگ ان سے بھاگتے ہیں۔ اگر ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ آج فلاں مسجد میں فلاں صاحب گئے ہیں تو اس دن مسجد بدل ڈالیں گے، اس مسجد میں نماز پڑھنے جائیں گے ہی نہیں، ایسا اس لیے ہوا کہ اس نصیحت پر عمل نہیں کیا گیا، اس لیے اس بات کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستہ کی طرف لوگوں کو دانائی و حکمت کے ساتھ، بھلے طریقہ سے نصیحت کر کے اور سمجھا کر دعوت دیجیے۔ بھلے طریقہ سے جو نصیحت کی جاتی ہے اس کی بہت سی شکلیں ہیں، ان میں سے ایک شکل یہ بھی ہے کہ نصیحت کرنے کے معاملہ میں مبالغہ سے کام نہ لیا جائے، موقعہ بموقعہ، ہفتہ میں ایک یا دو مرتبہ ہو؛ بس۔ اس سے زیادہ نہیں، اور روزانہ تو بالکل بھی نہیں۔

حکمتِ تربیت یہی ہے

۶۹۹:- وعن أبي وائل شقيق بن سلمة، قال: كان ابن مسعود -رضي الله عنه- يذكرنا في كل خميس، فقال له رجل: يا أبا عبد الرحمن! لوددت أنك ذكرتنا كل يوم، فقال: أما إنهم يمنعونني من ذلك أني أكره أن أملككم، وإني أتمنؤ لكم بالموعظة كما كان رسول الله ﷺ يتخولنا بها فخافة السامة علينا، (متفق عليه) ((يَتَخَوَّلُنَا)) : يَتَعَهَّدُنَا.

ترجمہ:- حضرت ابو وائل شقیق بن سلمہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (جو بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، صحابہ میں ان کا علمی مقام بہت اونچا تھا) ہر جمعرات کو ہمیں نصیحت کرتے تھے۔ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ: اے ابو عبد الرحمن! ہماری دلی خواہش اور تمنا یہ ہے کہ آپ روزانہ وعظ کہیں (معلوم ہوا کہ ایسا کہنے والے بھی ہوتے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک دو کے کہنے کی وجہ سے آپ یہ وطیرہ اختیار کر لیں) تو اس پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بات اس چیز سے مجھے باز رکھتی ہے کہ میں تمہیں اکتاہٹ میں ڈال دوں (یعنی میں روزانہ

نصیحت کر سکتا ہوں، لیکن اگر میں ایسا کروں گا تو میرا یہ عمل اور میرا یہ طریقہ و طرز تم لوگوں کو اُکتا ہٹ میں مبتلا کر دے گا، پھر تم لوگ اُکتا جاؤ گے) اس لیے میں موقع محل اور وقت دیکھ کر تمہیں نصیحت کرتا ہوں (اور اس کی دلیل یہ بتلائی) جیسا کہ نبی کریم ﷺ بھی موقع و محل دیکھ کر نصیحت فرماتے تھے، اس ڈر سے کہ ہم لوگ اُکتا ہٹ میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

انذات:- ”تَحْوِيلُ“ کہتے ہیں کہ کسی کی تربیت اور نگرانی کے معاملہ میں سمجھ داری سے کام لینا۔ نصیحت و تقریر اور دین کی باتیں جو کہی جاتی ہیں اس کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی دینی تربیت ہو۔

حضور اکرم ﷺ سے بڑھ کر اچھی نصیحت کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟ اور صحابہ سے بڑھ کر محبت اور توجہ سے سننے والے اور کون ہو سکتے تھے؟ اس کے باوجود حضور ﷺ روزانہ نصیحت اس لیے نہیں فرماتے تھے کہ کہیں یہ لوگ اُکتانہ جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی تربیت کا ایک طریقہ ہے، اس چیز کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔ تربیت اور حکمت تربیت کے خلاف ہے کہ آدمی اس چیز کا اہتمام نہ کرے۔ اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی تربیت اور تعلیم مقصود ہوتی ہے جب وہ اُکتا ہٹ محسوس کرنے لگتے ہیں، پھر یا تو وہ اس کو چھوڑ جاتے ہیں، یا ساتھ رہتے ہیں تب بھی اس کی باتوں کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔

فقاہت کی علامت

۷۰۰:- وعن أبي اليقظان عمار بن ياسر رضي الله عنهما قال: سمعتُ رسول

الله ﷺ يقول: إِنَّ طَوْلَ صَلَاةِ الرَّجُلِ، وَقَصْرَ خُطْبَتِهِ، مَعِيَّةٌ مِنْ فَقْهِهِ فَأَطِيلُوا الصَّلَاةَ وَأَقْصِرُوا الْخُطْبَةَ.

((مِثْنَةً)) اُنْی: عَلَامَةُ دَالَّةٌ عَلَى فَفْهِهِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: آدمی کی نماز کا لمبا ہونا اور خطبہ کا مختصر ہونا اس کی فقاہت اور سمجھ داری کی علامت اور نشانی ہے؛ اس لیے تم نماز کو لمبا کرو اور خطبہ کو مختصر کرو۔

افادات:- جیسے جمعہ کے دن نماز لمبی ہو اور خطبہ نماز کے مقابلہ میں مختصر اور (Short) ہونا چاہیے۔ آج کل معاملہ بالکل اُلٹ گیا ہے، خطبے لمبے لمبے ہوتے ہیں اور نمازیں مختصر ہوتی ہیں، حالاں کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ نماز کا لمبا ہونا اور خطبہ کا مختصر ہونا آدمی کی سمجھ داری کی علامت ہے۔

وعظ مختصر، مگر پُر اثر

۷۰:- وعن معاوية بن الحكم السلمي رضي الله عنه قال: بَيْنَا أَنَا وَصَلَّى مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ إِذْ عَطَسَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ، فَقُلْتُ: يَزْحَمُكَ اللَّهُ، فَرَمَانِي الْقَوْمُ بِأَبْصَارِهِمْ. فَقُلْتُ: وَاشْكُلْ أُمِّيَا، مَا شَأْنُكُمْ تَنْظُرُونَ إِلَيَّ؟ فَجَعَلُوا يَضْرِبُونَ بِأَيْدِيهِمْ عَلَى أَفْخَادِهِمْ فَلَمَّارَ أَيْتُهُمْ يُصَيِّتُونَنِي لِكَيْ سَكَتُ، فَلَمَّا صَلَّى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، فَبَايَ هُوَ وَأُمِّي، مَا رَأَيْتُ مُعَلِّبًا قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ أَحْسَنَ تَعْلِيمًا مِنْهُ، فَوَاللَّهِ مَا كَهَرَنِي، وَلَا صَرَبَنِي، وَلَا شَتَبَنِي. قَالَ: إِنَّ هَذِهِ الصَّ لَمَّا لَا يَصْلُحُ فِيهَا شَيْءٌ مِنْ كَلَامِ النَّاسِ، إِنَّمَا هِيَ التَّنْسِيحُ وَالتَّكْبِيرُ وَقِرَاءَةُ الْقُرْآنِ، أَوْ كَمَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ. قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنِّي حَدِيثٌ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ، وَقَدْ جَاءَ اللَّهُ بِالْإِسْلَامِ، وَإِنَّ مَنَارَ جَالٍ يَأْتُونَ الْكُفَّانَ قَالَ: فَلَا تَأْتِيهِمْ. قُلْتُ: وَمِمَّا رِجَالٌ يَتَطَلَّبُونَ؟ قَالَ: ذَلِكَ شَيْءٌ يَجِدُونَهُ فِي صُدُورِهِمْ فَلَا يَصُدُّهُمْ. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت معاویہ بن حکم سلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں

حضور ﷺ کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھ رہا تھا (یہ نئے نئے اسلام لائے تھے) نماز کے دوران ہی ایک آدمی کو چھینک آئی (چھینکنے والے نے الحمد للہ نہیں کہا تھا، لیکن ان کو یہ معلوم تھا کہ چھینک کھانے والے کو جواب میں یرحمکم اللہ کہنا چاہیے) تو میں نے نماز ہی میں یرحمکم اللہ کہہ دیا (در اصل ان کو یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ نماز میں بولنے کی ممانعت ہے، اور صحابہ نماز میں ہونے کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے، اس لیے) لوگ میری طرف گھورنے لگے، تو میں بول پڑا کہ میری ماں مجھے روئے تم لوگ مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟ جب میں یہ بولا تو لوگ اپنی رانوں پر اپنے ہاتھ مارنے لگے۔ یعنی اس طرح وہ ان کو یہ بتلانا چاہتے تھے کہ بھائی! تم خاموش رہو۔ تو میں سمجھ گیا کہ یہ مجھے چپ کرانا چاہتے ہیں (”لَا يَكْفِي سَكُتٌ“ شراح فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ) مجھے جوش تو بہت آیا کہ ان کو کچھ کہوں لیکن پھر بھی میں خاموش رہا اور کچھ بولا نہیں (یہ پورا قصہ تو نماز کے دوران پیش آیا تھا اور جماعت سے نماز ہو رہی تھی۔ آگے جو بات آرہی ہے اسی کی تعلیم دینا چاہتے ہیں) حضرت معاویہ بن حکم سلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور اکرم ﷺ نماز سے فارغ ہوئے، میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں نے کسی سکھانے والے کو آپ ﷺ سے اچھا سکھانے والا آپ سے پہلے یا آپ کے بعد نہیں دیکھا۔ اللہ کی قسم! حضور اکرم ﷺ نے نہ مجھے ڈانٹا، نہ مجھے مارا، نہ مجھے لتاڑا، بلکہ اپنے قریب بلا کر فرمایا: بھائی! یہ تو نماز ہے، اور نماز کے باہر جس طرح باتیں کرتے ہیں، نماز کی حالت میں ایسی باتیں کرنے کی گنجائش نہیں ہے (بلکہ نماز میں خاموش رہنا چاہیے) نماز میں تو سبحان اللہ، اللہ اکبر کہا جاتا ہے، قرآن پاک کی تلاوت کی جاتی ہے (نماز میں ایسی باتیں نہیں ہوتی جو تم نے کیں۔ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی نصیحت کرنے کا جو انداز دیکھا اور حضور ﷺ نے ان کو جس محبت سے سمجھایا، اس سے ان کا حوصلہ بڑھا، اور انہوں نے

موقع غنیمت سمجھ کر ایک بات پوچھ لی کہ حضور اکرم ﷺ کی توجہ میری طرف منعطف ہے تو چلو! ایک بات پوچھ لوں (انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم تو اسلام سے دور تھے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام عطا فرمایا، ہمارے یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کاہنوں کے پاس جاتے ہیں۔ حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: تم ان کے پاس مت جاؤ (اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اس پر انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ کیوں نہ جاؤں، بلکہ بس حضور ﷺ نے فرما دیا تو اب بات خلاص ہو گئی) پھر پوچھا: ہم میں بعض لوگ وہ ہیں جو بدشگونگی لیتے ہیں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: وہ ایک کھٹکا سا ہے جو اس کی وجہ دل میں پیدا ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی اس کی وجہ سے اس کام کو چھوڑ نہ دے (بلکہ اپنا کام پورا کر ڈالے)

افادات:- ”نماز میں ایسی باتیں نہیں ہوتی جو تم نے کیں“، نصیحت کے طور پر آپ ﷺ نے بس اتنی ہی بات ارشاد فرمائی۔ کہنے کی بات اتنی ہی تھی، وہ کہہ دی، دوسرا کوئی ردِ عمل آپ ﷺ نے نہیں کیا۔ اگر ہم اور آپ ہوتے تو پہلے زیادہ وقت تو مار پٹائی میں لیتے، اور کام کی جو چیز ہے اس میں تو ایک منٹ لگاتے۔ لیکن حضور ﷺ اپنے عمل سے اس بات کی تعلیم دے رہے ہیں کہ جو اصل چیز ہے اس کی طرف دھیان دو، دوسری چیزیں چھوڑ دو۔ جب کوئی آدمی ایسا کرے گا تو اس کا اثر سامنے والے پر زیادہ اچھا پڑے گا، ہم یوں سمجھتے ہیں کہ مار پٹائی میں زیادہ اثر پڑے گا۔ ہاں! اگر پہلے سے بتا دیا ہے اور وہ آدمی ان باتوں سے واقف ہے، اس کے باوجود وہ قصداً ایسا کرتا ہے، تو وہ الگ بات ہے۔

کاہن نہیں تو عامل

کاہن وہ لوگ ہوتے ہیں جو آئندہ پیش آنے والے معاملات کے متعلق خبر

دینے کا دعویٰ کرتے ہیں، جن کو ”جوئی“ کہا جاتا ہے۔ آج کل بھی بہت سے لوگوں کا مزاج ایسا بن گیا ہے۔ جو مسلمان ہیں وہ جو تشیوں کے پاس تو کم ہی جاتے ہوں گے لیکن عاملوں کے پاس جاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ آئندہ کا کیا معاملہ ہے؟ اس کے بارے میں دیکھ کر کچھ بتاؤ، حالاں کہ وہ غیب تھوڑا ہی جانتا ہے۔ یہ مزاج دھیرے دھیرے اسی طرف ڈھلتا جا رہا ہے، اس لیے ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

غلط عقیدہ

بدشگونی کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام کو کرنے سے پہلے کسی چیز کو دیکھ کر اس کام سے رک جانا۔ زمانہ جاہلیت میں کسی آدمی کو سفر درپیش ہوتا، یا کسی کام کے لیے گھر سے باہر نکلتا؛ تو دیکھتا کہ کوئی پرندہ بیٹھا ہوا ہے یا نہیں، اگر کوئی پرندہ بیٹھا ہوا ملتا، وہ اس کی طرف کنکر پھینکتا، اگر وہ پرندہ اڑ کر دائیں طرف جاتا تو سمجھتا کہ اس کام میں کامیابی ہوگی، اور اگر وہ بائیں طرف جاتا تو سمجھتا کہ ناکامی ہوگی اور واپس ہو جاتا تھا۔

آج کل ہمارے سماج میں بھی بہت سے لوگ ایسا سمجھتے ہیں، جیسے: باہر نکلے اور بلی سامنے سے گزر گئی، تو کہتے ہیں کہ سارا معاملہ خراب ہو گیا، اور پھر جس کام کے ارادہ سے گھر سے نکلے تھے اس کو چھوڑ کر واپس آ جاتے ہیں کہ بلی راستہ کاٹ گئی، اب معاملہ مشکل ہے، اس کام میں کامیابی نہیں ہوگی۔ اچھا بھائی! بلی کا سامنے سے گزرنا اتنا زیادہ مؤثر ہے کہ اس نے آپ کے کام پر ہی اثر ڈال دیا؟ یہی بدشگونی ہے، اسلام ایسا عقیدہ رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔

اگر ایسا کھٹکا پیدا ہو گیا

اور ایک بات یہ بھی یاد رہے کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی واپس تو نہیں

ہوتا، لیکن دل میں کھٹکا سارہ جاتا ہے۔ ویسے ایک آدمی شریعت کے مسئلہ کو جانتا ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، لیکن پھر بھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پرانا مزاج ہونے کی وجہ سے دل میں وسوسہ سا پیدا ہو جاتا ہے کہ اب کیا ہوگا۔ یعنی اپنا ارادہ ترک نہیں کرتا اور اس کام کو چھوڑ بھی نہیں دیتا، گھر واپس بھی نہیں ہو جاتا، بلکہ اپنے کام کے لیے آگے تو بڑھتا ہے، لیکن دل میں ایک کھٹکا سارہ ہوتا ہے، تو اس کے لیے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر ایسا کھٹکا پیدا ہو گیا ہو تب بھی اپنا کام کر ڈالے، اس کام چھوڑ نہ دے۔ بس! اس طرح اس نے شریعت کے حکم پر عمل کر لیا، اب اس کے بعد بھی وہ کام نہ ہو تو یہ نہ سمجھے کہ اس کی وجہ سے نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں تھا اس وجہ سے وہ کام نہیں ہوا۔

بہر حال! یہاں تو یہ روایت یہی بتانے کے لیے لائے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی تعلیم و تربیت کا طریقہ کیسا تھا۔

۷۰۲:- وعن العزْباض بن سارية رضي الله عنه قال: وعظنا رسول الله ﷺ مَوْعِظَةً وَجَلَّتْ مِنْهَا الْقُلُوبُ، وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُونُ... وَذَكَرَ الْحَدِيثَ وَقَدْ سَبَقَ بِكَمَالِهِ فِي بَابِ الْأَمْرِ بِالْمَحَافَظَةِ عَلَى السُّنَّةِ.

افادات:- اس حدیث کو اس باب میں لا کر نبی کریم ﷺ کے وعظ کا ایک نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے وعظ کی کیفیت کیا ہوا کرتی تھی۔

(یہ حدیث پہلے بھی کئی ابواب میں گزر چکی ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے: حدیث کے اصلاحی مضامین،

باب الامر بالمحافظۃ علی السنۃ، حدیث نمبر: ۱۵۷، جلد: ۳/۲۰۸ تا ۲۱۰-مرتب)

باب الوقار والسکينة سنجیدگی اور اطمینان کی عادت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمَشُوْنَ عَلٰی الْاَرْضِ هَوْنًا﴾

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ آداب کا بیان چل رہا ہے جس میں زندگی گزارنے کی تمیز اور آداب سکھائے جا رہے ہیں۔ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ علیہ کتاب الادب کے متعلق فرماتے ہیں کہ ایک مؤمن کی زندگی کس طرح ہونی چاہیے اور زندگی کے ہر شعبہ اور ہر قدم پر مؤمن کو کس طرح کا سلوک کرنا چاہیے، اسی سلیقہ اور تمیز کو ادب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس سلسلہ میں مختلف ہدایتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ باب کا عنوان قائم کیا ہے: ”الوقار والسکینۃ“ وقار اور اطمینان کا بیان

زندگی کا اہم ادب

وقار یعنی سنجیدگی اور طبیعت کے اندر جماؤ اور ٹھیراؤ کا ہونا۔ کسی آدمی کے سامنے جب کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جو اس کی طبیعت میں بے صبری پیدا کرنے والا ہو، تو اس سے متاثر ہو کر بے صبری کا اظہار نہ کرے؛ بلکہ تحمل اور بردباری سے کام لے۔ کوئی ایسی بات پیش آئی جو آدمی کی طبیعت میں اشتعال اور غصہ و جوش دلانے والی ہے، تو اس سے متاثر ہو کر مشتعل نہ ہو، جوش و غصہ میں نہ آجائے، بلکہ اپنے اوپر کنٹرول اور قابو رکھے۔ مجلس کے اندر اور لوگوں کے سامنے آدمی کو اپنے مزاج اور طبیعت پر قابو رکھتے ہوئے اس طرح رہنا چاہیے کہ سامنے والے کی طرف سے کی جانے والی بدسلوکی یا نامناسب برتاؤ سے متاثر ہوئے بغیر سنجیدگی اور اطمینان کا اظہار کرنا چاہیے؛ اسی کو وقار اور سکینہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آدمی کسی حال میں بھی وقار اور سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ کسی کی بھی طرف سے آپ کے ساتھ کیسا ہی معاملہ کیوں نہ کیا جائے

جس کے نتیجے آپ کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہو سکتا ہے، طبیعت میں بے صبری آ سکتی ہے، جوش اور غصہ آ سکتا ہے، لیکن آپ اپنے اوپر قابو رکھتے ہوئے ان ساری چیزوں سے متاثر ہوئے بغیر وقار اور سنجیدگی کا معاملہ کریں۔

”وَقَرَّ“ کا معنی کسی چیز کا کسی جگہ پر ٹھیر جانا اور جم جانا۔ گویا آپ کی طبیعت میں ایسا ٹھیراؤ اور جماؤ ہو کہ سامنے والا آپ کو اپنی اصل جگہ سے ہٹانہ سکے، اشتعال دلانے والی چیز آپ کو مشتعل نہ کر سکے، جوش دلانے والی چیز آپ کو جوش میں نہ لائے؛ اسی کو ”وقار“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ بھی شریعت کی ایک اہم تعلیم ہے کہ آدمی ہمیشہ وقار کا مظاہرہ کرے اور سنجیدگی سے رہے۔

ہر معاملہ میں تواضع

اس سلسلہ میں آیت کریمہ پیش کی ہے: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾ اللہ تعالیٰ نے سورہ فرقان میں اپنے مخصوص بندوں کی کچھ صفات بیان کی ہیں، ان میں سے ایک صفت یہ ہے کہ رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمیں پر عاجزی سے چلتے ہیں، گویا ان کی ہر حرکت اور معاملہ سے تواضع ظاہر ہوتی ہے، ان کی چال میں بھی تواضع ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی بیماروں کی طرح بالکل آہستہ آہستہ چلے، بلکہ آدمی اپنی رفتار سے چلے، خود نبی کریم ﷺ کی رفتار میں تیزی تھی جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے: ”كَأَمَّا الْأَرْضُ فَضْطَوْنِي لَهَا“ آپ اس طرح چلتے تھے کہ گویا زمین آپ کے لیے لپیٹی جا رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ عاجزی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بیماروں کی طرح چلے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ وہ بالکل آہستہ آہستہ بیماروں کی طرح چل رہا ہے، اس سے پوچھا: کیا بات ہے؟ تم بیمار ہو؟ اس

نے کہا: نہیں۔ تو ایک کوڑا مارا اور کہا: نو جوان ہو کر اس طرح چلتے ہو؟ اس طرح مت چلو۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ آدمی کی چال میں تکبر، بڑائی اور اترا ہٹ ہو، اس سے بھی شریعت نے منع کیا ہے، آدمی کی ہر ادا اور طریقہ سے تواضع ٹیکنی چاہیے، ہر معاملہ میں فروتنی ظاہر ہونی چاہیے۔

رحمن کے بندوں کی صفت

﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ اور جہالت کا برتاؤ کرنے والے لوگ جب ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ جواب میں کہتے ہیں: صاحب سلامت رہو۔ ”جاہلون“ سے مراد ”اُن پڑھ“ نہیں ہے، بلکہ کبھی پڑھا لکھا آدمی بھی جہالت بھرا سلوک کرتا ہے، اور کبھی بے پڑھا لکھا آدمی بھی بڑا باتمیز اور اچھا سلوک کرتا ہے۔ تو یہاں ”جاہلون“ کہہ کر ایسے لوگ مراد ہیں جو کسی کے ساتھ جیسا مناسب، انسانیت والا، مروت و شرافت والا برتاؤ کرنا چاہیے، ویسا برتاؤ نہ کریں، بلکہ نادانی اور جہالت بھرا برتاؤ کریں؛ جس کو ہم اپنی زبان میں ”اُلٹی بات کرنے والا“ کہتے ہیں۔ تو ایسا آدمی جب گفتگو کرے تو اس کے جواب میں مشتعل نہ ہو جائے، جوش اور غصہ میں نہ آجائے، بلکہ سلامتی والی ایسی بات کہے کہ سامنے والا اپنی حرکت سے اس کو جو الجھانا چاہتا ہے وہ الجھانہ سکے۔ یہاں ﴿سَلَامًا﴾ سے مراد ”السلام علیکم“ کہنا نہیں ہے، بلکہ مفسرین نے لکھا ہے کہ اپنے آپ کو اس سے بچالے۔ سامنے والے کے سلوک کا تقاضہ تو یہ تھا کہ یہ اس سے الجھ جاتا، اور اس کے ساتھ لڑ بھڑ جاتا، لیکن وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ صبر و تحمل اور بردباری سے کام لیتا ہے، اور وقار و سنجیدگی سے پیش آتا ہے۔

اس آیت کے دوسرے جزو ﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ کا

تعلق وقار اور سنجیدگی سے ہے، اس لیے کہ ظاہر ہے کوئی آدمی کسی کے ساتھ جب جہالت بھرا سلوک کرتا ہے تو طبیعت میں جوش پیدا ہوتا ہے، بے چینی اور بے صبری ہوتی ہے، آدمی کی طبیعت چاہتی ہے کہ سامنے والا ہمارے ساتھ جو معاملہ کر رہا ہے تو اس کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے، لیکن ایسے ہی وقت پر وہ اپنے اوپر قابو رکھتا ہے، او ضبطِ نفس سے کام لیتا ہے، اور سامنے والے کے جہالت بھرے سلوک کے جواب میں یہ جہالت والا معاملہ نہیں کرتا، بلکہ ایسی حرکتوں سے اپنے آپ کو بچا لے جاتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے مقبول و مخصوص بندوں کی جو صفات و خوبیاں ہیں ان میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے؛ اسی کو ’وقار‘ سے تعبیر کرتے ہیں۔

وقار کا ایک پہلو یہ بھی ہے

۷۰۳:- وعن عائشة رضي الله عنها قالت: مَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مُسْتَجْبِعًا قَطُّ ضَاحِكًا حَتَّى تُرَى مِنْهُ لَهَوَاتُهُ، إِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((اللَّهَوَاتُ)) جَمْعُ لَهَآءٍ: وَهِيَ اللَّحْمَةُ الَّتِي فِي أَقْصَى سَقْفِ الْفَمِ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو کبھی کھل کھلا کر اور خوب جم کر اس طرح ہنسنے ہوئے نہیں دیکھا کہ آپ کے منہ کے اندر کا کوئی نظر آتا ہو، اگر کبھی کوئی بات ہنسی کی ہوا کرتی تھی تو آپ ﷺ صرف مسکراتے تھے۔

افادات:- یہ آپ ﷺ کے وقار کی بات تھی۔ یہاں علامہ نووی رحمہ اللہ وقار کے ایک دوسرے پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ حلق کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا لٹکا ہوا ہوتا ہے، جب آدمی کھل کھلا کر زور سے ہنستا ہے، تو سامنے والے کو وہ نظر آتا ہے؛ اسی کو ہم اپنی زبان میں کوّا کہتے ہیں۔ مسکرا نے کا مطلب یہ ہے کہ صرف ہونٹ کھلیں،

آواز بھی پیدا نہ ہو، اور آدمی کے دندان نظر آئیں، جس کو تبسم کہتے ہیں۔ بہت سی مرتبہ ہنسانے والے ہنساتے ہیں، مگر یہ اپنے آپ پر ایسا ضبط اور کنٹرول رکھتا ہے، اور اس کا ایسا اثر نہیں لیتا کہ بے قابو ہو جائے، لوٹ پوٹ ہو جائے، اور خوب زور زور سے ہنسنے لگے، اس لیے کہ یہ طریقہ بھی وقار کے خلاف ہے۔

وقار کا ایک پہلو وہ بھی بتایا تھا کہ غصہ دلانے والا جہالت بھری بات کرتا ہے تو اس کے جواب میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرتا، بلکہ اپنے آپ کو بچا لیتا ہے۔ اور وقار کا ایک پہلو یہ بھی بتایا کہ ہنسانے والا ہنسانے کی بات کرتا ہے، یا کوئی ایسی بات پیش آگئی جس سے آدمی ہنسنے میں بے قابو ہو جائے، تب بھی یہ اپنے آپ کو بے وقار ہونے سے بچاتا ہے۔ وقار کا ایک طریقہ اور انداز یہ بھی ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ وقار کے اندر دونوں چیزیں ملحوظ رکھنی چاہئیں، جوش و غصہ والی بات سے اتنا زیادہ غصہ بھی نہ ہو جائے، اور ہنسانے والی بات پر اتنا بے قابو ہو کر ہنسنا بھی شروع نہ کر دے، بلکہ اپنے آپ پر ضبط اور کنٹرول رکھے، اسی کا نام وقار اور سنجیدگی ہے، اور شریعت نے اس کی تعلیم دی ہے۔

الندب الى اتیان الصلاة والعلم ونحوهما من العبادات بالسكينة والوقار نماز اور علمی مجالس میں سکون و وقار سے آنا وقار کو چھوڑنے کی اجازت نہیں

نماز، علم کی مجلس، یا عبادات کے قبیل کی کوئی چیز؛ جس میں آدمی حاضری دیا کرتا ہے، وہاں بھی آدمی ایسی عجلت نہ دکھائے کہ طبیعت بے قابو ہو جائے، بلکہ ایسی جگہوں پر بھی وقار، اطمینان و سکون کے ساتھ پہنچے۔ شریعت کسی بھی حال میں وقار کو چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتی۔

تقویٰ کی علامت

اس سلسلہ میں ایک آیت پیش کی ہے: ﴿وَمَنْ يُعْظَمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ جو آدمی اللہ تعالیٰ کے دین کی نشانیوں کا ادب کرتا ہے؛ یہ اس کے دل کے اندر اللہ تعالیٰ کے خوف اور ڈر کی علامت ہے۔ ”شعائر“ یعنی کسی بھی مذہب اور دین کی علامتیں اور نشانیاں جن کو دیکھ کر وہ مذہب والے پہچانے جاتے ہیں، جیسے: نماز اسلام کے شعائر میں سے ہے، اس لیے اس کے ادب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور اس کے ادب میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی اتنی جلد بازی اور عجلت نہ کرے کہ بھاگنے دوڑنے کی نوبت آئے، بلکہ اطمینان و سکون کے ساتھ نماز کے لیے مسجد میں آئے۔ دوسری کسی بھی علمی و

دینی مجالس میں حاضری دیتے وقت اطمینان و سکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔
 گویا وقار اور سنجیدگی کی جو تعلیم ہمیں دی گئی ہے اس کا لحاظ یہاں تک کیا گیا کہ
 عبادات کی حاضری کے موقع پر بھی اس کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چوں کہ عبادات وہ طریقے
 ہیں جن سے آدمی اللہ تعالیٰ کو راضی کرتا ہے، تو ان کے بارے میں کسی کو یہ خیال ہو سکتا
 تھا کہ جلد بازی اور عجلت سے کام لینا شاید مطلوب و پسندیدہ ہو۔ تو یہ روایت لا کر یہ
 بتلا رہے ہیں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ وقار اور سنجیدگی کے متعلق شریعت کی جو تعلیم ہے اس کو
 کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے، اس کا لحاظ تو وہاں بھی ہونا چاہیے۔

دوڑنا؛ وقار اور سنجیدگی کے خلاف ہے

۴۰۷:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول:
 إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ، فَلَا تَأْتَوْهَا وَأَنْتُمْ تَسْعَوْنَ، وَأَتَوْهَا وَأَنْتُمْ تَمْشُونَ،
 وَعَلَيْكُمْ السَّكِينَةُ، فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوا، وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا. (متفق عليه)

زاد مسلم فی روایۃ لہ: فَإِنْ أَحَدُكُمْ إِذَا كَانَ يَعْبُدُ إِلَى الصَّلَاةِ فَهُوَ فِي صَلَاةٍ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد

فرماتے ہوئے سنا کہ: جب نماز کے لیے اقامت کہہ دی جائے، یا نماز شروع ہو چکی ہو؛ تو اس میں
 شریک ہونے کے لیے دوڑتے ہوئے نہ آؤ، بلکہ چلتے ہوئے اور سکون کے ساتھ آؤ۔ اب امام کے
 ساتھ نماز کا جتنا حصہ مل گیا وہ امام کے ساتھ پڑھ لو، اور جتنا چھوٹ گیا اس کو بعد میں پورا کر لو۔

مسلم شریف کی روایت میں یہ ہے کہ: تم میں کوئی آدمی جب نماز کے ارادہ سے چلتا ہے
 تو وہ نماز ہی کے حکم میں ہے۔

افادات:- مثلاً: مسجد میں آئے اور دیکھا کہ جماعت شروع ہو چکی ہے

اور امام صاحب رکوع میں ہیں، تو بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ رکعت پانے کے لیے دوڑتے ہیں۔ اس روایت میں یہی فرمایا کہ دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ عام رفتار سے آؤ، اگر اس میں معمولی تیزی ہو تو کوئی حرج کی بات بھی نہیں ہے، لیکن جس رفتار کو دوڑنے سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کی اجازت نہیں ہے۔ دوڑنا؛ وقار اور سنجیدگی کے خلاف ہے، اس لیے کہا گیا کہ دوڑ کر نہ آؤ بلکہ چل کر آؤ۔ یعنی نماز میں شریک ہونے کے لیے اپنی عام چال میں کوئی فرق آنا نہیں چاہیے، وقار و سنجیدگی والی چال کے ساتھ ہی نماز میں شریک ہونا بھی نماز کے آداب میں سے ایک ادب ہے۔

حاصل شدہ کے لیے بھاگنا لا حاصل

اب یہ سوال کہ سکون کے ساتھ آنے کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ کوئی رکعت چھوٹ جائے؟ تو کہا گیا کہ آپ تو اطمینان ہی سے آئیے، امام کے ساتھ نماز کا جتنا حصہ مل جائے وہ امام کے ساتھ پڑھ لیجئے، اور جتنا چھوٹ جائے اس کو بعد میں پورا کر لیجئے۔ مسلم شریف کی روایت میں جو یاد دہانی ہے اس کے ذریعہ ایک اشکال کا جواب دیا ہے کہ آدمی دوڑتا اس لیے ہے کہ میں جلدی سے نماز میں شریک ہو کر نماز کا ثواب حاصل کر لوں، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ: کوئی آدمی جب نماز کے ارادے سے چلتا ہے تو وہ نماز ہی کے حکم میں ہے۔ گویا آپ گھر سے چلے تو آپ کا میٹر چالو ہو گیا، اب فکر کا ہے کی ہے۔ آپ اسی لیے دوڑتے تھے کہ نماز کا ثواب لینا ہے، تو نماز کے ارادہ سے چلنے سے ہی نماز کے ثواب کا میٹر شروع ہو چکا ہے، اب آپ اطمینان رکھئے، اور اپنی پُر وقار چال سے چلتے ہوئے نماز میں شریک ہوئیے، بھاگنے دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے دوڑنے کا مقصد ثواب کو حاصل کرنا تھا، وہ تو نماز کے ارادہ سے چلنے سے ہی

حاصل ہو چکا ہے۔

جلد بازی نیکی نہیں ہے

۷۰۵:- وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما: أَذْنُهُ دَفَعَ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ عَرَفَةَ فَسَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ وَرَأَاهُ زَجْرًا شَدِيدًا وَضَرْبًا وَصَوْتًا لِلْجَلِّ، فَأَشَارَ بِسَوْطِهِ إِلَيْهِمْ، وَقَالَ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ! عَلَيْكُمْ بِالسَّكِينَةِ، فَإِنَّ الْبِرَّ لَيْسَ بِالْإِيضَاعِ. ((الْبِرُّ)): الطَّاعَةُ. وَ((الْإِيضَاعُ)): الْإِسْرَاعُ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ عرفات کے دن (غروب آفتاب کے بعد میدان عرفات سے مزدلفہ کی طرف) روانہ ہوئے۔ جب آپ روانہ ہوئے تو جو لوگ حج میں شریک تھے وہ سب بھی آپ کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ اب حضور ﷺ تو آگے تشریف لے جا رہے تھے تو آپ نے اپنے پیچھے سے محسوس کیا اور سنا کہ لوگ اپنے جانوروں کو (تیز چلانے کے لیے) خوب جھڑک رہے ہیں اور ان کی پٹائی کر رہے ہیں اور اونٹوں کو آواز دے رہے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے اپنے کوڑے کے ذریعہ سے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اے لوگو! سکون اور اطمینان کو لازم پکڑو، اپنے جانوروں کو جھڑک کر اور ان کی پٹائی کر کے جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ جانوروں کو تیز دوڑانا کوئی عبادت اور نیکی نہیں ہے۔

باب اکرام الضیف

مہمان کا اعزاز و اکرام کرنا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عمل

مہمان نوازی بھی آداب میں سے ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ﴾ کیا آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باعزت مہمانوں کا قصہ پہنچا؟ جب وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے حضرت کو سلام کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی سلام کیا (اور دل میں سوچا) نئے لوگ معلوم ہوتے ہیں، جانے پہچانے لوگ نہیں ہیں، شناسائیں ہیں۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام دھیرے سے اپنے گھر والوں کے پاس سرک گئے، اور تازہ بھنا ہوا کچھڑا لے کر آئے، اپنے مہمانوں کے سامنے پیش کیا اور فرمانے لگے: ﴿أَلَا تَأْكُلُونَ﴾ کھاتے نہیں؟ یہ آیت کریمہ لا کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مہمان نوازی والا عمل بتلایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبی و علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس ان کے یہاں پیدا ہونے والے بچے کی بشارت دینے کے لیے تین فرشتے حضرت جبریل، حضرت میکائیل اور حضرت اسرافیل علیہم السلام کو انسانی شکلوں میں بھیجا تھا۔ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ علیہا السلام بھی بوڑھی ہو چکی تھیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام خود بھی بڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکے تھے، مگر اللہ تعالیٰ کو ان دونوں کو بیٹا دینا منظور رہتا جس کی بشارت دینے کے لیے ان تین فرشتوں کو بھیجا اور یہ تینوں انسانی شکل میں ان کے گھر مہمان بن کر پہنچے، حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو پہچان نہیں پائے، بلکہ سمجھے کہ کوئی انسان ہیں جو ہمارے یہاں مہمان آئے ہیں۔ اس لیے کہ آنے والے دونوں قسم کے ہوتے ہیں، بعض ایسے ہوتے ہیں جن سے پہلے سے شناسائی اور جان پہچان ہوتی ہے، اور

بعضوں سے پہلے سے جان پہچان نہیں ہوتی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دل میں سوچا کہ آنے والے نئے معلوم ہوتے ہیں۔

تب مجوسی ایمان لے آیا

ویسے بھی مہمان نوازی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جاری فرمودہ سنت ہے، آپ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب کھانے بیٹھتے تھے تو جب تک کوئی مہمان نہیں ہوتا تھا تو وہاں تک کھانا حلق سے نہیں اترتا تھا، اگر کوئی مہمان نہیں ہوتا تھا تو مہمان تلاش کرنے کے لیے باہر نکلتے تھے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اسرائیلیات سے ایک قصہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ کوئی مہمان نہیں تھا تو اس کی جستجو اور تلاش میں نکلے، ایک مجوسی نظر آیا، اس کو ساتھ لے آئے، کھانے کے لیے ساتھ بٹھایا اور اس سے کہا: بسم اللہ کھو اور کھانا شروع کرو۔ اس نے کہا: کون اللہ؟ میں نہیں جانتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو اٹھا کر روانہ کر دیا۔ جب وہ باہر نکلا تو اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ: اے ابراہیم! ہم تو اس کو زندگی بھر کھلاتے رہے، اور تم سے ایک مرتبہ بھی کھلایا نہ گیا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام فوراً دوڑے اور اس کو سمجھا بھجا کر ساتھ لے آئے کہ میرے ساتھ ہی کھانا کھاؤ۔ اس نے کہا: جب تک مجھے یہ نہیں بتلاؤ گے کہ مجھے نکالا کیوں تھا، پھر دوبارہ بلا کر کیوں لائے؟ وہاں تک میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتلایا: تو نے اس اللہ کا نام نہیں لیا جس نے ہمیں پیدا کیا اور روزی دی، اس کے بہت سارے انعامات و احسانات ہیں، اسی کی نعمتیں ہم استعمال کرتے ہیں، تجھے اس کا نام لینا چاہیے، لیکن میں نے جب بسم اللہ پڑھنے کو کہا تو تو نے یہ جواب دیا کہ کون اللہ؟ میں نہیں جانتا، اس پر مجھے غصہ آیا اور میں

نے تجھے روانہ کر دیا، لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی بھیجی کہ میں تو اس کو ابتداءً زندگی سے آج تک کھلا رہا ہوں، تو میں تجھے بلا کر لے آیا؛ اب کھانا شروع کر۔ یہ سن کر وہ آدمی ایمان لے آیا۔

آیت سے مستفاد احکام

یہاں یہ آیت لا کر بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھئے! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے یہاں آنے والے ان مہمانوں کی میزبانی کا اتنا زیادہ اہتمام کیا کہ وہ آکر بیٹھے تو آہستہ سے ان کے پاس سے سرک گئے، اور بھونا ہوا تازہ بچھڑالا کر ان کے سامنے پیش کیا۔ ”فَوَاعٍ“ کا مطلب ہے: آدمی کا آہستہ سے سرک جانا، اس طرح اُٹھنا کہ پاس والوں کو پتہ بھی نہ چلے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب مہمان آئے تو فوری طور پر جو کچھ موجود ہو، اسی سے اس کا اکرام کرنا چاہیے، تکلف میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بعد میں مزید جو اہتمام ہو سکتا ہو وہ کر لے۔

”انہوں نے مہمانوں کے سامنے لا کر کھانا پیش کیا“ اس سے بعض حضرات یہ بھی استدلال کرتے ہیں کہ مہمانوں کو مکلف نہیں کرنا چاہیے کہ آپ چلئے، بلکہ وہ جہاں بیٹھے ہوں وہیں کھانا لا کر پیش کیا جائے۔

چوں کہ وہ فرشتے تھے اس لیے انہوں نے کھانے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھائے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو متوجہ کیا کہ کھاؤ، کیوں نہیں کھاتے؟ ان کے نہ کھانے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذرا خوف بھی محسوس کیا، اس لیے کہ اُس زمانہ کا رواج یہی تھا کہ کوئی کسی کے یہاں کسی برے ارادہ سے جاتا تو اس کے یہاں کا کھانا نہیں کھاتا تھا (آج کل تو اسی کا کھا کر اسی کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ خیر!) انہوں

نے کہا کہ: ہم تو فرشتے ہیں، ہم کھاتے پیتے نہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام کا مہمانوں کا اکرام

دوسری آیت پیش کی: ﴿وَجَاءَ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ﴾ یہی فرشتے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بیٹے کی بشارت دینے کے لیے آئے تھے، یہاں سے فارغ ہونے کے بعد حضرت لوط علی نبیا وعلیہ السلام کے پاس پہنچے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین میں قیام پذیر تھے، وہاں سے چند میل کے فاصلے پر حضرت لوط علیہ السلام کی آبادی تھی، فرشتے انسانی شکل میں بے ریش اور خوبصورت تھے، اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم لوطات کی برائی میں مبتلا تھی، ان خوبصورت شکل والے لڑکوں کو دیکھ کر وہ لوگ اپنے جذبات لے کر دوڑے ہوئے آئے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے ان لوگوں سے کہا کہ: تمہارے گھروں میں جو تمہاری بیویاں ہیں وہ میری بیٹیوں کا درجہ رکھتی ہیں، وہ تمہارے لیے پاکیزہ اور حلال ہیں، ان سے اپنی ضرورت پوری کرو۔ یہ میرے مہمان ہیں، ان کے معاملہ میں تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی سمجھدار آدمی نہیں ہے؟ دیکھئے! حضرت لوط علیہ السلام نے اپنے مہمانوں کے اکرام کے معاملہ میں اتنا زیادہ اہتمام فرمایا اور قوم کی طرف سے کی جانے والی ناروا حرکت سے بچانے کی پوری کوشش کی، اس لیے اس آیت کو یہاں لائے ہیں۔

مہمان نوازی: ایمان کا تقاضہ

۷۰۶:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه أن النبي ﷺ قال: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ. وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ. وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْبُتْ. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے جو آدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔ اور جو آدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے (اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے) اور جو آدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ بھلی بات کہے یا خاموش رہے (یعنی اگر کچھ بولنا ہی ہو تو زبان سے بھلی بات بولے، ورنہ خاموشی اختیار کرے۔)

افادات:- مہمان نوازی ان صفات میں سے ہے جس کا اہتمام زمانہ جاہلیت میں بھی کیا جاتا تھا، اور نبی کریم ﷺ پر وحی کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے آپ جن کاموں کا خاص طور پر اہتمام فرماتے تھے؛ ان میں سے ایک کام یہ بھی تھا چنانچہ حدیث پاک میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ پر غار حراء میں سب سے پہلی وحی نازل ہوئی، حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ سے تین مرتبہ کہا کہ پڑھئے، آپ نے کہا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، تو انہوں نے آپ ﷺ کو دبوچا، اس کے بعد پھر آپ سے کہا تو آپ نے پڑھا، جب وہاں سے آپ ﷺ اپنے گھر پر واپس آئے تو بچوں کے زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ فرشتہ سے ملاقات ہوئی تھی، اس سے آپ کو اپنی جان کا اندیشہ لاحق ہوا، تو آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ”إِنِّي خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي“ مجھے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ اس وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے تسلی کے لیے جو باتیں ارشاد فرمائیں، ان میں یہ فرمایا تھا: ”كَلَّا! وَاللَّهِ لَا يُخْزِيكَ اللَّهُ أَبَدًا“ ہرگز نہیں! آپ کو اپنی جان کے متعلق فکر رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کریں گے ”إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ. وَتَحْمِلُ الْكَلَّ. وَتَقْرِي الضَّيْفَ“ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، ناتوانوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں (بخاری شریف) اس سے پتہ چلا

کہ مہمان نوازی ان خوبیوں میں سے ہے جن کا قدیم زمانہ سے اہتمام چلا آ رہا ہے، خود نبی کریم ﷺ نے بھی اس کی تاکید اور تعلیم فرمائی ہے۔ گویا ایمان کی علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اپنے مہمان کا اکرام کرے۔

آج کل تو لوگ ایسی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئے کہ اب تو یہ سب کام بھی بوجھ پڑتے ہیں، جب سے ٹی وی کی مصیبت آ گئی ہے تو مہمان کے آنے پر ناگواری کا اظہار کیا جاتا ہے، اگر آدمی ٹی وی دیکھنے بیٹھا ہو اور مہمان آ جائے تو اٹھ کر اس کی طرف توجہ کرنے کی بھی زحمت نہیں کرتا۔

مہمان اور میزبان کے لیے ہدایات

۷۰۷: وعن أَبِي شُرَيْحٍ خُوَيْلِدِ بْنِ عَمْرِو الْخُزَاعِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ جَائِزَتَهُ. قَالُوا: وَمَا جَائِزَتُهُ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: يَوْمُهُ وَلَيْلَتُهُ، وَالضِّيَافَةُ ثَلَاثَةُ أَيَّامٍ، فَمَا كَانَ وَرَاءَ ذَلِكَ فَهُوَ صَدَقَةٌ عَلَيْهِ. (متفق عليه)

وفی روایۃ لبسلیم: لَا يَجِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يُقِيمَ عِنْدَ أَخِيهِ حَتَّى يُؤْثَمَهُ. قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَكَيْفَ يُؤْثَمُهُ؟ قَالَ: يُقِيمُ عِنْدَهُ، وَلَا شَيْءَ لَهُ يُقْرِيه بِهِ.

ترجمہ مع تشریح:۔ حضرت ابو شریح خویلد بن عمرو خزاعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے

ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جو آدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اور خصوصی اہتمام کرے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! خصوصی اہتمام کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک دن اور رات (گویا مہمان کی آمد پر دو وقت اس کے اکرام کے لیے کوئی مخصوص چیز (Special

(Item) بنانی چاہیے، اسی کو 'جائزہ' سے تعبیر کیا گیا) ویسے میزبانی تین دن ہے (باقی دو دن کوئی خاص تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جو خود دکھاتا ہے وہی مہمان کو کھلائے۔ ہاں! ایک دن مہمان کے لیے اس کا اکرام کرتے ہوئے تکلف بھی کرے) تین دن کے بعد مہمان کا کوئی حق نہیں ہے، اس کے بعد بھی میزبان اس کو کھلاتا پلاتا رہے، تو وہ اس کی طرف سے ایک طرح کا صدقہ سمجھا جائے گا۔

(اسی بات کو دوسری روایت میں اس طرح فرمایا گیا ہے کہ) کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے بھائی کے یہاں اتنا ٹھہرے کہ اپنے بھائی کو گناہ میں ڈال دے (یعنی مہمان بن کر گئے تو واپس جانے کا نام ہی نہیں لیتے، بور یا بستر لے کر فیوی کول لگا کر وہیں جم کر پڑ گئے) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! گناہ میں کیسے ڈالے گا؟ تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کے یہاں اتنا قیام کرے کہ اس کے پاس میزبانی کے لئے کچھ بھی نہ رہے، پھر وہ بے چارہ قرض لینے یا کوئی دوسری شکل اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ مہمان کو کسی کے یہاں زیادہ سے زیادہ تین دن قیام کرنا چاہیے، اس سے زیادہ نہیں۔ ہاں! صاحب خانہ یا جس کے یہاں آپ گئے ہیں اس کے ساتھ آپ کے مراسم ایسے ہیں کہ وہ خود اصرار بھی کرتا ہے، اور آپ کا اس کے یہاں ٹھہرنا اس کو ناگوار نہیں گزرتا بلکہ وہ خوش ہوتا ہے، تو اس صورت میں حکم بدل جائے گا۔ ورنہ اصل حکم تو یہی ہے کہ کسی کے یہاں زیادہ سے زیادہ تین دن قیام کرے، اس سے زیادہ نہیں۔

إستحباب التبشیر والتهنئة بالخیر

کسی کو مبارک باد دینے کا پسندیدہ ہونا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِیْنَ یَسْتَعِیْبُوْنَ الْقَوْلَ فِیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ

مبارک باد دینا پسندیدہ ہے

کسی کے دل کو خوش کرنا دیکھنے میں ایک چھوٹی سی چیز ہے، لیکن شریعت کی نگاہوں میں بہت بڑی نیکی ہے۔ اور آدمی جن مختلف طریقوں سے نیکی حاصل کر سکتا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی ایسی خوش کن خبر جو سامنے والے کے لیے مسرت اور خوشی کا باعث ہو اس کو بشارت کے طور پر سامنے والے کو سنانا؛ تاکہ اس کا جی خوش ہو، اور کسی اچھی بات پر مبارک باد دینا؛ یہ بھی اسلام کی نگاہ میں محبوب اور پسندیدہ ہے۔

اگر اس پر عمل ہو جائے!

آج کل دلوں میں حسد، بغض اور کینہ کے نتیجہ میں ہم لوگوں کا مزاج ایسا بنا ہوا ہے کہ ہمارے ساتھ رہنے والے کسی بھائی کے یہاں کوئی ایسی بات پیش آئے جو اس کے لیے باعثِ مسرت ہو، تو ہم اس کو مبارک باد دینے میں جھجھک محسوس کرتے ہیں۔ حالاں کہ ایسے موقع پر اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ آپ خوشی کے موقع پر اس کو مبارک باد دیجئے، اور اگر یہ خوشی کی اطلاع اس تک نہیں پہنچی ہے تو آپ جلدی سے اس اطلاع کو اس تک پہنچا کر اس کا جی خوش کیجئے۔ یہ بھی ایک مسلمان کا حق ہے، اور اسلام نے یہ تعلیم دی ہے، اگر ان تعلیمات پر عمل عام ہو جائے تو اس کی وجہ سے دلوں میں ایک دوسرے کے متعلق جو میل، عداوت، بغض اور کینہ ہوتا ہے وہ سب ختم ہو جائے۔

اسلامی معاشرے کو باہم جوڑنے والی

قدیم زمانہ میں ہمارے یہاں اس کارواج تھا اور آج بھی جہاں سادگی ہے وہاں اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ گھروں میں جہاں قریبی تعلق ہوتا ہے وہاں بھی اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے، مثلاً: کسی کے یہاں بیٹا پیدا ہوا تو لوگ کوشش کرتے ہیں کہ بچہ کے باپ کو جلدی سے خوشخبری سنا کر اس سے کچھ ہدیہ وصول کریں۔ خوشخبری سنانے والے کا جی خوش کرنا بھی ثابت ہے اور اس کی بھی تاکید آئی ہے، ایسا آج کل بھی ہوتا ہے، لیکن ہم نے اس کو صرف اپنے ہی گھر کے اندر محدود کر رکھا ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ ایک مسلمان بھائی کا رشتہ دوسرے مسلمان بھائی کے ساتھ وہی ہے جو ایک انسان کا اپنے سگے بھائی کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ تو جیسے وہاں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے، وہی معاملہ اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ بھی ہونا چاہیے۔ جیسے کسی نے ملازمت کے لیے درخواست دے رکھی تھی، اور آپ کو پتہ چل گیا کہ اس کی ملازمت لگ گئی، تو آپ فوراً بھاگے دوڑے اس کے پاس جائیے اور اس کو خوشخبری سنائیے، اس سے اس کا جی خوش ہو جائے گا، اور وہ یہ سمجھے گا کہ اس کی اس خوشی میں آپ بھی اس کے ساتھ شریک ہیں۔ یہ چیز اسلامی معاشرے کو آپس میں جوڑنے والی ہے۔

ہمارے آداب اہل یورپ نے اپنالئے

اسلام نے یہی سب آداب ہمیں سکھائے ہیں، لیکن ہم ان آداب کو بھول گئے اور یورپین تہذیب میں وہ لوگ انہیں آداب کو اپناتے جا رہے ہیں اور خوش کن خبر کو اس انداز سے پیش کرنے کا بڑا اہتمام کرتے ہیں، حالاں کہ وہ ایک نمائش ہوتی ہے۔ ایک صاحب اپنا قصہ سنانے لگے کہ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک گئے، جب وہاں

اترے اور امیگریشن کے اندر پار سپورٹ دیا، تو چوں کہ پار سپورٹ پر ولادت کی تاریخ (Birth date) لکھی ہوئی ہوتی ہے، تو اتفاق کی بات کہ وہ جس روز وہاں پہنچے وہی ان کی تاریخ پیدائش تھی۔ کاؤنٹر پر جس نے ان کا پار سپورٹ لیا اس نے سب سے پہلے ان کو مبارک باد دی کہ آج آپ کا برتھ ڈے (Birth day) ہے، ہماری طرف سے مبارک باد قبول کیجئے، حالاں کہ اس کا اس سے نہ کوئی رشتہ تھا، نہ وہ اس کا پڑوسی تھا، اور نہ کوئی تعلق تھا، ایک نووارد اس ملک میں گیا تھا لیکن وہ لوگ ان چیزوں کا بڑا اہتمام کرتے ہیں۔ اور آج ہم الٹا کرتے ہیں، ہمارے یہاں ان چیزوں کا اہتمام تو دور کی بات رہی، بلکہ اس بات کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی کی خوشی کی بات کو دبایا جائے، حالاں کہ اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ کسی کی خوشی کے موقع پر آدمی خوشی کا اظہار کرے تاکہ اپنے مسلمان بھائی کے سامنے یہ ظاہر ہو کہ میری خوشی پر وہ بھی خوش ہے، اس سے اس کی خوشی دو بالا اور دو گنی ہو جائے گی، اس کی مسرت میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور مقصد تو یہی ہے۔ یہی چیز اسلامی معاشرے اور سماج کو قوت پہنچانے والی ہے۔

اپنا بنانے کا گر

پھر اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ ایک دوسرے کی مصیبت کے موقع پر بھی وہ آپس میں کام آئیں گے۔ آپ کسی کی خوشی کے موقع پر کسی کے ساتھ شرکت کریں گے تو یقیناً آپ کی غمی کے موقع پر وہ آپ کے ساتھ شریک ہونا پسند کرے گا۔ وہ یاد رکھے گا کہ فلاں خوشی کے موقع پر آپ نے مبارک باد دی تھی، تو اگر آپ پر کوئی آڑا وقت آ گیا تو وہ دوڑا ہوا آئے گا، حالاں کہ وہ ایک معمولی بات تھی کہ آپ نے ذرا سا خوشی کا اظہار کیا تھا، لیکن اس عمل سے آپ نے اس کو اپنا بنالیا۔

قرآنی دلائل

یہی تعلیمات اور زندگی کے آداب ہیں جو ہمیں سکھائے جا رہے ہیں، انہی تعلیمات کو اس باب میں بتلاتے ہیں کہ کسی کو خوشی کے موقع پر بشارت سنانا مستحب و پسندیدہ ہے، اسلام کی نگاہوں میں یہ چیز اچھی ہے، اس کو انجام دینا چاہیے، اسی کی تلقین کی گئی اور ترغیب دی گئی ہے۔ اس موقع پر قرآن پاک کی بہت ساری آیتیں پیش کی ہیں، جن میں بشارت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے: ﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ﴾ باری تعالیٰ حضور اکرم ﷺ سے فرماتے ہیں کہ میرے وہ بندے جو میرے کلام کو سن کر اس کی پیروی کرتے اور اس پر عمل کا اہتمام کرتے ہیں آپ ان کو بشارت سنا دیجئے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس کے احکام پر عمل کرنے کی توفیق دی، اس پر اللہ تعالیٰ آپ کو اجر و ثواب اور جنت عطا فرمائے گا۔

﴿يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَدَّاتٍ لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ﴾ جنتیوں کو اللہ تعالیٰ بشارت سنائیں گے اپنی خاص رحمتوں اور رضامندی اور باغات کی، جن میں ان کو اور بھی نعمتیں ملیں گی اور ہمیشہ کا ٹھکانہ ملے گا۔ گویا یہ وہ کام ہے جس کو خود اللہ تعالیٰ بھی کریں گے کہ اپنے بندوں کو خوش کرنے کے لیے اپنی طرف سے خوشخبریاں سنائیں گے۔ جیسے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیٹے کے کامیاب ہونے کی اطلاع آئی تو باپ کہتا ہے کہ کوئی اس کو نہ بتائے، میں خود بتاؤں گا۔ اس کے دل میں بیٹے کی قدر ہوتی ہے، وہ اس کو خوش کرنا اور اس کو اعزاز دینا چاہتا ہے تو اپنی طرف سے اس کو اطلاع دینے کا اہتمام کرتا ہے۔ جب باری تعالیٰ اپنے بندوں کو اعزاز دینا چاہتا ہے تو ان کو ایسی بشارت خود ہی سناتا ہے۔

﴿وَأَبَشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ﴾ قیامت کے روز باری تعالیٰ اہل ایمان سے فرمائیں گے: خوشخبری سن لو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا کہ اگر نیک کام کرو گے تو جنت ملے گی، تو آج دیکھ لو، یہ مل رہی ہے، اب خوش ہو جاؤ۔

﴿فَبَشِّرْ نَاكًا بِغُلَامٍ حَلِيمٍ﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹا ہونے کی خوشخبری فرشتوں کے ذریعہ سنائی اس کو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَبَشِّرْ نَاكًا﴾ ہم نے بشارت دی۔ یعنی یہ اطلاع دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بھیجا تھا، گویا بشارت دینے والے اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔

قرآن پاک کی ان آیتوں کے ذریعہ سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ کی ذات تو بے نیاز ہے، لیکن اپنے خلیل کے ساتھ محبت کا اظہار کرنے اور ان کے اعزاز کے واسطے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتنا اہتمام کیا جا رہا ہے! تو ہمیں بھی آپس میں ان چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے، یہی چیز آپس کے تعلقات کو بڑھانے والی اور محبت میں اضافہ کرنے والی ہے۔

﴿وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَى﴾ ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت اور خوشخبری لے کر آئے۔ باری تعالیٰ نے ان کو خوشخبری سنانے کے لیے باقاعدہ فرشتے بھیجے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر آپ بھی کسی کو کوئی خوشخبری سنانے کے لیے ٹیلیفون، خط، ٹیلی گرام، یا آدمی بھیجنے کا اہتمام کریں؛ تو یہ ثابت ہے، خود باری تعالیٰ قرآن پاک میں فرما رہے ہیں۔ ﴿وَأَمَرَ أَنَّهُ قَالِمٌ فَضَحِكْتُ فَبَشِّرْ نَاكًا بِاسْمِهِ﴾ وَمِنْ وَرَاءِ اسْمِهِ ﴿فِي يَعْقُوبَ﴾ فرشتے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں مہمان بن کر بیٹے کی بشارت سنانے کے لیے آئے؛ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ حضرت سارہ بھی مہمانوں کی خدمت کے لیے (پردہ کی آڑ میں) موجود تھیں، وہ ہنسیں،

اور ہم نے ان کو حضرت اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت سنائی اور ان کے یہاں جو بیٹا پیدا ہوگا اس کا نام یعقوب ہوگا۔ ﴿فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ﴾ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کے یہاں بیٹا یحییٰ پیدا ہونے کی بشارت فرشتوں کے ذریعہ سے دلوائی۔

یہ ساری آیتیں لاکر بتلانا چاہتے ہیں کہ یہ خوشخبری سنا کر کتنا عمدہ کام ہے کہ اللہ تعالیٰ خود بھی اس کا اہتمام کر رہے ہیں، تو ظاہر ہے ہمیں بھی ان چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

ایک موتی کے مکان کی خوشخبری

۷۰۸:- عن أبي إبراهيم، ويقال: أبو محمد، ويقال: أبو معاوية عبد الله بن أوفى رضي الله عنهما أن رسول الله ﷺ بَشَّرَ حَدِيحَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا بِبَيْتٍ فِي الْجَنَّةِ مِنْ قَصَبٍ لَأَصْحَبٍ فِيهِ، وَلَا نَصَبٍ. (متفق عليه).

((الْقَصَبُ)): هُنَا اللَّوْلُؤُ الْمَجَوْفُ. و((الصَّخْبُ)): الصِّيَاخُ وَاللَّعْطُ و((النَّصَبُ)): التَّعَبُ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو جنت کے اندر ایک ایسے مکان کی خوشخبری سنائی جو ایسے موتی کا بنا ہوا ہوگا جو اندر سے کھوکھلا ہوگا (یعنی اس مکان کے چاروں طرف موتی کا خول چڑھا ہوا ہوگا) جس میں نہ کوئی شور و غلب ہوگا اور نہ کوئی تھکن ہوگی (بڑے سکون سے وہاں زندگی گزرے گی)۔

افادات:- نبی کریم ﷺ جب غار حراء میں عبادت میں مشغول ہوتے تھے تو موقع بموقع حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو ٹھن پینچانے کا کام کرتی تھیں یعنی حضور ﷺ کو توشہ پہنچاتی تھیں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام غار حراء

میں نبی کریم ﷺ کے پاس موجود تھے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا توشہ لے کر آ رہی تھیں، حضرت جبریل علیہ السلام نے جب ان کو آتے ہوئے دیکھا تو حضور ﷺ سے کہا: باری تعالیٰ ان کو سلام فرماتے ہیں، آپ ان کو سلام پہنچا دیجئے اور بشارت سنا دیجئے کہ باری تعالیٰ ان کو جنت میں ایک ہی موتی سے بنا ہوا محل عطا فرمائیں گے، ایسا محل جس میں کوئی شور و شغب اور تھکن نہیں ہوگی۔ (بخاری شریف: باب تَزْوِجِ النَّبِيِّ ﷺ حَاجَةً وَفَضْلَهَا)

اس سے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مقام معلوم ہوتا ہے۔ اور اُمہات المؤمنین میں ان کا مقام سب سے اونچا ہے، حضور اکرم ﷺ ہمیشہ ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مناقب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے نبی کریم ﷺ کی ازواج میں کسی عورت پر اتنی غیرت نہیں آتی جتنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر آتی تھی، حالاں کہ ان کا انتقال میرے آپ ﷺ کے نکاح میں آنے سے پہلے ہو چکا تھا، لیکن حضور ﷺ ان کا اتنی کثرت سے تذکرہ فرماتے تھے کہ مجھے ان پر رشک آتا تھا اور غیرت آتی تھی۔ (بخاری: باب تَزْوِجِ النَّبِيِّ ﷺ حَاجَةً وَفَضْلَهَا)

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے نکاح میں آنے سے پہلے باری باری دوسروں کے نکاح میں رہی تھیں، جس وقت حضور ﷺ کے نکاح میں آئیں اس وقت آپ ﷺ کی عمر شریف پچیس (۲۵) سال تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس (۴۰) سال تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ کبھی حضور اکرم ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ بڑی محبت سے فرماتے تو میں کہتی: اُس بڑھیا کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک جوان عورت عطا فرمائی ہے، تو حضور ﷺ فرماتے: میری تمام اولاد انہی سے ہیں

(بخاری شریف: باب تزویج النبی ﷺ حَدِّ يَحْيَى وَفَضْلُهَا) حضور اکرم ﷺ کی تمام اولاد سوائے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انہی سے ہیں۔ حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھے، باقی چاروں بیٹیاں اور سب صاحبزادے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہیں۔ اور حضور اکرم ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لانے والی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ حضور اکرم ﷺ کو تسلی دینے والی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ اپنا سب مال حضور ﷺ کے لیے قربان کرنے والی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ انہی کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کو بڑی تقویت رہی۔ ان کے انتقال والے سال ہی ابوطالب کا بھی انتقال ہوا جس کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ کو بڑی پریشانیوں کا سامنا ہوا۔

حضور اکرم ﷺ نے جنت کی بشارتیں سنائیں

۷۰۹:- وعن أبي موسى الأشعري رضي الله عنه أَنَّهُ تَوَضَّأَ فِي بَيْتِهِ، ثُمَّ خَرَجَ، فَقَالَ: لَا لَكُمْ مَنَّ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ. وَلَا كُونَنَّ مَعَهُ يَوْمَ هَذَا، فُجَاءَ الْمَسْجِدَ، فَسَأَلَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ. فَقَالُوا: وَجَّهَ هَاهُنَا، قَالَ: فَخَرَجْتُ عَلَى أَثَرِهِ أَسْأَلُ عَنْهُ، حَتَّى دَخَلْتُ بَيْتَ أَرِيْسٍ، فَجَلَسْتُ عِنْدَ الْبَابِ حَتَّى قَضَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ حَاجَتَهُ وَتَوَضَّأَ، فَقَبِضْتُ إِلَيْهِ فَإِذَا هُوَ قَدْ جَلَسَ عَلَى بَيْتِ أَرِيْسٍ وَتَوَسَّطَ قُفَّهَا، وَكَشَفَ عَنْ سَاقِيهِ وَدَلَّاهُمَا فِي الْبَيْتِ، فَسَلَبْتُ عَلَيْهِ ثُمَّ انْصَرَفْتُ، فَجَلَسْتُ عِنْدَ الْبَابِ، فَقُلْتُ: لَا كُونَنَّ بَوَّابَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ الْيَوْمَ، فُجَاءَ أَبُو بَكْرٍ رضي الله عنه فَدَفَعَ الْبَابَ، فَقُلْتُ: مَنْ هَذَا؟ فَقَالَ: أَبُو بَكْرٍ، فَقُلْتُ: عَلَى رِسْلِكَ، ثُمَّ ذَهَبْتُ، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ هَذَا أَبُو بَكْرٍ يَسْتَأْذِنُ. فَقَالَ: ائْذَنْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ. فَأَقْبَلْتُ حَتَّى قُلْتُ لِأَبِي بَكْرٍ: ادْخُلْ وَرَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُبَشِّرُكَ بِالْجَنَّةِ. فَدَخَلَ أَبُو بَكْرٍ حَتَّى جَلَسَ عَنِّي

يَمِينِ النَّبِيِّ ﷺ مَعَهُ فِي الْقَفِّ، وَذَلِكَ رَجُلِيهِ فِي الْبَيْتِ كَمَا صَنَعَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، وَكَشَفَ عَنْ سَاقِيهِ، ثُمَّ رَجَعْتُ وَجَلَسْتُ، وَقَدْ تَرَكْتُ أَخِي يَتَوَضَّأُ وَيَلْحَقُنِي، فَقُلْتُ: إِنَّ يُرِيدُ اللَّهُ بِفُلَانٍ - يُرِيدُ أَخَاهُ - خَيْرَ آيَاتٍ بِهِ، فَإِذَا الْإِنْسَانُ يُحْرِكُ الْبَابَ، فَقُلْتُ: مَنْ هَذَا؟ فَقَالَ: عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ، فَقُلْتُ: عَلَى رِسْلِكَ، ثُمَّ جِئْتُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ وَقُلْتُ: هَذَا عُمَرُ يَسْتَأْذِنُ. فَقَالَ: ائْذِنْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ. فَجِئْتُ عُمَرَ، فَقُلْتُ: أَذِنَ وَيُبَشِّرُكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِالْجَنَّةِ، فَدَخَلَ فَجَلَسَ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي الْقَفِّ عَنْ يَسَارِهِ وَذَلِكَ رَجُلِيهِ فِي الْبَيْتِ، ثُمَّ رَجَعْتُ فَجَلَسْتُ، فَقُلْتُ: إِنَّ يُرِيدُ اللَّهُ بِفُلَانٍ خَيْرًا - يَعْنِي أَخَاهُ - يَأْتِي بِهِ، فَجَاءَ الْإِنْسَانُ فَحَرَكَ الْبَابَ. فَقُلْتُ: مَنْ هَذَا؟ فَقَالَ: عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ. فَقُلْتُ: عَلَى رِسْلِكَ، وَجِئْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَأَخْبَرْتُهُ، فَقَالَ: ائْذِنْ لَهُ وَكَبِّشْهُ بِالْجَنَّةِ مَعَ بَلَوَى تُصِيبُهُ. فَجِئْتُ، فَقُلْتُ: ادْخُلْ وَيُبَشِّرُكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِالْجَنَّةِ مَعَ بَلَوَى تُصِيبُكَ فَدَخَلَ فَوَجَدَ الْقَفَّ قَدْ مَلِئَ، فَجَلَسَ وَجَاهَهُمْ مِنَ الشَّقِ الْأَخْرِ.

قَالَ سَعِيدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ: فَأَوَّلَتْهَا قُبُورُهُمْ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

وزاد فی روایہ: وأمرني رسول الله ﷺ بحفظ الباب. وفيها: أَنَّ عُثْمَانَ حِينَ بَشَّرَهُ حَمْدُ اللَّهِ تَعَالَى، ثُمَّ قَالَ: اللَّهُ الْمُسْتَعَانُ.

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ اپنے گھر میں وضو کیا، پھر گھر سے باہر آئے اور اپنے جی میں سوچا کہ آج کے پورے دن میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ہی رہوں گا۔ چنانچہ اسی ارادہ سے وہ مسجد نبوی میں حاضر ہوئے، لوگوں سے پوچھا: حضور ﷺ کہاں ہیں؟ لوگوں نے بتلایا کہ اس طرف تشریف لے گئے ہیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جو سمت مجھے بتلائی گئی تھی میں اس طرف چلا اور لوگوں سے پوچھتا جاتا تھا کہ حضور اس طرف

آئے، تو کہاں ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ حضور ﷺ میرا ریس میں داخل ہوئے ہیں (مسجد قباء کے سامنے ایک باغ تھا اسی میں ایک کنواں تھا، اس کنویں کا نام بئر اریس تھا نبی کریم ﷺ کبھی کبھار اس باغ میں تشریف لے جاتے اور اس کنویں کا پانی نوش فرماتے اور اس کنویں کے کنارے سے اپنے پاؤں کنویں کے اندر لٹکا کر سکون و راحت حاصل کرنے کے لیے بیٹھتے، اس روز بھی حضور ﷺ وہیں تشریف لے گئے تو حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ) میں اس باغ کے پاس پہنچ کر اس کے دروازے پر بیٹھ گیا، نبی کریم ﷺ اسی باغ میں کچھ دور اپنی حاجت پوری فرمانے کے لیے تشریف لے گئے تھے، یہاں تک کہ جب آپ قضائے حاجت کے بعد واپس تشریف لائے اور وضو فرمایا تو میں اُٹھ کر حضور کے پاس پہنچا، اس وقت حضور اکرم ﷺ کنویں پر آ کر تشریف فرما ہو چکے تھے، اور آپ نے اس کے ایک طرف بیٹھ کر اپنی پنڈلیاں کھول کر کنویں میں پاؤں لٹکا رکھے تھے۔ میں نے سلام کیا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر آپ اجازت دیں تو میں پہرہ داری کروں کہ باغ کے دروازہ پر بیٹھوں اور آپ کی اجازت کے بغیر کسی کو اندر نہ آنے دوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ خود حضور ﷺ نے ان کو دربانی کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ دروازہ کے پاس بیٹھ گئے، اور اپنے جی میں طے کر لیا کہ آج میں حضور ﷺ کی دربانی کے فرائض انجام دوں گا۔ کچھ دیر بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے اور دروازہ کو دھکا دیا۔ میں نے پوچھا: کون؟ انہوں نے کہا: ابو بکر۔ میں نے کہا: آپ ٹھہر جائیے، ابھی اندر نہیں آ سکتے، پہلے میں حضور اکرم ﷺ سے اجازت لے لوں۔ پھر میں حضور ﷺ کے پاس گیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! ابو بکر اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ان کو اندر آنے کی اجازت دو، اور جنت کی خوشخبری بھی سناؤ۔ (بس! یہاں تو یہ روایت اسی بات کو بتلانے کے لیے لائے ہیں کہ آپ نے خوشخبری سنانے کا فرمایا)۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں: میں دروازہ کی طرف آیا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: اندر تشریف لائیے اور حضور اکرم ﷺ نے آپ کو جنت کی خوشخبری دی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اندر آئے اور حضور اکرم ﷺ کنویں کے جس کنارے پر پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے تھے، وہیں آ کر حضور ﷺ کی دائیں طرف بیٹھ گئے، اور انہوں نے بھی اپنے پاؤں اسی طرح کنویں کے اندر لٹکادینے جس طرح حضور اکرم ﷺ نے لٹکائے تھے اور اپنی پنڈلیاں بھی اسی طرح کھول دیں جس طرح حضور اکرم ﷺ نے کھولی تھیں۔ حضرت ابو موسیٰ کہتے ہیں: پھر میں کنویں کے پاس سے لوٹ کر دروازہ کے پاس آیا اور بیٹھ گیا (چوں کہ ان کو تو آج درباری کرنی تھی) حضرت ابو موسیٰ کہتے ہیں: جس وقت میں گھر سے وضو کر کے نکلا تھا تو اپنے بھائی کو وضو کرتا ہوا چھوڑ آیا تھا، اس لیے میں نے اپنے جی میں سوچا کہ آج اگر اللہ تعالیٰ کو میرے بھائی کی بھلائی منظور ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو یہاں ضرور لائیں گے، اس لیے کہ آج تو حضور ﷺ جنت کی بشارت سنارہے ہیں، کاش! وہ بھی آجائے (اس سے معلوم ہوا کہ کوئی آدمی اپنے متعلقین میں سے کسی کے لیے ایسی چیز کی تمنا کرے تو پسندیدہ ہے) ابھی میں دل میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھا کہ کوئی دروازے کو دھک دے رہا ہے۔ میں نے پوچھا: بھائی! کون ہو؟ انہوں نے کہا: عمر بن خطاب ہوں۔ حضرت ابو موسیٰ نے کہا: ٹھہر جائیے، پھر حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور اطلاع دی کہ حضرت عمر دروازہ پر ہیں اور اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ان کو اندر آنے کی اجازت دیدو اور ان کو بھی جنت کی خوشخبری سنا دو۔ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ حضور ﷺ نے اندر آنے کی اجازت دی اور آپ کو جنت کی بشارت ارشاد فرمائی۔ چنانچہ وہ داخل ہوئے اور حضور ﷺ کی بائیں طرف بیٹھ گئے، اور انہوں نے بھی اپنے پاؤں کنویں میں لٹکادینے۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: پھر میں دروازہ کے پاس آیا اور بیٹھ گیا اور دل میں وہی تمنا کرنے لگا کہ کاش! میرا بھائی آجاتا، آج بڑا اچھا موقع ہے، اگر اللہ تعالیٰ کو اس کے لیے خیر منظور ہے تو ضرور اس کو بھیج دیں گے۔ اتنے

میں کوئی آدمی آیا اور دروازہ کھلانے لگا۔ میں نے پوچھا: کون ہو؟ انہوں نے جواب دیا: میں عثمان بن عفان ہوں۔ میں نے ان سے بھی کہا: بٹھہر جائیے، ابھی آپ اندر نہیں آسکتے۔ اس کے بعد میں حضور اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور اطلاع کی۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ان کو اندر آنے کی اجازت دو اور جنت کی بشارت سناؤ اس آزمائش کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ ان کی کریں گے۔ میں نے کہا: اندر آجائیے اور حضور اکرم ﷺ آپ کو جنت کی بشارت سنارہے ہیں اس آزمائش کے ساتھ جو آپ کو پہنچنے والی ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ بشارت سن کر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء فرمائی اور کہا اللہ تعالیٰ ہی مدد فرمانے والا ہے۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اندر تشریف لائے تو دیکھا کہ حضور اکرم ﷺ کنویں کے جس کنارہ پر تشریف فرما تھے وہ بھر چکا تھا، حضور کے دائیں بائیں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بیٹھ چکے تھے، وہاں بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی، اس لئے کنویں کے سامنے والے دوسرے کنارہ پر جو جگہ خالی تھی وہاں بیٹھ گئے۔

اس روایت کے نقل کرنے والے حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ (جو بڑے تابعی ہیں) فرماتے ہیں کہ اس روایت کا مطلب میں نے یہ لیا کہ ان حضرات کو جہاں جہاں بیٹھنے کا موقع ملا، وہ ان کی قبروں سے عبارت ہے۔

افادات:- اللہ تعالیٰ نے حضراتِ شیخین رضی اللہ عنہما کی قبریں تو نبی کریم ﷺ کے ساتھ اسی حجرہ شریفہ میں بننے دیں، اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر جنت البقیع میں ہے، لیکن اگر آپ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر پر جا کر کھڑے رہیں اور دیکھیں تو وہاں سے گنبدِ خضراء بالکل سامنے سیدھ میں نظر آئے گا، ذرا بھی ادھر ادھر نہیں ہے۔

میرے پہلے سفر حج کا واقعہ

میں پہلی مرتبہ جب حج میں گیا تھا تو وہاں ایک بڑے صالح بزرگ تھے،

مدت سے وہاں جماعت کے کام میں لگے ہوئے تھے، اور مدینہ منورہ کی ساری زیارت گاہوں سے خوب واقف تھے، اور چوں کہ اس سے اگلے سال ۹۷ھ میں ایک واقعہ پیش آیا تھا جس کی وجہ سے جماعت کے کام کرنے والوں پر بڑی سختی اور نگرانی تھی۔ جب میں مدینہ منورہ پہنچا تو میں نے ساتھیوں سے کہا کہ مسجد نبوی اور یہاں کی دوسری تاریخی جگہوں کی زیارت کرنا چاہتا ہوں، اگر کوئی واقف کار آدمی ہو تو رہنمائی ملے۔ مولانا اسماعیل صاحب بدات اور دوسرے ایک دو آدمیوں نے کہا کہ دھار (۴۱۲) (مہاراشٹر کے ایک علاقہ کا نام ہے) کے فلاں بڑے میاں ہیں وہ بہت اچھا بتلائیں گے، ان سے ملو۔ میں ان سے ملا، انہوں نے کہا: آج کل میری نگرانی ہو رہی ہے، تم اگر میرے سامنے بیٹھو گے تو تم بھی پکڑے جاؤ گے، اس لیے میرے پاس اس طرح بیٹھنا جیسے کوئی آدمی صف میں بیٹھتا ہے، میں تھوڑی تھوڑی چیزیں بتاتا رہوں گا۔ وہ مسجد نبوی کی چیزیں بتاتے اور پھر کہتے کہ جاؤ! تم دیکھ کر آؤ، میں دیکھ کر آتا اور رپورٹ دیتا کہ ایسی ایسی ہے، تو وہ کہتے کہ ہاں! ٹھیک ہے۔

ایک مرتبہ انہوں نے یہی قصہ سنایا، لیکن انہوں نے اس میں ایک چیز کا اضافہ کیا تھا، مجھے تو آج تک کسی روایت میں وہ چیز نہیں ملی، میں تلاش میں بھی ہوں کہ مل جائے۔ وہ اضافہ یہ تھا کہ اس کے بعد ایک اور آدمی آئے اور دروازہ کھٹکھٹایا، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا: کون ہو؟ آنے والے نے کہا: میں علی بن ابی طالب ہوں۔ انہوں نے کہا: یہاں سے گھر، میں حضور اکرم ﷺ سے اجازت لے لوں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری حضور ﷺ کے پاس پہنچے اور کہا کہ حضرت علیؓ اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ان کو جنت کی بشارت سنا دو اور اندر آنے کی اجازت نہیں ہے، چنانچہ ان کی قبر مدینہ منورہ میں نہیں بنی۔

حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کی قبور کی جو تعبیر فرمائی وہ یہ ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی قبریں تو بالکل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بنیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ میں نہیں ہیں، لیکن مدینہ منورہ ہی میں بالکل سامنے ہیں، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں نہیں بن پائی۔

خیر! یہاں تو بشارت سنانے کی مناسبت سے یہ روایت پیش کی ہے کہ دیکھو! حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جا کر یہ خوشخبریاں بڑے خوش ہو کر سناتے رہے۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ مجھے تو یہ خوشخبری نہیں دی جا رہی ہے تو پھر میں جا کر دوسروں کو کیوں سناؤں۔ ہمارے جیسے ہوتے تو ایسا ہی سوچتے کہ مجھے تو کوئی بشارت نہیں مل رہی، تو پھر یہ سارے چکر اور آئے پھیرے (پچھتائی) کیوں مارتا رہوں۔

یقین سے کلمہ پڑھنے پر جنت کی بشارت

۷۱۰:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: كُنَّا قُعُوداً حَوْلَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَمَعَنَا أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فِي نَفَرٍ، فَقَامَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنْ بَيْنِ أَظْهُرِنَا فَأَبْطَأَ عَلَيْنَا، وَخَشِينَا أَنْ يُقْتَطَعَ دُونَنَا وَفِرْعَانَا فَقُمْنَا، فَكُنْتُ أَوَّلَ مَنْ فَرَغَ، فَخَرَجْتُ أَتْبَعِي رَسُولَ اللَّهِ ﷺ حَتَّى أَتَيْتُ حَائِطًا لِلْأَنْصَارِ لِبَنِي النَّجَارِ، فَدُرْتُ بِهِ هَلْ أَجِدُ لَهُ أَبًا؟ فَلَمْ أَجِدْ! فَيَا ذَا رُبِّعٍ يَدْخُلُ فِي جَوْفِ حَائِطٍ مِنْ بَنِي خَارِجَةَ - وَالرَّبِّيعُ: الْجَدُولُ الصَّغِيرُ - فَاحْتَفَرْتُ، فَدَخَلْتُ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ: ((أَبُو هُرَيْرَةَ؟)) فَقُلْتُ: نَعَمْ، يَا رَسُولَ اللَّهِ، قَالَ: ((مَا شَأْنُكَ؟)) قُلْتُ: كُنْتُ بَيْنَ أَظْهُرِنَا فَقُمْتُ فَأَبْطَأَ عَلَيْنَا، فَخَشِينَا أَنْ تُقْتَطَعَ دُونَنَا، وَفِرْعَانَا، فَكُنْتُ أَوَّلَ مَنْ فَرَغَ، فَاتَيْتُ هَذَا الْحَائِطَ، فَاحْتَفَرْتُ كَمَا يُحْتَفَرُ الشَّعْلَبُ، وَهُوَ لَاءَ

النَّاسَ وَرَأَى. فَقَالَ: يَا أَبَاهُ رَيْرَةً. وَأَعْطَانِي نَعْلَيْهِ، فَقَالَ: اذْهَبْ بِنَعْلَيْ هَاتَيْنِ، فَمَنْ لَقِيتَ مِنْ وَرَاءِ هَذَا الْحَائِطِ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُسْتَبِقًا بِهَا قَلْبُهُ، فَدَبَّشُرُهُ بِالْجَنَّةِ..... وَذَكَرَ الْحَدِيثَ بِطَوْلِهِ.. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی کچھ صحابہ کے ساتھ موجود تھے کہ اچانک آپ ﷺ ہمارے درمیان سے اُٹھے اور آبادی سے باہر تشریف لے گئے، جب آپ نے واپس آنے میں دیر کر دی تو سب کو فکر لاحق ہوئی کہ پتہ نہیں کیا بات ہوئی، اس لیے سب آپ ﷺ کی تلاش و جستجو میں نکلے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے بے چینی مجھے پیدا ہوئی تھی اس لئے میں آپ کو تلاش کرنے کے لئے نکلا، یہاں تک کہ انصار کے قبیلہ بنو نجار کا ایک باغ تھا اُس کے متعلق مجھے خیال ہوا کہ آپ شاید اندر ہوں گے، تو میں اندر جانے کا راستہ ڈھونڈنے کے لیے اس باغ کے چاروں طرف چکر لگانے لگا، لیکن مجھے راستہ نہیں ملا، اس باغ میں پانی جانے کے لیے ایک چھوٹی سی نہر تھی جو مجھے نظر آئی تو میں نے اپنے جسم کو سکیڑا، جیسے لومڑی سکیڑتی ہے، اور اس چھوٹی سی نہر سے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ حضور اکرم ﷺ اس باغ میں تشریف فرما ہیں۔ جب حضور ﷺ نے مجھے دیکھا تو پوچھا: ابو ہریرہ ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! اے اللہ کے رسول۔ پوچھا: کیا بات ہے؟ یہاں کیوں آئے؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے، پھر اچانک اُٹھ گئے اور واپس آنے میں دیر ہو گئی تو ہم سب پریشان ہو گئے، اور ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچی ہو، اس لئے ہم سب بے چینی ہو گئے اور سب سے پہلے بے چینی مجھے ہوئی، اس لئے میں اس باغ میں اپنے جسم کو اس طرح سکیڑ کر اندر داخل ہوا جیسے لومڑی کسی جگہ گھسیتی ہے۔ دوسرے لوگ بھی میرے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں (جب نبی کریم ﷺ نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس بے چینی کو دیکھا اور ظاہر ہے کہ نبی

کریم ﷺ کے ساتھ تعلق و محبت کی بنا پر یہ بے چینی پیدا ہوئی تھی، تو نبی کریم ﷺ نے چاہا کہ اس کی تلافی ہو جائے اور ان کا جی خوش ہو جائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ (حضور ﷺ نے مجھے اپنے نعلین مبارک علامت اور نشانی کے طور پر عطا فرمائے اور ارشاد فرمایا: میرے یہ دونوں جوتے لے کر جاؤ اور اس باغ کے باہر جو بھی ایسا آدمی تمہیں ملے جو دل کے یقین کے ساتھ ”لا الہ الا اللہ“ کا اقرار کرتا ہو؛ اس کو جنت کی بشارت سنا دینا۔

افادات:- یہ روایت پہلے بھی آچکی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ نعلین مبارک لے کر باہر نکلے، سب سے پہلے ملاقات حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہو گئی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو خوشی خوشی جوتے لے کر جا رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: ابو ہریرہ! کیا بات ہے؟ کہا: نبی کریم ﷺ کے یہ جوتے ہیں جو آپ نے مجھے عنایت فرمائے ہیں اور مجھے یہ حکم دیا ہے کہ جو بھی لا الہ الا اللہ کا سچے دل سے اقرار کرنے والا تمہیں ملے؛ اس کو جنت کی بشارت سنا دو؛ تو لیجئے میں آپ کو جنت کی بشارت سناتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: ٹھہرو! اور واپس چلو۔ اب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تو حضور اکرم ﷺ نے بھیجا تھا اس لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کہنے سے واپس تھوڑے ہی لوٹے، انہوں نے واپس لوٹنے میں تاہل کیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے سینے پر ایک ہاتھ مارا جس سے وہ نیچے زمین پر گر پڑے۔ اب دیکھا کہ واپس لوٹنا ہی پڑے گا، لہذا لوٹے۔ آگے حضرت ابو ہریرہ اور پیچھے حضرت عمرؓ۔ حضور ﷺ کے پاس پہنچے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رو رہے تھے اور حضور ﷺ سے عرض کیا کہ: آپ کے ارشاد کے مطابق میں تو جا رہا تھا، راستہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مل گئے اور انہوں نے میرے سینے پر ایسے زور سے ہاتھ مارا کہ میں تو نیچے گر گیا اور مجھ سے کہا کہ ایسی بشارت مت سناؤ اور واپس لوٹو۔ اتنے میں حضرت عمرؓ بھی پہنچ گئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے ان کو اپنے

جوتے عنایت فرما کر بھیجا تھا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: جی ہاں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ایسی بشارت سنانے کے لیے بھیجا تھا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: جی ہاں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ایسا نہ کیجئے، لوگوں کو عمل کرنے دیجئے، کیوں کہ اگر صرف دل کے یقین کے ساتھ کلمہ پڑھ لینے پر جنت کی بشارت سن لیں گے، تو ہو سکتا ہے کہ عمل کے معاملہ میں کمزوری آجائے، لوگ یوں سوچنے لگیں کہ جنت تو مل ہی گئی ہے، حالاں کہ جنت کے تو بہت سے درجات ہیں، اس لیے یہ بشارت نہ سنائیے۔ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے، اگر مناسب نہیں ہے تو بشارت سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

نوٹ: یہ قصہ حدیث کے اصلاحی مضامین، جلد: ۷ / امید کے بیان میں آیا تھا، وہاں تفصیلی وضاحت کر چکا ہوں۔

مختصر آپ بیتی از حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۱:۷- وعن ابن شماسۃ، قَالَ: حَضَرَ نَاعِمَرُ بْنُ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَهُوَ فِي سِيَاقَةِ الْمَوْتِ، فَبَكَى طَوِيلًا، وَحَوَّلَ وَجْهَهُ إِلَى الْجِدَارِ، فَجَعَلَ ابْنُهُ يَقُولُ: يَا أَبَتَاهُ! أَمَا بَشَّرَكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِكَذَا؟ أَمَا بَشَّرَكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِكَذَا؟ فَأَقْبَلَ بِوَجْهِهِ، فَقَالَ: إِنَّ أَفْضَلَ مَا نَعِدُ شَهَادَةَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَأَنْ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ، إِنْ قَدْ كُنْتُ عَلَى أَطْبَاقٍ ثَلَاثٍ: لَقَدْ رَأَيْتُنِي وَمَا أَحَدٌ أَشَدُّ بُغْضًا لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ مِنِّي، وَلَا أَحَبَّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَكُونَ قَدِ اسْتَبَكَنْتُ مِنْهُ؛ فَقَتَلْتُهُ، فَلَوْ مِتُّ عَلَى تِلْكَ الْحَالِ، لَكُنْتُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ. فَلَمَّا جَعَلَ اللَّهُ الْإِسْلَامَ فِي قَلْبِي، أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَقُلْتُ: ابْسُطْ يَمِينَكَ فَلَأُبَايِعَكَ، فَبَسَطَ يَمِينَهُ، فَقَبَضْتُ يَدِي، فَقَالَ: ((مَا لَكَ يَا عَمْرُو؟)) قُلْتُ: أَرَدْتُ أَنْ أَشْتَرِطَ. قَالَ: ((تَشْتَرِطُ مَاذَا؟)) قُلْتُ: أَنْ يُغْفَرَ لِي، قَالَ: ((أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِيهِمْ مَا كَانَ قَبْلَهُ، وَأَنَّ الْهَجْرَةَ

تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا، وَأَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ)) وَمَا كَانَ أَحَدًا حَبَّ إِلَى
 مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَلَا أَجَلَ فِي عَيْنِي مِنْهُ وَمَا كُنْتُ أَطِيقُ أَنْ أَمْلَأَ عَيْنِي مِنْهُ،
 إِجْلَالًا لَهُ، وَلَوْ سَأَلْتُ أَنْ أَصِفَهُ مَا أَطَقْتُ، لِأَنِّي لَمْ أَكُنْ أَمْلَأُ عَيْنِي مِنْهُ، وَلَوْ مَسَّ
 عَلَى تِلْكَ الْحَالِ لَرَجَوْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ أَهْلِ الْجَنَّةِ. ثُمَّ وَلِينَا أَشْيَاءَ مَا أَدْرَى مَا
 حَالِي فِيهَا؛ فَإِذَا أَنَا مُتُّ فَلَا تَصْحَبِي نَائِحَةٌ وَلَا نَارٌ، فَإِذَا دَفَنْتُمُونِي، فَشْنُوا عَلَيَّ
 الثُّرَابَ شَدًّا، ثُمَّ أَقِيمُوا حَوْلَ قَبْرِي قَدَرَ مَا تُنَحَرُ جُزُورٌ، وَيُقَسَّمُ لَحْمُهَا، حَتَّى
 أَسْتَأْنِسَ بِكُمْ، وَأَنْظُرَ مَا أَرَا جُعِبَ بِهِ رَسُولُ رَبِّي. (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابن شماسہ فرماتے ہیں ہم لوگ حضرت عمرو بن
 عاص رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے، وہ بالکل موت کی گھڑی میں تھے، دیر تک روتے رہے، اپنا
 چہرہ دیواری کی طرف پھیر لیا، ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ (بھی صحابی ہیں)
 ان سے کہنے لگے: ابا جان! کیا آپ کو حضور اکرم ﷺ نے فلاں چیز کی بشارت نہیں دی؟ کیا
 حضور اکرم ﷺ نے فلاں چیز کی بشارت نہیں سنائی؟ (حضور اکرم ﷺ نے ان کو جو جو
 بشارتیں دی تھیں وہ یاد دلانے لگے، چوں کہ موت کا وقت تھا اور وہ رو رہے تھے، تو دل
 کے اندر امید پیدا کرنے کے لیے وہ ساری چیزیں یاد دلارہے تھے، یہ سن کر) انہوں نے
 اپنا چہرہ لوگوں کی طرف متوجہ کیا اور کہنے لگے: سب سے عمدہ چیز جو ہم نے اپنے ساتھ سامان کے طور
 پر لی ہے وہ کلمہ شہادت لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی ہے۔ پھر فرمانے لگے: میرے اوپر تین
 دور گزرے ہیں، ایک دور تو وہ ہت کہ نبی کریم ﷺ کی دشمنی میرے دل میں بھری ہوئی تھی،
 حضور ﷺ کا مجھ سے بڑا دشمن اور کوئی نہیں تھا، اُس زمانہ میں مجھے یہ چیز بہت پسند تھی کہ اگر مجھے
 موقع مل جائے تو میں آپ کو قتل کر دوں، اگر اس حالت میں میری موت آتی تو یقیناً میں جہنمی ہوتا۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی محبت ڈالی، تو میں حضور اکرم ﷺ کی

خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ اپنا دست مبارک آگے بڑھائیے، میں آپ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کرنا چاہتا ہوں (یعنی مسلمان ہونا چاہتا ہوں) جب حضور ﷺ نے اسلام کی بیعت لینے کے واسطے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا، تو میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا، حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے عمرو! کیا بات ہے؟ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں ایک شرط کرنا چاہتا ہوں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا شرط کرنا چاہتے ہو؟ کرو۔ میں نے کہا: اس شرط پر اسلام لاؤں گا کہ میرے سارے گناہ معاف ہو جائیں، اور میری مغفرت ہو جائے۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے عمرو! تمہیں معلوم نہیں کہ اسلام تو اپنے سے پہلے کے سارے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے، اور ہجرت اس سے پہلے کے سارے گناہوں کو مٹا دیتی ہے، اور حج بھی اس سے پہلے کئے ہوئے تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے (اس جگہ پر اسلام کے متعلق لکھا ہے کہ اسلام لانے سے تو اس کا نامہ اعمال ایک دم کلین و صاف ہو جاتا ہے، ایسا جیسا کہ آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو، لیکن ہجرت اور حج کے متعلق لکھا ہے کہ اس سے صغیرہ گناہ معاف ہوں گے، کبیرہ گناہ نہیں، اگرچہ بعضوں نے کبیرہ کے متعلق بھی لکھا ہے، لیکن راجح قول وہی ہے) پھر تو میرا یہ حال ہو گیا کہ حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے زیادہ محبوب اور باعزت میری نگاہوں میں اور کوئی نہیں رہا، بلکہ حضور ﷺ کا میرے دل میں اتنا زیادہ احترام تھا کہ میں آنکھیں بھر کر حضور ﷺ کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر کوئی مجھے پوچھے کہ حضور ﷺ کے چہرہ انور کی کیفیت بیان کرو تو میں بیان نہیں کر سکتا، کیوں کہ میں کبھی حضور اکرم ﷺ کو نظر بھر کر دیکھ ہی نہیں سکتا تھا؛ پھر کیسے بیان کروں؟ (جو چیز آدمی غور سے اور پورے اطمینان سے دیکھے اس کو بیان کر سکتا ہے، اور جس کو پورے اطمینان سے نہ دیکھ پاتا ہو، تو کیسے بیان کرے گا) اگر اس وقت میری موت آگئی ہوتی تو مجھے امید تھی کہ یقیناً میں جنتی ہوتا۔

اس کے بعد بہت سارے اختیارات ہمارے حوالے کئے گئے (یعنی بعد میں حکومت

ہمارے ہاتھ میں آئی، کچھ اختیارات استعمال کرنے کی نوبت آئی) اس کے بعد اب میں نہیں کہہ سکتا کہ میرا حال کیا ہے۔ اس لئے دیکھو! جب میری موت ہو جائے تو کوئی رونے والی عورت اور آگ میرے جنازہ کے ساتھ نہ جائے (زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ جب کسی کا جنازہ لے جاتے تھے، تو ساتھ میں آگ بھی لے جاتے تھے، اور رونے والی عورتیں سینہ اور چہرہ کوٹی ہوئی اور مرنے والے کی خوبیاں بیان کرتی ہوئی ساتھ میں چلتی تھیں، اس لیے انہوں نے تاکید کر دی کہ میرے ساتھ ایسا نہ ہو۔ بہت سی جگہوں پر غیر مسلموں میں آج بھی ایسا رواج ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ آدمی کے مرنے کے بعد اگر اس کے خاندان والوں کی طرف سے اس بات کا اندیشہ یا رواج ہو کہ وہ کسی بدعت کا ارتکاب کریں گے، تو اس کو چاہیے کہ تاکید کے ساتھ اس بات کی وصیت کر جائے کہ میرے مرنے کے بعد ایسا کچھ مت کرنا، اس کے بعد بھی اگر وہ کریں گے تو مرنے والے پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں رہے گی) اور جب مجھے دفن کر چکو تو میری قبر پر مٹی ڈال دینا، پھر میری قبر کے پاس اتنی دیر تک ٹھہرنا جتنی دیر میں ایک اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کر دیا جاتا ہے (تقریباً بیس پچیس منٹ) تاکہ تمہارے ذریعہ مجھے انس حاصل ہو، اور میں دیکھ لوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے فرشتوں کو میں کیا جواب دیتا ہوں۔ چونکہ دفن کے بعد فوراً فرشتے آتے ہیں تو اس وقت اہل خاندان کو چاہیے کہ قبر کے پاس بیس پچیس منٹ ٹھہریں اور کلمہ طیبہ کا ورد کریں، تلاوت قرآن میں مشغول رہیں اور مرنے والے کے لیے دعا کا اہتمام کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کو منکر نکیر کے سوال کے جواب میں ثبات قدمی نصیب کرے اور اس سے صحیح جواب دلوائے؛ یہ مناسب ہے، بہر حال! یہاں تو اس روایت کو اس بنیاد پر لائے ہیں کہ ان کے صاحبزادہ نے نبی کریم ﷺ کے ارشادات کے مطابق ان کو بشارت سنائی، اس سے معلوم ہوا کہ دوسروں کو خوشخبری دینا اور بشارت سننا ثابت ہے۔

باب وداع الصاحب ووصيته
 عند فراقه للسفر وغيره
 والدعاء له وطلب الدعاء منه
 اپنے کسی ساتھی اور دوست کو رخصت کرتے
 وقت نصیحت کرنا
 اس کے لیے دعا کرنا
 اور اس سے دعا کی درخواست کرنا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَوَصَّي بِهَا إِبْرَاهِيمَ بَنِيهِ وَيَعْقُوبَ يَا نَبِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ
فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُمْ مُسْلِمُونَ. أَمَرُ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ، إِذْ
قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي؟ قَالُوا نَعْبُدُ إِلَهَكَ وَإِلَهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ
وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (البقرة: ۱۳۳، ۱۳۲)

جدائی کے موقع کے چار آداب

باب کا عنوان ہے: اپنے ساتھی، عزیز، اپنی اولاد یا اپنے ملنے والوں کو جدائی کے موقع پر الوداع کہنا، اور جو نصیحت کی بات ان کے مناسب حال ہو وہ کہنا۔ جدائی چاہے سفر کی وجہ سے ہو، رہی ہو، پھر وہ سفر تجارتی ہو، حج کا ہو، تبلیغ کی غرض سے ہو، یا طلب علم کے لیے ہو، یا وہ جدائی کسی اور وجہ سے ہو رہی ہو، جیسے: ایک آدمی بالکل آخری گھڑی میں ہے اور وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اب میں دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جدائی چاہے وقتی ہو، یا مستقل ہو، جب بھی اپنے عزیزوں، رفقاء اور دوستوں سے جدائی کی گھڑی آئے، تو آداب میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ ان کو الوداع کہے، اور دوسرا ادب یہ ہے کہ ان کو وصیت، تاکید نصیحت اور بھلائی کی بات کہے جو ان کے مناسب حال ہو۔

”وصیت“ دراصل اس نصیحت کی بات کو کہتے ہیں جو کوئی آدمی کسی کو رخصت کے وقت کرتا ہے۔ ویسے روزانہ عام حالات میں جو کہا جاتا ہے اس کو نصیحت کہیں گے، لیکن یہی نصیحت کی بات جب جدائی کے موقع پر۔ چاہے جدائی وقتی ہو یا ہمیشہ کی ہو۔ کہی جاتی ہے تو اس کو ”وصیت“ سے تعبیر کرتے ہیں جس میں تاکید زیادہ ہوا کرتی ہے۔

تو یہ چاروں چیزیں آداب میں سے ہیں:-

۱:- الوداع کہنا۔

۲:- کچھ نصیحت کرنا۔

۳:- اس کے لیے دعا کرنا۔

۴:- اپنے واسطے اس سے دعا کی درخواست کرنا۔

ان کا بھی ہمیں اپنی زندگیوں میں اہتمام کرنا چاہیے، اسی کو بتلانے کے لیے یہ باب قائم کیا ہے۔

دو پیغمبروں کی اپنے بیٹوں کو وصیت

اس سلسلہ میں سورہ بقرہ کی دو آیتیں پیش کی ہیں۔ حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علی نبینا علیہما الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کو دین پر قائم رہنے اور کلمہ کو مضبوطی سے پکڑنے کی وصیت کی تھی، چنانچہ ان کی وصیت کے الفاظ ذکر کیے: اے میرے بیٹو! اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا ہے (تم کو دین اسلام کی توفیق عطا فرمائی، اس کی ہدایت عطا فرمائی جس کی وجہ سے تم نے اس دین کو قبول کیا، اور اب تک اسی پر قائم ہو، اسی پر عمل کر رہے ہو) تو اب تمہاری موت نہ آئے مگر ایسی حالت میں کہ تم اسلام ہی پر قائم ہوؤ۔ گویا دین اسلام کو مضبوطی سے تھامے رہنا، اور مضبوطی سے تھامنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اپنی زندگیوں میں عملی جامہ پہناؤ کہ تمہارا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا، چلنا پھرنا، غرضیکہ تمہاری ہر حرکت و سکون اور تمہارا ہر کام اسی کے مطابق ہو، تب ہی کہا جائے گا کہ تم اس کو مضبوطی کے ساتھ تھامے ہوئے ہو۔

اور پھر اسی حال میں تمہیں موت آئے، اس لیے کہ اگر آدمی یہ چاہتا ہے کہ فلاں

حالت میں مجھے موت آئے، تو ظاہر ہے کہ موت کا کوئی وقت اور گھڑی مقرر نہیں ہے، کسی کے متعلق بھی گارنٹی کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کون سے دن، کون سی گھڑی میں، کتنے بجے موت آنے والی ہے۔ لہذا اگر کوئی یہ چاہتا ہو کہ اس کی موت ایمان پر آئے تو اس کو چاہیے کہ ایمان کو ہمیشہ تھامے رہے، اور ایسا طریقہ اختیار کرے کہ کسی حال میں بھی اپنے آپ کو ایمان سے جدا نہ ہونے دے، اس لیے کہ معلوم نہیں کب موت آجائے۔ جب ایمان کو ہمیشہ کے لیے تھامے رکھے گا، تو ظاہر ہے کہ جب بھی موت آئے گی اسی حالت میں آئے گی۔ جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے: ”تَمُوتُونَ كَمَا تَعِيشُونَ، وَتُحْضَرُونَ كَمَا تَمُوتُونَ“ (تفسیر روح البیان) ”موت اسی حالت میں آئے گی جس حالت میں تم زندگی گزارتے ہو، اور جس حالت میں موت آئے گی اسی میں تم اٹھائے جاؤ گے۔ کوئی آدمی اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کی حالت میں زندگی گزارتا ہے، تو موت بھی اسی حالت میں آئے گی۔ اور اگر کوئی آدمی معصیت اور نافرمانی کی حالت میں زندگی گزارتا ہے، گناہوں میں لت پت ہے، اسی میں مشغول ہے تو ظاہر ہے کہ موت بھی اسی حالت میں آئے گی۔ اس لیے اگر آپ چاہتے ہیں کہ اچھی حالت میں موت آئے، تو اپنا حال درست کر لو، پھر اسی حال پر مرو گے۔ اور جس حالت میں موت آئے گی اسی حالت میں تم اٹھائے جاؤ گے۔ اگر اچھی حالت میں موت آئی ہے تو اچھی حالت میں اٹھائے جاؤ گے اور اگر خدا نخواستہ بری حالت میں موت آئی ہے تو بری حالت میں اٹھائے جاؤ گے۔

دیکھو! حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علی نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کو جو وصیت فرمائی، اپنی موت کے وقت جو تاکید فرمائی وہ یہ تھی کہ: دین کا دامن تھامے رکھو، دین کو ہاتھ سے جانے مت دینا، اس پر مضبوطی سے قائم رہنا۔

بیان واقعہ کا نرالا انداز

خاص طور سے حضرت یعقوب علیہ السلام کا قصہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ذکر کیا، تو ہمیں غور کرنا ہے کہ کیوں ذکر کیا؟ ظاہر ہے کہ قرآن پاک میں ماضی کے واقعات تاریخی حیثیت سے نہیں ذکر کئے جاتے بلکہ اس کا مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ ہمیں عبرت حاصل ہو، اور اس سے کچھ سبق لیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس واقعہ کو ایک عجیب و نرالے انداز سے قرآن پاک میں ذکر کیا، باری تعالیٰ سوال کرتے ہیں کہ:

﴿أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ﴾ کیا تم لوگ اس وقت موجود تھے جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی موت کا وقت آیا؟ یہ آیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، تو اس کے سب سے پہلے مخاطب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ کے واسطے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد قیامت تک آنے والی پوری امت محمدیہ ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا زمانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے سیکڑوں سال پہلے کا ہے تو ان کی موت کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں کیسے موجود ہوتے؟ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت موجود تھے، نہ صحابہ کرام موجود تھے، اور نہ ہم آپ موجود تھے۔ دراصل یہ انداز اختیار فرما کر آگے جو بات کہی جانے والی ہے اس کی اہمیت اور تاکید بتانا مقصود ہے، جیسے کوئی واقعہ اور حادثہ آپ کے سامنے پیش آیا ہو تو اس کو بیان کرنے کا ایک انداز یہ ہوتا ہے کہ بھائی! فلاں نے فلاں کو جو بات کہی تھی اس وقت تم وہاں تھے؟ وہ کہے گا کہ نہیں! میں وہاں موجود نہیں تھا، تو آپ کہیں گے کہ میں وہاں تھا، اس لیے میں بتلاتا ہوں کہ کیا ہوا تھا۔ یہ انداز دراصل سامنے والے کو کسی چیز کی طرف متوجہ کرنے کے واسطے ہوتا ہے۔ باری تعالیٰ نے بھی یہاں وہی انداز اختیار کیا۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں باری تعالیٰ نے لوگوں کو سمجھانے کے واسطے سارے انداز اور طریقے وہی اختیار کئے جو آپس کی بات چیت میں اختیار کئے جاتے ہیں۔ کسی آدمی کو متوجہ کرنے کے لیے یہ بھی ایک انداز اور طریقہ ہے جو اپنایا جاتا ہے۔ گویا باری تعالیٰ یہ سوال کرتے ہیں کہ جس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کی موت کا وقت آیا اس وقت آپ لوگ وہاں موجود تھے؟ ظاہر ہے کہ موجود نہیں تھے، تو باری تعالیٰ فرمانا چاہتے ہیں کہ میں تھا، بتاؤں کہ کیا ہوا تھا؟ اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ فرماتے ہیں کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی موت کی گھڑی آئی تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو جمع کیا اور ان سے سوال کیا۔

خاندان نبوت

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا معلوم ہو جانا چاہیے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کون تھے؟ آپ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ بنو اسرائیل پورا ایک خاندان ہے جن کے اندر سینکڑوں انبیاء کرام مبعوث ہوئے، اس لیے کہ ان کے بعد سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے بھی نبی آئے وہ سب بنو اسرائیل ہی میں آئے۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام ہی کا دوسرا نام ہے، ان کے بارہ بیٹے تھے انہی سے بارہ خاندان پھیلے، انہی کی ساری اولاد کو بنو اسرائیل کہا جاتا ہے، پھر ان بنو اسرائیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو خصوصی معاملہ ہوا وہ بھی عجیب و غریب ہے، اور اسی خاندان میں نبوت کا سلسلہ جاری رہا۔ اور دیکھئے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام خود اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، ان کے والد حضرت اسحاق علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، ان کے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی ہیں جن کو ابوالانبیاء کہا جاتا ہے، اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کے بعد دنیا

میں جتنے بھی انبیاء آئے وہ سب کے سب انہی کی نسل سے ہیں۔ اور ان کے چچا حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی نبی ہیں؛ گویا پورا گھرانہ نبوت کا گھرانہ ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ وہاں کون سی چیز کے چرچے ہوں گے! جیسے: تاجر گھرانہ میں تجارت کے چرچے ہوتے ہیں کھیتی باڑی والے گھرانہ میں کھیتی باڑی کے چرچے ہوتے ہیں، جیسا گھرانہ ہوتا ہے اس میں ویسے ہی چرچے ہوتے ہیں؛ تو آخر ان کا کام کیا تھا؟ پورے حنا ندان کا کام ہی لوگوں کو اللہ کی توحید اور نبی کی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دینا تھا، ان کی زندگیاں اسی میں گزرتی تھیں، اپنی صلاحیتوں کو اسی کے لیے استعمال کرتے تھے اور اسی کے لیے ساری مشقتیں اٹھاتے تھے، گویا ان کی زندگی کا مقصد اور مشن یہی تھا۔

فکر کیا کرے؟

نیز سوچنے کی بات یہ ہے کہ باپ خود اللہ کے نبی ہیں اور ان بارہ بیٹوں میں سے ایک حضرت یوسف علیہ السلام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، تو باپ اپنے بیٹوں کو۔ جن میں ایک اللہ کے نبی موجود ہیں۔ جمع کر کے وصیت کر رہے ہیں اور اس میں یہ سوال کر رہے ہیں: ”مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي؟“ اے میرے بیٹو! تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ بھی کوئی کرنے کا سوال تھا؟ ظاہر ہے کہ ان کے گھر میں دعوت کے چرچے ہوتے تھے، ان کی زندگیاں اسی میں کھپ گئی تھیں، ساری صلاحیتیں اسی میں استعمال ہوئی تھیں، اب موت کے وقت بیٹوں سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ میرے بعد تم کس کی پوجا کرو گے!

یہ ایک واقعہ پہلے پیش آیا ہے، تو آخر اس واقعہ کو قرآن پاک میں کو خصوصیت کے ساتھ ایک نرالے انداز میں کیوں ذکر کیا گیا؟ دراصل اس سے ہم لوگوں یعنی

قیامت تک آنے والی امت محمدیہ کو ایک سبق دینا منظور ہے کہ ایک آدمی جب دنیا سے جا رہا ہو تو اس کو اپنی اولاد اور اپنے خاندان کے متعلق اگر فکر کرنی ہے تو کیا کرے؟

آج کے دور کی تصویر کشی

ہم اور آپ تصور کریں کہ کسی کو معلوم ہو جائے کہ میرے دنیا سے جانے کا وقت آچکا ہے، ڈاکٹروں نے بھی کہہ دیا، اپنی صحت کو دیکھتے ہوئے خود اس کو بھی اندازہ ہو گیا، گھر والے بھی سمجھ رہے ہیں کہ یہ زیادہ دنوں کا مہمان نہیں ہے، دس بارہ گھنٹہ کی مہمانی ہے، ایسے وقت میں وہ سب کو جمع کرے کہ فلاں بیٹا دہی میں ہے، فلاں سعودیہ میں ہے، فلاں انگلینڈ میں ہے، ان سب کو بلا لو۔ آج اگر کوئی آدمی اپنی اولاد کو جمع کرے تو ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سچ بتاؤ کہ وہ کیا کہے گا؟ باپ اگر فیکٹری کا مالک ہے تو کہے گا کہ دیکھو بیٹا! بڑی محنت سے میں نے یہ فیکٹری قائم کی ہے، اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے، اپنی ساری زندگی اس کے اندر لگائی ہے، دیکھنا! میرے بعد اس کو برباد مت کر دینا، دشمنوں کو ہنسنے کا موقع مت دینا، بلکہ اور زیادہ ترقی ہو ایسی شکلیں اختیار کرنا، مل جل کر کے کام کرنا۔ یہی کہے گا نا!

اگر وہ کسان ہے اس کی کئی ایکڑ زمین ہے تو وہ کہے گا: یہ ساری زمیں ہے، یہ سب باغات جو نظر آ رہے ہیں، یہ سب کچھ نہیں تھا، بخر پڑا ہوا تھا، میں نے بڑی محنتیں کی ہیں، رات دن اس کے پیچھے ایک کر دیا ہے، اب یہ سب تمہارے لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں، دیکھنا! کہیں برباد نہ کر دینا۔ آج اگر کوئی آدمی نصیحتیں کرے گا تو یہی کرے گا، اور کیا کرے گا؟ ہمارا مزاج ہی ایسا بنا ہوا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ قرآن پاک میں ذکر کر کے بتلایا کہ یہ سب چیزیں وصیت کی نہیں ہیں کہ فیکٹریوں میں اضافہ کرنا،

زمینوں کو ترقی دینا، تجارت بڑھا دینا، آج اگر دس لاکھ کا ٹرن اوور (TurnOver) ہے تو پچاس لاکھ کا کر دینا؛ بلکہ فکر کی چیز اگر ہے تو یہ ہے کہ میرے بعد میری اولاد کون سا دین اختیار کرے گی؟ کس کی عبادت کرے گی؟

حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے کیا یہ گمان ہو سکتا تھا کہ وہ کسی اور خدا کی عبادت کریں گے؟ یہ تو نبیوں کی اولاد تھی، ان کا باپ نبی، دادا نبی، پردادا نبی، دادا کا بھائی نبی؛ پھر بھی حضرت یعقوب علیہ السلام ان سے پوچھ رہے ہیں کہ میرے بعد کس کی پوجا کرو گے؟ ان سے اور کچھ توقع کی ہی نہیں جاسکتی تھی، اس کے باوجود تاکید کے واسطے پوچھا جا رہا ہے، اور بیٹوں نے بھی جو جواب ان کی شایان شان تھا وہی دیا: ”تَعْبُدُ إِلَهَكَ وَالِاهَ أَبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ“ ابا جان! آپ بے فکر رہیے، آپ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد آپ کے معبود ہی کی ہم عبادت کریں گے۔ پھر مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے آباء و اجداد حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہم السلام کا جو معبود ہے اسی کی عبادت کریں گے، وہ کون ہے؟ ”إِلَهًا وَاحِدًا“ وہی ایک معبود اللہ تعالیٰ۔ اس طرح پوری وضاحت کر دی گئی، اب اس کے بعد تو کچھ پیچیدگی باقی ہی نہیں رہی تھی، پھر بھی آگے فرمایا: ”وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ“ اور ابا جان! ہم اسی کا حکم مانیں گے، اور اسی کی بات پر چلیں گے۔ اس طرح سے بیٹوں نے اپنے والد کو مکمل اطمینان دلادیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام جیسے پیغمبر کو اپنی اولاد کے متعلق -جن میں ایک اللہ کا نبی ہے- یہ فکر لاحق ہے کہ میرے بعد میری اولاد کس کی عبادت کرے گی، اور کون سا دین اختیار کرے گی؛ تو کیا اس زمانہ میں ہمیں اپنی اولاد کے متعلق یہ فکر نہیں ہونی چاہیے؟ آج تو اس فکر کی اور زیادہ سخت ضرورت ہے۔ اس لیے

حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری طرف سے اس کا اہتمام ہونا چاہیے، اور ایسی وصیت سے پہلے اولاد کے لیے ایسی کوشش بھی ہونی چاہیے۔

اب آگے وصیت کے متعلق کچھ روایتیں پیش کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی وصیت

۷۱۲:- فمنہا حدیث زید بن أرقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ - الَّذِي سَبَقَ فِي بَابِ إِكْرَامِ أَهْلِ بَيْتِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ: قَامَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِينَا خُطِيبًا، فَحَمِدَ اللَّهَ، وَأَثْنَى عَلَيْهِ، وَوَعَّظَ وَذَكَّرَ، ثُمَّ قَالَ: ((أُمَّةٌ أَبْعُدُ، أَلَا أَيْهَا النَّاسُ، إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ رَسُولُ رَبِّي فَأَجِيبُ، وَأَنَا تَارِكٌ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ، أَوَّلَهُمَا: كِتَابُ اللَّهِ، فِيهِ الْهُدَى وَالنُّورُ، فَخُذُوا بِكِتَابِ اللَّهِ وَاسْتَمْسِكُوا بِهِ))، فَحُتَّ عَلَى كِتَابِ اللَّهِ، وَرَغِبَ فِيهِ، ثُمَّ قَالَ: ((وَأَهْلُ بَيْتِي، أَذَكَّرُكُمْ اللَّهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي)) (رواه مسلم، وَقَدْ سَبَقَ بِطَوِيلِهِ).

ترجمہ مع تشریح:- حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ

نبی کریم ﷺ ہمارے درمیان خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، پہلے آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان فرمائی اور لوگوں کو نصیحت کی، اللہ تعالیٰ کی یاد دلائی، اور فرمایا: حمد و صلوٰۃ کے بعد! اے لوگو، سنو! میں ایک انسان ہوں، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنی اور بلانے والا میرے پاس آئے اور میں اس کے بلاوے پر لبیک کہوں (یعنی موت کا فرشتہ آئے گا تو مجھے دنیا سے جانا ہوگا) اس لیے میں تمہارے درمیان دو مضبوط چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں (ان کو اگر تم مضبوطی سے پکڑ لو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے) ایک اللہ تعالیٰ کی کتاب (یعنی قرآن پاک کہ) اسی میں ہدایت کا راستہ، لوگوں کے لیے رہنمائی اور روشنی موجود ہے، لہذا اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پکڑو اور مضبوطی کے

ساتھ اس کو تھامے رہو (مطلب یہ ہے کہ اس پر عمل کرو۔ پکڑنے اور تھامنے سے ہاتھ میں پکڑنا مراد نہیں ہے، بلکہ عمل کرنا مراد ہے) چناں چہ نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو قرآن پاک پر عمل کے لیے خوب ابھارا اور ترغیب دی۔ اور دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں، کہ ان کے سلسلہ میں میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہوں (یعنی ان کے حقوق کو بھی ادا کرنا)

دیکھو! یہاں نبی کریم ﷺ کو جب یہ اندازہ ہوا کہ میرے دنیا سے جانے کا وقت اب قریب آ رہا ہے تو آپ نے امت کو یہ وصیت فرمائی، اسی مناسبت سے اس روایت کو یہاں پیش کیا ہے۔

مناسب حال معاملہ اور نصیحت

۷۱۳:- وعن أبي سليمان مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ نَحْنُ نَحْنُ قَالَ: أَتَيْنَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَنَحْنُ شَبَبَةٌ مُتَقَارِبُونَ، فَأَقَمْنَا عِنْدَهُ عَشْرَ بَيْنَ لَيْلَةٍ. وَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ رَحِيمًا رَفِيقًا، فَظَنُّ أَتَقَدَّاشْتَقْنَا أَهْلَنَا، فَسَأَلْنَا عَمَّنْ تَرَكْنَا مِنْ أَهْلِنَا، فَأُخْبِرْنَا، فَقَالَ: ((ارْجِعُوا إِلَى أَهْلِيكُمْ، فَأَقِيمُوا فِيهِمْ، وَعَلِّمُوهُمْ وَمُرُوهُمْ، وَصَلُّوا صَلَاةَ كَذَا فِي حِينِ كَذَا، وَصَلُّوا كَذَا فِي حِينِ كَذَا، فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَلْيُؤَدِّنْ لَكُمْ أَحَدُكُمْ وَلْيُؤَمِّكُمْ أَكْبَرُكُمْ)) (متفق عَلَيْهِ)

زاد البخاری فی روایۃ لہ: ((وَصَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أَصَلِّي)).

وَقَوْلُهُ: ((رَحِيمًا رَفِيقًا)) رُوِيَ بِفَاءٍ وَقَافٍ، وَرُوِيَ بِقَافٍ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ (یعنی یہ اور ان کے قبیلہ کے کچھ نوجوان) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے حال یہ کہ ہم سب ہم عمر اور نوجوان تھے (یہ لوگ اپنے علاقہ سے خاص دین سیکھنے کے لیے

حاضر ہوئے تھے) ہم نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بیس روز قیام کیا، اور نبی کریم ﷺ بڑے مہربان اور نرم دل تھے۔ جب بیس روز ہو گئے تو حضور اکرم ﷺ نے محسوس کیا کہ ہمارے دلوں میں ہمارے گھر والوں کا شوق پیدا ہوا ہے (ایسا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب ان کو گھر والے یاد آ رہے ہیں) تو حضور ﷺ نے ہم سے پوچھا کہ تمہارے گھر پر کون کون ہے؟ (ماں باپ، بھائی، بہن، بیوی بچے؛ یہ ساری تفصیلات حضور ﷺ نے پوچھیں) ہم نے آپ کو سب تفصیل بتلائی (تو حضور ﷺ سمجھ گئے کہ ان کو گھر کی یاد آ رہی ہے اس لیے کہ بیس دن ہو گئے تھے) تو حضور ﷺ نے از خود ارشاد فرمایا: بھائیو! تم لوگ گھر جاؤ (اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم و تربیت اور تبلیغ وغیرہ امور کے اندر جس آدمی کو لگایا جائے اس میں اس کے مزاج اور اس کی طبیعت کے تقاضوں کا بھی خیال رکھا جائے، ان سے ہٹ کر اگر کچھ کرنے جاؤ گے تو پھر یہ چیز نہجے گی نہیں، اور اس میں استقامت نہیں ہوگی۔ دیکھو! ان کو فقط بیس دن گزرے تھے، لیکن نبی کریم ﷺ نے ان کے مزاجوں سے محسوس کیا کہ اب ان کے دلوں میں گھر کا خیال آ رہا ہے، تو حضور ﷺ نے از خود پوچھ لیا کہ گھر پر کس کو چھوڑ کر آئے ہو، ساری تفصیل سننے کے بعد آپ نے فیصلہ کیا کہ اب تم لوگ گھر جاؤ) اور اپنے خاندان کے لوگوں میں قیام کرو، اور (یہاں جو سیکھا ہے وہ) ان کو سکھاؤ (مقامی کام کرو) ان کو اللہ کی باتوں کا حکم کرو، اور فلاں وقت میں فلاں نماز اور فلاں وقت میں فلاں نماز پڑھو (پانچوں وقت کی نماز کے اوقات بتلائے) اور جب نماز کا وقت آئے تو ایک آدمی اذان کہے، اور تم میں جو بڑا ہے وہ تمہاری امامت کرائے۔

افادات:- دیکھو! جب یہ لوگ رخصت ہو رہے تھے تو نبی کریم ﷺ نے ان کو نماز کی اور خاندان والوں کو دین سکھانے کی تاکید فرمائی، اور نماز کا طریقہ بتلایا۔ اس روایت کو لا کر بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ جب کسی سے جدائی کا وقت آئے تو اس کے

مناسب حال نصیحت کرنی چاہیے۔ جیسے: آپ اپنے بچے کو مدرسہ میں پڑھنے کے لیے بھیج رہے ہوں تو ظاہر ہے کہ اس کے مناسب حال بات یہی ہے کہ اس سے کہا جائے کہ بیٹا! وہاں جا کر محنت سے پڑھنا۔ اگر آپ کا لڑکا بڑا ہے اور وہ تجارتی سفر کے لیے بیرون جا رہا ہے، یا ملک ہی میں کہیں لمبی ٹور پر جا رہا ہے، تو اس کے مناسب آپ نصیحت کریں گے، مثلاً: سفر میں نماز کا خیال رکھنا، اپنے آپ کو گناہوں سے بچانا، برائیوں سے دور رہنا، اور اپنے کام کی طرف توجہ دینا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ جب بھی کسی سے جدائی کا وقت آئے، تو اس کو اس کے مناسب حال نصیحت کی جائے، خاص طور پر دین کی حفاظت کی طرف توجہ دلائی جائے۔

اپنی دعاؤں میں ہمیں مت بھولیو

۷۱۴:- وعن عمر بن الخطاب رضي الله عنه قال: اسْتَأْذَنْتُ النَّبِيَّ ﷺ فِي الْعُمْرَةِ فَأَذِنَ، وَقَالَ: ((لَا تَنْسَانِيَا أُخَيَّ مِنْ دُعَائِكَ)) فَقَالَ كَلِمَةً مَا يَسُرُّنِي أَنَّ لِي بِهَا الدُّنْيَا - وفي رواية قَالَ: ((أَشْرِكُنِيَا أُخَيَّ فِي دُعَائِكَ))

(رواہ أبو داود و الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عمرہ کے لیے جانے کی اجازت طلب کی، تو حضور ﷺ نے اجازت مرحمت فرمائی، اور کہا: اے میرے پیارے بھائی! اپنی دعاؤں میں ہمیں مت بھولیو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ایسا جملہ ارشاد فرمایا کہ ساری دنیا ملتی تو اس سے وہ خوشی نہ ہوتی جو حضور ﷺ کے اس ارشاد سے ہوئی۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ بڑا بھی اپنی چھوٹے سے دعا کی درخواست کرے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کوئی آدمی کسی ایسی جگہ پر جا رہا ہو جس

کے متعلق یہ گمان ہو کہ وہاں دعا قبول ہوتی ہے، تو ان جانے والوں سے دعا کی درخواست کرنی چاہیے۔ باب کے عنوان میں یہ بھی تھا: ان کے لیے دعا کرنا اور ان سے اپنے لیے دعا کی درخواست کرنا۔ تو کوئی آدمی کسی بھی سفر میں جا رہا ہو تو چوں کہ مسافر کی دعا قبول ہوتی ہے، تو اس سے بھی دعا کی درخواست کی جائے۔

کسی کو رخصت کرتے وقت کی دعائیں

۷۱۵:- وعن سالم بن عبد الله بن عمر: أنَّ عبد الله بن عمر رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا كَانَ يَقُولُ لِلزَّجَلِ إِذَا أَرَادَ سَفَرًا: أُذْنُ مِثْبَى حَتَّى أُوَدِّعَكَ كَمَا كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُودِّعُنَا، فَيَقُولُ: ((أَسْتَوْدِعُ اللَّهَ دِينَكَ، وَأَمَانَتَكَ، وَخَوَاتِيمَ كَمَلِكَ))

(رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت سالم - جو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے ہیں ان - سے روایت ہے کہ جب کوئی آدمی سفر کا ارادہ رکھتا اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آتا تو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے کہ: مجھ سے قریب آؤ تاکہ میں تم کو اسی طرح رخصت کروں جس طرح نبی کریم ﷺ ہم کو رخصت فرماتے تھے، پھر یہ دعا دیتے تھے: ”میں اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں دیتا ہوں تیرے دین کو، تیری امانت کو، اور تیرے اعمال کے انجام کو“ (اور جو چیز اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں دی جائے وہ کبھی ضائع نہیں ہوا کرتی)

افادات:- معلوم ہوا کہ سفر میں جانے والے اپنے ساتھیوں کو اپنے پاس سے اس طرح رخصت کرنا چاہیے۔

۷۱۶:- وعن عبد الله بن يزيد الخطمي الصحابي رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَرَادَ أَنْ يُودِّعَ الْجَيْشَ، قَالَ: ((أَسْتَوْدِعُ اللَّهَ دِينَكُمْ،

وَأَمَّا نَتِّكُمُ، وَخَوَاتِيمَ أَعْمَالِكُمْ)) (حدیث صحیح، رواہ أبو داود وغیرہ بإسناد صحیح).
اس روایت میں بھی اوپر والی دعا کا تذکرہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی لشکر کو رخصت فرماتے تھے تو یہی دعا دیتے تھے۔

۷۱۷:- وعن أنس رضي الله عنه قال: جاء رجل إلى النبي ﷺ فقال: يا رسول الله! إني أريد سفراً، فزوّدني، فقال: ((زَوَّدَكَ اللَّهُ التَّقْوَى)) قَالَ: زِدْنِي قَالَ: ((وَعَفَرَ ذَنْبَكَ)) قَالَ: زِدْنِي، قَالَ: ((وَيَسِّرْ لَكَ الْخَيْرَ حَيْثُمَا كُنْتَ))

(رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ مختصر تشریح:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں سفر کا ارادہ رکھتا ہوں، آپ مجھے (دعا اور نصیحت کا) توشہ دیجئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تجھے تقویٰ سے مالا مال فرمائے (اس سے معلوم ہوا کہ سفر کرنے والے کو دعا دینی چاہیے) اس نے پھر درخواست کی کہ: اے اللہ کے رسول! مزید (دعا) دیجئے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تیرے گناہوں کو معاف کرے۔ اس نے پھر درخواست کی کہ: کچھ اور (دعا) دیجئے، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تو جہاں کہیں بھی رہے اللہ تعالیٰ تیرے لیے بھلائی کے راستے آسان کر دے۔

انفادات:- اوپر نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دعا کی درخواست کی تھی اور یہاں آپ ﷺ نے دعا دی۔ معلوم ہوا کہ جو رخصت ہو رہا ہو اس کو دعا دینی بھی چاہیے اور اس سے دعا کی درخواست بھی کرنی چاہیے۔ یہ بھی آداب میں سے ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

الاستِخارة والمِشارة

استخارہ اور مشورہ کرنا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (آل عمران: ۱۵۹)

وَقَالَ تَعَالٰی: وَاْمُرْهُمْ شُورٰی بَیْنَهُمْ (الشوری: ۳۸) اُنّٰی: یَتَشَاوِرُوْنَ

بَیْنَهُمْ فِیْهِ۔

مشورہ کی اہمیت

دو چیزیں ہیں: استخارہ اور مشورہ۔ استخارہ: اللہ تبارک و تعالیٰ سے کیا جاتا ہے، اور مشورہ: امانتدار، سمجھدار، خیر خواہ اور تجربہ کار آدمی سے کیا جاتا ہے۔ مشورہ کے سلسلہ میں آیت پیش کی ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (آل عمران: ۱۵۹) اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو اس بات کا حکم دیا کہ اہم معاملات میں آپ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیجئے۔ حالاں کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جو علم، عقل، سمجھ، اور سوچ بوجھ عطا فرمائی تھی؛ وہ اعلیٰ، کامل و مکمل تھی، نوع انسانی میں کسی کے لیے بھی وہ علم، عقل و سمجھ اور ایسا کمال متصور نہیں ہو سکتا، اور ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ گویا عالم غیب سے علوم کا القاء مختلف طریقوں سے ہوتا ہی رہتا تھا، اس کے باوجود اہم معاملات میں حضور اکرم ﷺ کو مشورہ کا حکم دیا گیا۔ گویا اس طریقہ کو اللہ تعالیٰ انسانوں میں اور امت مسلمہ کے اندر جاری فرمانا چاہتے ہیں، اس لیے حضور ﷺ کو اس کا حکم دیا گیا۔

حضور اکرم ﷺ کبھی اپنی رائے چھوڑ دیتے تھے

اسی لیے اہم معاملات میں حضور اکرم ﷺ کی عادت شریفہ تھی کہ مشورہ فرماتے تھے، بلکہ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ کسی معاملہ میں آپ ﷺ کی کوئی رائے

ہوتی، لیکن مشورہ میں بات رکھی گئی اور لوگوں کا زیادہ رجحان دوسری بات کی طرف دیکھا تو آپ ﷺ دوسری بات کو اختیار فرما لیتے۔ یا کسی کی طرف سے کوئی بات پیش کی گئی اور حضور اکرم ﷺ نے محسوس کیا کہ اسی کو اختیار کیا جانا چاہیے، تو اگرچہ آپ کی اپنی رائے دوسری ہوتی تھی، اس کے باوجود ان کی رائے کو اختیار فرما لیتے۔

غزوہ اُحد کے مشورہ کا منظر

چنانچہ غزوہ اُحد کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ مکہ والے ایک لشکر لے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کے ارادہ سے روانہ ہو چکے ہیں، تو اس لشکر کے ساتھ مقابلہ کہاں ہو؟ اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ نے مشورہ کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کیا۔ مشورہ کے لیے بیٹھنے سے پہلے حضور اکرم ﷺ نے ایک خواب بھی دیکھا تھا کہ میں ایک محفوظ قلعہ میں ہوں، ایک گائے ذبح کی جا رہی ہے، اور اپنی تلوار کو آپ نے ہلایا اور سونتا، تو اس کا اگلا حصہ ٹوٹ کر گر گیا، پھر دوبارہ اس کو حرکت دی تو وہ پہلے سے زیادہ عمدہ نظر آنے لگی۔ محفوظ قلعہ سے اشارہ مدینہ منورہ کی آبادی کی طرف تھا کہ اگر اس میں رہ کر مقابلہ کیا جائے گا تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی آدمی محفوظ قلعہ میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کرے، اور جو گائے ذبح ہوتے ہوئے دیکھی، اس سے اشارہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف تھا جو اس غزوہ کے موقع پر شہید ہوئے تھے۔ اور پہلی مرتبہ جو تلوار سونتی تو اس کا اگلا حصہ ٹوٹ گیا اس سے بھی اشارہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اسی جماعت کی طرف تھا جو شہید ہوئی، اور دوبارہ اس کو سونتا اور پہلے سے عمدہ نظر آئی، اس سے اس کے بعد کی جو کامیابیاں ملنے والی تھیں ان کی طرف اشارہ تھا۔

خیر! نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مشورہ کے لیے مسجد نبوی ہی میں جمع کیا،

اور مشورہ میں حضور ﷺ نے اپنی جو بات پیش فرمائی اس سے تمام حضرات نے یہی سمجھا کہ آپ ﷺ مدینہ ہی میں رہ کر مقابلہ کرنے کو ترجیح دے رہے اور پسند فرما رہے ہیں، خواب میں بھی اسی کی طرف اشارہ تھا، اور حضور اکرم ﷺ کی اپنی رائے شریف بھی یہی تھی۔

غزوہ بدر کا مختصر خاکہ

لیکن بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کو غزوہ بدر میں مقابلہ کے لیے میدان میں آنے کا موقع نہیں ملا تھا، ان کی دلی تمنائیں تھیں کہ اگر موقع ملے تو ہم بھی اللہ کے واسطے اور دین اسلام کے واسطے حضور اکرم ﷺ کا ساتھ دے کر بہادری کے جوہر دکھلائیں۔ ان کو غزوہ بدر میں شرکت کا موقع اس لیے نہیں ملا تھا کہ غزوہ بدر اچانک پیش آیا تھا، پہلے سے ایسی کوئی بات ذہنوں میں نہیں تھی کہ دشمن سے مقابلہ ہوگا۔ مکہ والوں کا ایک تجارتی قافلہ شام سے واپس آرہا تھا جس کے تعاقب میں نبی کریم ﷺ صحابہ کرام کو لے کر روانہ ہوئے تھے، حضور اکرم ﷺ کے بھی وہم و گمان میں نہیں تھا کہ مکہ مکرمہ سے کوئی لشکر روانہ ہوگا اور اس سے مقابلہ کی نوبت آئے گی، بس اچانک مقابلہ کی نوبت آگئی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی عطا فرمائی۔ جب آپ ﷺ اس قافلہ کے تعاقب کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہونے والے تھے، تو آپ نے اعلان فرمایا کہ کون تیار ہے؟ معلوم ہوا ہے کہ مکہ والوں کا ایک تجارتی قافلہ شام سے واپس آرہا ہے، اور مکہ جارہا ہے، اس وقت وہاں جو موجود تھے وہ اسی حالت میں تیار ہو گئے، بعضوں نے کہا کہ ہم ذرا تیاری کر لیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں! جو موجود اور تیار ہیں وہ آجائیں۔ بہر حال! تین سو تیرہ کے قریب صحابہؓ روانہ ہوئے، اور بعد میں جو ہوا وہ ہوا۔ تو یہ سب کچھ اچانک ہوا تھا، اس لیے بہت سوں کو شرکت کا موقع نہیں ملا تھا اور ان کی تمنائیں دل ہی دل میں رہ گئی تھیں۔

افسوس کا تدارک

اسی لیے بدر کے واقعہ کے بعد بعض حضرات صحابہ کو جیسے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چچا حضرت انس بن نصر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تو بہت زیادہ افسوس رہ گیا تھا، وہ کہنے لگے کہ نبی کریم ﷺ کا اپنے دشمنوں سے پہلا ہی مقابلہ تھا، افسوس کی بات ہے کہ میں اس میں شریک نہ ہو سکا، اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے آئندہ دشمن کے مقابلہ میں آنے کا موقع دیا تو اللہ تعالیٰ دیکھ لیں گے کہ میں کیا کرتا ہوں، یعنی میں برابر دشمن کا مفت بلہ کروں گا۔ یہ انہوں نے قسم کھا کر کہا تھا۔ اور پھر غزوہ احد کے موقع پر انہوں نے بہادری کے ایسے جوہر دکھلائے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ جو انصار میں بڑے بہادر اور ایسے ہی سخت مزاج سمجھے جاتے تھے جیسے مہاجرین میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، وہ فرماتے ہیں کہ غزوہ احد کے موقع پر ایک وقت حضرت انس بن نصر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تلوار لے کر آگے بڑھ رہے تھے، میرے پاس سے گزرتے ہوئے کہنے لگے: اے معاذ! کدھر چلے، میرے ساتھ چلو، ادھر اُحد پہاڑ کی طرف جنت کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے، یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے اور دشمن کا مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ: انہوں نے ایسا مقابلہ کیا تھا کہ میری بھی ہمت نہیں ہوئی۔

غزوہ احد کا مشورہ

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ غزوہ بدر میں بہت سوں کو شرکت کا موقع نہیں ملا تھا، اس لیے ان کی دلی تمنائیں تھیں کہ آئندہ اگر ایسا موقع آئے گا تو ہم بھی اللہ کے واسطے اور دین اسلام کے واسطے حضور اکرم ﷺ کا ساتھ دیں گے۔ اس وقت جب مشورہ کے لیے بیٹھے اور معلوم ہوا کہ مکہ سے لشکر روانہ ہوا ہے، تو حضور ﷺ نے اپنا رجمان اور ارادہ ظاہر فرما

دیا کہ مدینہ منورہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ عبداللہ بن ابی جو منافقین کا سردار تھا اور ظاہری طور پر اسلام لے آیا تھا، وہ ایک تجربہ کار صاحب رائے آدمی تھا، اسی لیے نبی کریم ﷺ کے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لانے سے پہلے مدینہ والوں نے اسی کو اپنا سردار اور بادشاہ بنانا طے کر لیا تھا، لیکن جب نبی کریم ﷺ ہجرت کر کے یہاں تشریف لائے اور اسلام پھیلا تو اس کا سارا نظام گڑ بگڑ ہو گیا، اسی کا تو اس کو حضور اکرم ﷺ پر حسد تھا کہ ان کے آنے سے میرا سارا کھیل بگڑ گیا، اسی پر وہ جلتا اور کڑھتا تھا، اور اسی وجہ سے اس میں منافقت آئی تھی۔ خیر! اس سے بھی حضور ﷺ نے مشورہ لیا، تو اس نے یہ مشورہ دیا کہ آج تک مدینہ کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ باہر کے کسی دشمن نے جب بھی حملہ کیا اور مدینہ کے رہنے والوں نے مدینہ میں رہ کر ان کا جواب دیا، تو مدینہ والے کبھی ناکام نہیں ہوئے اور دشمن کو ہمیشہ منہ کی کھانی پڑی۔ اور اس نے یہ بھی کہا کہ اگر اندر رہ کر مقابلہ کریں گے تو مرد تو باہر نکل کر دشمن سے لڑیں گے اور عورتیں بھی چھتوں سے دشمنوں پر پتھراؤ کر سکیں گی۔ لیکن جن کو غزوہ بدر میں موقع نہیں ملا تھا ان کی رائے یہ تھی کہ باہر میدان میں جا کر جواب دینا چاہیے، اندر رہ کر مقابلہ کرنا تو ہماری بزدلی سمجھی جائے گی۔ نو جوان پارٹی اسی طرف تھی، اور ان کی طرف سے مطالبہ تھا کہ مدینہ منورہ سے باہر جا کر مقابلہ کیا جائے، کچھ بڑوں نے بھی اس رائے میں ان کا ساتھ دیا، حضور ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اگر مدینہ سے باہر جا کر مقابلہ کا فیصلہ نہ کیا گیا تو میں کھانا نہیں کھاؤں گا، جب حضور اکرم ﷺ نے دیکھا کہ ان لوگوں کا شوق اور جذبہ یہ ہے، تو آپ نے فیصلہ کر دیا کہ ٹھیک ہے! مدینہ سے باہر جا کر مقابلہ کریں گے۔

وہ جمعہ کا دن تھا، حضور اکرم ﷺ نے لوگوں کو جمعہ کی نماز پڑھائی اور تقریر فرمائی، جس میں اللہ کے راستہ میں دشمن کے مقابلہ میں بہادری کے جوہر دکھلانے کے

لیے ترغیب دی، اسی میں عصر کا وقت ہو گیا، تو عصر کی نماز پڑھا کر آپ ﷺ اپنے حجرہ مبارکہ میں تیاری کے واسطے تشریف لے گئے، جب آپ ﷺ اندر تشریف لے گئے تو یہ نوجوان جنہوں نے مدینہ منورہ سے باہر جا کر مقابلہ پر اصرار کیا تھا، ان کو دوسروں نے سمجھایا کہ حضور اکرم ﷺ کا رجحان کیا تھا وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا؟ تم نے بلا وجہ حضور ﷺ کی مرضی کے خلاف اتنا زور لگایا کہ آپ کو یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ مطلب یہ ہے کہ بڑوں نے ان کو ذرا ڈانٹا اور متنبہ کیا تو ان کی بھی سمجھ میں بات آئی کہ بات تو ٹھیک ہے۔ اب حضور اکرم ﷺ تو تیاری کے واسطے حجرہ مبارکہ میں تشریف لے گئے تھے، اس لیے آپ ﷺ زرہ پہن کر، تلوار ہاتھ میں لے کر، ترکش اور کمان لٹکا کر میدانِ جنگ میں جانے کی پوری تیاری فرما کر جب باہر تشریف لائے، تو ان نوجوانوں نے۔ جن کو اصرار کرنے پر لوگوں نے سمجھایا تھا۔ عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہماری طرف سے آپ کی بے ادبی اور گستاخی ہوئی، آپ کا رجحان اور ارادہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، ہم لوگوں نے اصرار کیا جس کی وجہ سے آپ نے یہ فیصلہ فرمایا، اگر آپ کا ارادہ ہو تو مدینہ ہی میں رہ کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ فرما دیجئے۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ کا نبی جب ایک مرتبہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ دشمن کے مقابلہ کے لیے میدان میں نکلیں گے، تو پھر مقابلہ کئے بغیر واپس نہیں لوٹتا، اب تو میں تیار ہو کر آ گیا ہوں۔ اسی کو قرآن پاک میں بتلایا گیا: ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ پہلے اچھی طرح مشورہ کر لو، پھر جب کوئی فیصلہ کر لیا اور ارادہ مضبوط ہو گیا؛ تو اب اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔

اس کو مشورہ کہتے ہیں

آج کل تو ایک مصیبت یہ بھی ہو گئی کہ مشورہ مشورہ نہیں رہا، بلکہ پہلے سے فیصلہ کر لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں طلبہ کا کوئی معاملہ پیش آتا ہے اور مہتمم صاحب کو لگتا

ہے کہ یہ قابو میں نہیں آئے گا، تو متہتم صاحب ان سے کہتے ہیں کہ جا کر مفتی صاحب سے مشورہ کر لو۔ وہ میرے پاس آتے ہیں، جب میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہوا؟ تو وہ پوری بات بیان کر دیتے ہیں کہ ایسا ایسا ہوا ہے، اور ایسا کرنے کا ارادہ ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ آپ نے تو فیصلہ کر لیا، اب مشورہ کس بات کا کرنے آئے ہو؟ جب ایک چیز طے کر لی، تو اب مشورہ کا سوال ہی نہیں رہا۔ مشورہ کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ نے کوئی چیز طے نہیں کی، بلکہ پہلے اپنی بات رکھ دی، اب اس پر لے دے ہوگی، اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں گے؛ اس کو مشورہ کہتے ہیں۔

اس کا نام مشورہ نہیں

لیکن آج کل عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اپنی طرف سے ایک چیز کا فیصلہ کر لیا جاتا ہے، پھر دوسرے کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کے واسطے مشورہ ہوتا ہے کہ میں فلاں مولانا صاحب کے پاس گیا تھا تو انہوں نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا۔ ارے بھائی! تم کو تو یہی کرنا تھا، بس مشورہ کا تو بہانہ ہے، اس کا نام مشورہ نہیں ہے۔ مشورہ تو یہ ہے کہ آدمی کوئی فیصلہ نہ کرے، اپنی بات پوری دیانتداری کے ساتھ ان کے سامنے رکھ دے۔ اتنا ضروری ہے کہ جس سے مشورہ کیا جائے وہ آدمی امانتدار ہو، حدیث پاک میں آتا ہے: ”الْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمِنٌ“ (سنن ابوداؤد: باب فی الْمَشُورَةِ) اور جس سے مشورہ لیا جا رہا ہے اس کی بھی ذمہ داری ہے کہ مشورہ لینے والے کے حق میں جس چیز کو وہ بہتر سمجھتا ہو اسی چیز کا مشورہ دے، چاہے اس میں مشورہ دینے والے کا بھی نقصان ہوتا ہو۔

مشورہ کے بعد کیا ہوا فیصلہ نہ بدلے

خیر! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مشورہ میں پہلے سے فیصلہ نہیں کیا جاتا اور فیصلہ

کر لینے کے بعد اس کو بدل نہیں جاتا۔ ہمارے یہاں ایک مصیبت یہ بھی ہو گئی ہے کہ فیصلہ کر لینے کے بعد بیوی نے کچھ کہہ دیا، عورتوں نے دو باتیں کہہ دیں کہ یوں کرو تو پہلا فیصلہ بدل دیتے ہیں کہ اچھا چلو! یوں کر لیتے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کوئی تیسرا آیا اس نے کچھ اور کہا تو پھر فیصلہ بدل دیا، اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ہمارے کسی کام میں برکت نہیں ہوتی۔ اسلام کا طریقہ یہ نہیں ہے۔ اس لیے پہلے سے اچھی طرح مشورہ ہونا چاہیے، اور اس مشورہ میں جب ایک فیصلہ ہو گیا تو اب دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے، لیکن آپ اسی فیصلہ کے مطابق چلیے، سیدھی سادی بات ہے ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ جب فیصلہ کر لیا تو اب اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے آگے بڑھو۔

عورتوں سے مشورہ

عام طور پر جب عورتوں کے سامنے بات آتی ہے تو پھر بڑے بڑے سمجھ دار بھی اپنا فیصلہ بدل ڈالتے ہیں، اگر ان سے مشورہ کرنا ہے تو پہلے سے ان کے سامنے بھی بات رکھو۔ ویسے عام طور پر عورتوں سے مشورہ لینے کو پسند نہیں کیا گیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو فرماتے ہیں: "شَاوِرُوهُنَّ وَخَالِفُوهُنَّ" ان سے مشورہ کرو اور اس کی مخالفت کرو (۱) اگرچہ عورت بھی کبھی کبھی اچھا مشورہ دیا کرتی ہے، ایک واقعہ یاد آ گیا تو سنا دیتا ہوں۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب صلح ہو گئی جس میں انہوں نے ایک شرط یہ بھی

(۱) وَقَدْ وَرَدَ: شَاوِرُوهُنَّ وَخَالِفُوهُنَّ كَذَا فِي الْمَرْقَاةِ. قُلْتُ: قَالَ صَاحِبُ تَجْمِيعِ الْبَحَارِ فِي كِتَابِهِ تَذَكُّرَةَ الْمَوْضُوعَاتِ فِي الْمَقَاصِدِ، شَاوِرُوهُنَّ وَخَالِفُوهُنَّ لَمْ أَرَهُمْ فَوْعًا، وَلَكِنْ رَوَى عَنْ عُمَرَ: "خَالِفُوا النِّسَاءَ فَإِنَّ فِي خِلَافِهِنَّ الْبَرَكَةَ". بَلْ رَوَى عَنْ أَنَسٍ رَفَعَهُ لَا يَفْعَلَنَّ أَحَدُكُمْ أَمْرًا حَتَّى يَسْتَشِيرَ فَإِنَّ لَمْ يَجِدْ مَنْ يَسْتَشِيرُهُ فَلْيَسْتَشِيرْ أُمَّةً ثُمَّ لِيَخْلَفْهَا فَإِنَّ فِي خِلَافِهَا الْبَرَكَةَ. (تحفة

الاحوذی۔ حدیث رقم: ۲۱۹۲)

لگائی تھی کہ اگرچہ مسلمان احرام باندھ کر آئے ہیں لیکن اس سال تو ان کو عمرہ کے لیے بیت اللہ جانے نہیں دیں گے، البتہ آئندہ سال آ کر تین دن یہاں رہ کر عمرہ کر سکتے ہیں، اور سوائے تلواریں کے اور کوئی ہتھیار ساتھ میں نہ لائیں اور وہ تلوار بھی نیام میں ہونی چاہیے۔ اور بھی شرائط تھیں جو نبی کریم ﷺ نے منظور فرمائیں اور نبی کریم ﷺ نے فیصلہ کر لیا کہ ٹھیک ہے اس سال واپس جائیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ صلح بہت گراں گزری، کہنے لگے کہ ہم عمرہ کے لیے وہاں سے یہاں تک آ گئے ہیں، اب یہ ہم کو کیوں روکتے ہیں، ہم لڑ لیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی ضبط نہ ہو سکا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا آپ نبی برحق نہیں؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بیشک۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: پھر یہ ذلت کیوں گوارا کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ کا رسول اور برحق نبی ہوں، اس کے حکم کے خلاف نہیں کر سکتا اور وہ میرا معین اور مددگار ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ کا طواف کریں گے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہاں! لیکن میں نے یہ کب کہا تھا کہ اسی سال طواف کریں گے، اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے اور ان سے بھی یہی عرض کیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی لفظ بلفظ وہی جواب دیا جو آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا تھا۔ بہر حال! حضور اکرم ﷺ نے لڑائی نہیں ہونے دی اور صلح کر لی۔ جب یہ طے ہو گیا کہ واپس جانا ہے تو نبی کریم ﷺ نے حضرات صحابہ کو حکم دیا کہ اپنے جانور ذبح کر دو، سرمنڈوا دو، اور احرام کھول دو۔ لیکن سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے رہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے سنا ہی نہیں۔ یہ دیکھ کر حضور اکرم ﷺ کو بہت تکلیف ہوئی کہ میں ایک چیز کا حکم دے رہا ہوں، لیکن کوئی آگے ہی نہیں بڑھتا، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سنا ہی نہ

ہو۔ آپ ﷺ اپنے خیمے میں تشریف لے گئے۔

اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا اس سفر میں ساتھ تھیں، حضور ﷺ نے ان کو سارا واقعہ بیان فرمایا کہ ایسا ہوا۔ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے جو بات کہی وہ انہوں نے سنی ہی نہیں، اس لیے کہ یہ صلح ان کو اتنی ناگوار ہوئی ہے کہ ان کے دماغ ماؤف ہو چکے ہیں (جب کسی چیز کا غم زیادہ ہوتا ہے تو آدمی کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں) اس لیے ان لوگوں نے کچھ سنا ہی نہیں ہے، آپ ان کو یہ حکم نہ دیجئے کہ جانور ذبح کر کے بال کٹوا دو، اور احرام کھول دو، بلکہ آپ ان کے سامنے اپنا جانور ذبح کیجئے، بال منڈوا دیجئے اور اپنا احرام کھول دیجئے، جب وہ آپ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھیں گے تو خود بخود آپ کی اتباع کریں گے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ باہر تشریف لائے اور جانور ذبح کیا آپ کو قربانی کرتا ہوا دیکھ کر سب لوگ اپنے جانوروں کو ذبح کرنے کے لیے ایسے لپک پڑے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ دیں گے۔

آدم برسرِ مطلب

توبات چل رہی تھی کہ جس سے مشورہ کیا جائے وہ تجربہ کار، سمجھ دار، امانت دار اور خیر خواہ ہو۔ حضور اکرم ﷺ سے بڑھ کر کس کی عقل کامل ہو سکتی ہے اور آپ سے بڑھ کر کس کا علم کامل اور مکمل ہو سکتا ہے، پھر آپ پر باری تعالیٰ کی طرف سے وحی بھی آتی تھی، اس کے باوجود باری تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکم دیا گیا: ”وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ“ اور حضور ﷺ نے اس حکم پر عمل کیا، اور بہت سی مرتبہ آپ ﷺ کا اپنا رجحان کچھ اور ہوتا تھا اس کے باوجود آپ ﷺ نے دوسروں کی رائے پر فیصلہ کیا جیسا کہ غزوہ اُحد کے موقع پر ہوا۔

صدیق کی رائے صادق

اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ عمرہ کا احرام باندھ کر روانہ ہوئے تو آپ ﷺ نے پہلے سے بُسر بن سفیان نامی ایک جاسوس کو مکہ مکرمہ بھیجا تا کہ وہ مکہ والوں کے حالات سے باخبر کرے، جب نبی کریم ﷺ غدیر الاشتات (ایک جگہ کا نام ہے) پر پہنچے تو آپ کے جاسوس نے آکر اطلاع دی کہ تمام مکہ والے جمع ہو گئے ہیں اور اطراف سے تمام قبائل کو بھی جمع کر لیا ہے، اور دودھ دینے والی اونٹنیوں اور پانی کا انتظام کر لیا ہے، اور انہوں نے طے کیا ہے کہ جو ہونا ہو وہ ہو، لیکن آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اور خالد بن ولید۔ جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، ان۔ کو مقدمۃ البکیش کے طور پر دو سو سواروں کو لے کر روانہ کر دیا ہے جو مقام غمیم میں پہنچ گئے ہیں، جب یہ اطلاع نبی کریم ﷺ کو ملی تو آپ نے مشورہ کے لیے حضرات صحابہ کو جمع کیا کہ ایسی اطلاع آئی ہے، اب بتاؤ! کیا کرنا ہے؟ اور آپ ﷺ نے اپنی رائے پیش کی کہ میرے ذہن میں تو یہ آتا ہے کہ مکہ کے آس پاس کے جو قبیلے والے مکہ والوں کا ساتھ دینے کے واسطے پہنچے ہوئے ہیں، ان کے علاقے لڑنے والوں سے خالی ہو گئے ہیں، ہم ان کے علاقوں پر جا کر حملہ کر دیں، جب ان کو اطلاع ملے گی کہ مسلمانوں نے ہمارے علاقوں پر حملہ کیا ہے تو وہ مکہ والوں کو چھوڑ کر اپنے علاقوں کی حفاظت کے لیے آجائیں گے، اور اگر نہیں آئیں گے تو نقصان اُٹھائیں گے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم اور آپ تو مدینہ منورہ سے عمرہ کے ارادے سے نکلے ہیں، اس لیے ہم تو عمرہ کے لئے آگے بڑھتے رہیں، ہم کو ان کے کسی علاقہ پر حملہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہاں! اگر مکہ مکرمہ

میں داخل ہونے سے کوئی ہمیں روکے گا تو ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔ حضور ﷺ نے ان کی رائے قبول فرمائی۔

اس واقعہ سے میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ حضور اکرم ﷺ کو مشورہ کا حکم بھی دیا گیا اور بہت سے مواقع پر دوسروں کی رائے اپنی رائے سے مخالف تھی پھر بھی حضور ﷺ نے ان کی رائے قبول فرمائی۔ اس طرح آپ ﷺ نے ایک سنت جاری فرمائی کہ اہم معاملات میں خاص طور پر مشورہ کرنا چاہیے، اور جو حضرات کسی بھی لائن کے ذمہ دار ہیں ان کو تو اور زیادہ اہتمام کرنا چاہیے، جیسے: گھر کا ذمہ دار ہو تو اس کو چاہیے کہ گھر کے دوسرے افراد جو مشورہ کے قابل ہوں، ان سے مشورہ کرے۔ یا خاندان کے دوسرے جو خیر خواہ لوگ ہوں، ان سے مشورہ کرے۔ جماعت کا کام ہے تو اس کے ذمہ داروں سے مشورہ کریں۔

بہر حال! مشورہ ایک بہت اہم چیز ہے، اور اس کی خاص تاکید فرمائی گئی ہے، اسی کو حدیث پاک میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَا خَابَ مَنْ اسْتَشَارَ، وَلَا نَدِمَ مَنْ اسْتَشَارَ (المعجم الأوسط: ۶۶۲) جس نے استخارہ کیا وہ کبھی ناکام نہیں ہوگا، اور جس نے مشورہ کیا وہ کبھی پچھتائے گا نہیں۔ اس سے مشورہ اور استخارہ دونوں کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ علامہ نووی رحمہ اللہ نے یہ باب انہی دو چیزوں کی اہمیت کو بتلانے کے لیے قائم کیا ہے۔ دو آیتیں مشورہ والی پیش فرمائی ہیں اور روایت استخارہ والی لارہے ہیں۔ ان میں سے ایک آیت ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ (آل عمران: ۱۵۹) ہوئی، اور دوسری آیت ہے ﴿وَأْمُرْهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾ (الشوری: ۳۸) اہل ایمان کے معاملات آپس کے مشورہ سے طے ہوتے ہیں۔ گویا مشورہ کو ایمان والا ہونے کی علامت بتلایا گیا۔ اس لیے ضروری ہے کہ مشورہ ہو، اس کے اندر بڑی برکتیں ہیں، جہاں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے، وہاں اس کے بڑے اچھے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

استخارہ کی تعلیم اور اس کی اہمیت

۷۱۸:- وعن جابر بن عبد الله عن رسول الله ﷺ يُعَلِّمُنَا الاسْتِخَارَةَ فِي الْأُمُورِ كُلِّهَا، كَالسُّورَةِ مِنَ الْقُرْآنِ، يَقُولُ: إِذَا هَمَّ أَحَدُكُمْ بِالْأَمْرِ، فَلْيَرْكَعْ رَكَعَتَيْنِ مِنْ غَيْرِ الْفَرِيضَةِ، ثُمَّ لِيَقُلْ: اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْتَخِيرُكَ بِعِلْمِكَ، وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ، وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيمِ، فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا أَقْدِرُ، وَتَعْلَمُ وَلَا أَعْلَمُ، وَأَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ. اللَّهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ "هَذَا الْأَمْرَ" خَيْرٌ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أُمْرِي (أَوْ قَالَ) عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ، فَاقْدُرْهُ لِي وَيَسِّرْهُ لِي، ثُمَّ بَارِكْ لِي فِيهِ. وَإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ "هَذَا الْأَمْرَ" شَرٌّ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أُمْرِي (أَوْ قَالَ) عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ، فَاصْرِفْهُ عَنِّي، وَاصْرِفْنِي عَنْهُ، وَاقْدِرْ لِي الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ، ثُمَّ أَرْضِنِي بِهِ. (قَالَ): وَيُسَبِّحُ حَاجَتَهُ. (رواه البخاري).

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہم لوگوں کو تمام معاملات میں استخارہ کرنا اس طرح سکھاتے تھے جیسے قرآن پاک کی سورت سکھاتے تھے۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ جب تمہیں کوئی معاملہ پیش آئے تو چاہیے کہ (اگر مکروہ وقت نہ ہو تو) دو رکعت نفل پڑھے، اس کے بعد یہ دعا پڑھے: اے اللہ! میں تیرے علم کے ذریعہ سے تجھ سے خیر کا سوال کرتا ہوں، اور تیری طاقت سے میں طاقت چاہتا ہوں۔ اے اللہ! میں تیرے بڑے فضل کا سوال کرتا ہوں، اس لیے کہ تو قدرت رکھتا ہے، میرے اندر تو قدرت اور طاقت نہیں ہے، اور سارا علم تو تیرے پاس ہی ہے، میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ اور تو غیب کی باتوں کو بھی جاننے والا ہے۔ اے اللہ! اگر تیرے علم میں یہ ہے کہ "یہ کام" جس کام میں ارادہ کر رہا ہوں، اس میں میرے لیے میرے دین کے اعتبار سے، دنیوی زندگی کے اعتبار سے، اور انجام کار اور نتیجہ کے اعتبار سے بھلائی ہے، یا فوری طور پر میرے

اس کام میں بھلائی ہے؛ تو اے اللہ! اس کام کو میرے لیے مقدر فرما دے، اور اس کام کو میرے لیے آسان بھی کر دے اور پھر اس کام میں میرے لیے برکت رکھ دے۔ اور اے اللہ! اگر تو نے اپنے علم میں یہ بات طے کی ہے کہ ”یہ کام“ میرے لیے میرے دین کے اعتبار سے، اور میری دنیوی زندگی کے اعتبار سے، اور میرے انجام کار کے اعتبار سے برا ہے اور اس میں میرے لیے بھلائی نہیں ہے؛ تو اے اللہ! اس کام کو مجھ سے پھیر دے، اور مجھے اس سے پھیر دے۔ اور پھر بھلائی جہاں کہیں بھی ہو، اس کام میرے لیے فیصلہ کر دے، پھر مجھے اس پر راضی کر دے۔

اہتمامِ استخارہ کی وجہ

افادات:- حضور اکرم ﷺ قرآن پاک کی سورتیں جس اہتمام اور تاکید سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سکھاتے تھے، اسی اہتمام اور تاکید کے ساتھ استخارہ اور اس کی دعا بھی صحابہ کو سکھاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں نے اپنے اہم معاملات کے فیصلے کرنے کے لیے عجیب و غریب طریقے اختیار کر رکھے تھے، جن کی بنیادیں صرف توہمات اور خیالات پر تھیں اور ان کو بڑی اہمیت دے رکھی تھی، حضور اکرم ﷺ نے زمانہ جاہلیت میں رائج ان توہمات پر مبنی سارے طریقوں کو منع فرما دیا، اور ایک بہترین چیز امت کو عطا فرمائی۔

کہانت

وہ مختلف طریقے کیا تھے جو اس زمانہ میں رائج تھے؟

ایک طریقہ ”کہانت“ تھا۔ ”کاہن“ وہ آدمی کہلاتا ہے جو مستقبل کی خبریں بتائے؛ جس کو ہم جوتی کہتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں کاہنوں کا بڑا رواج اور دور دورہ تھا کوئی قبیلہ ایسا نہیں تھا جس میں کوئی کاہن نہ ہو اور وہ قبیلے والے اپنے اہم معاملات میں

اس کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور چوں کہ وہ دعویدار ہوتا تھا کہ آئندہ جو باتیں پیش آنے والی ہیں وہ میں جانتا ہوں، اس لیے لوگ اس سے پوچھتے تھے کہ مثلاً: ہم اپنے لڑکے کی شادی فلاں جگہ کرانا چاہتے ہیں، ٹھیک رہے گا یا نہیں؟ پھر وہ اپنے حساب سے کہتا کہ، ہاں صحیح ہے؛ تو وہ کرتے تھے۔ یا کوئی پوچھتا کہ: ہم یہ تجارت کرنا چاہتے ہیں، فلاں کاروبار شروع کرنا چاہتے ہیں، فلاں سفر کرنا چاہتے ہیں، ایسے مختلف اہم کاموں کے سلسلہ میں کاہنوں کے پاس جاتے تھے اور کاہن ویسے ہی مشورہ نہیں دیتا تھا، بلکہ جانے والا پہلے اس کی خدمت میں ہدیہ پیش کرتا تھا جو عام طور پر سودرہم ہوتے تھے، یہ معمولی رقم نہیں ہوتی تھی بلکہ بڑی رقم ہوتی تھی، اس کے بعد وہ اپنی حاجت پیش کرتا تھا کہ میں اس مقصد کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ یہ جو رقم پیش کی جاتی تھی اسی کو حدیث میں ”حُلْوَانُ الْكَاهِنِ“ کاہن کی شیرینی اور مٹھائی کہا گیا ہے۔ ہماری زبان میں بھی مٹھائی بول کر مٹھائی مراد نہیں لی جاتی، جیسے: کہتے ہیں کہ بھائی! مٹھائی لاؤ یعنی کوئی چیز لاؤ۔ اور حضور اکرم ﷺ نے حرام کمائی کی جو چیزیں بتلائی ہیں اس میں ”حلوان الکاهن“ بھی ہے، یعنی کاہن کی خدمت میں اس مقصد کے لیے جو کچھ پیش کیا جاتا تھا؛ چوں کہ ایک غلط کام کے لیے ہوتا تھا، اس لیے وہ کمائی بھی حرام ہے۔

زَجْر

دوسرا طریقہ ”زَجْر“ کا تھا، یعنی کبھی کسی کام کا ارادہ کرتے تھے تو جانوروں کی آوازیں سنتے تھے۔ اس زمانہ میں بعض قبیلہ کے لوگ ایسے ہوتے تھے جو جانوروں کی آوازوں کے ماہر ہوتے تھے، وہ ان کی آوازیں کر بتاتے تھے کہ اس جانور کی اس آواز کا مطلب یہ ہے کہ تم کو یہ کام نہیں کرنا چاہیے، اس میں کامیابی نہیں ہوگی، کبھی کہتے کہ کرو؛

کامیابی ہوگی۔ اسی طرح باہر نکلے اور کوئی جانور سامنے سے گزر گیا، جیسے: بلی سامنے سے گزری، تو سمجھتے تھے کہ یہ کام نہیں کرنا ہے، آج بھی ایسا ہوتا ہے کہ بلی اگر راستہ کاٹ جائے تو بعض لوگ واپس گھر میں گھس جاتے ہیں، یعنی تمہاری قسمت کا سارا فیصلہ اس بلی ہی نے کر ڈالا۔ جب ہمارا ایمان تقدیر پر ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ طے کر چکے ہیں، تو بلی کے گزر جانے سے اس میں کوئی تبدیلی آسکتی ہے؟ اسی کو ”زجر“ والا طریقہ کہتے تھے۔

تَطْيَر اور طيرہ

ایک تیسرا طریقہ بھی تھا، جس کو ”تَطْيَر اور طيرہ“ کہتے ہیں، یعنی شگون اور فال لینا۔ اس میں یہ کرتے تھے کہ گھر سے باہر نکلے اور کوئی پرندہ بیٹھا ہو ادیکھا تو کنکر مار کر اس کو اڑاتے تھے، اگر وہ اڑ کر دائیں طرف گیا تو سمجھتے تھے کہ اس کام میں کامیابی ہوگی اور بائیں طرف جاتا تو سمجھتے تھے کہ ناکامی ہوگی۔ دائیں طرف جانے والے پرندے کو یہ لوگ ”سواخ“ کہتے تھے، اور بائیں طرف جانے والے کو ”بوارح“ کہتے تھے۔

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ یہ معاملہ عقل کے بالکل خلاف ہے یا نہیں! ایک جانور اگر اڑا، تو اس کو تمہارے کام سے کیا لینا دینا۔ وہ اگر دائیں طرف اڑا تو کامیابی اور بائیں طرف اڑا تو ناکامی؛ یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ عقل اس کو تسلیم کر سکتی ہے؟ یہ سب تو ہمت ہیں، اسلام ایسی چیزوں کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اسلام تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین و توکل اور بھروسہ کرنے اور اسی سے امیدیں قائم کرنے کا سبق دیتا ہے۔

اِسْتِقْسَام بِالْأَزْلَامِ

ایک اور طریقہ ”اِسْتِقْسَام بِالْأَزْلَامِ“ کا تھا۔ تیروں کے پاسے ڈالے جاتے تھے۔ ویسے تیر میں تو آگے لوہے کا نوکیلا حصہ اور پیچھے پڑ ہوتا ہے، لیکن اس کام

کے لیے جو تیر ہوتے تھے اس میں آگے اور پیچھے کچھ نہیں ہوتا تھا، صرف لکڑی ہوتی تھی، اور ایسے کل سات تیر ہوتے تھے۔ ایک تیر پر لکھا ہوتا تھا: ”أَمَرَنِي رَبِّي“ مجھے میرے رب نے اس کام کو کرنے کا حکم دیا۔ دوسرے پر لکھا ہوتا تھا: ”نَهَانِي رَبِّي“ مجھے میرے رب نے اس کام سے منع کیا۔ یہ دو تیر ہوئے، تین تیر اور ہوتے تھے، ایک پر لکھا ہوتا تھا: ”وَاحِدٌ مِنْكُمْ“ دوسرے پر ہوتا تھا: ”مِنْ غَيْرِكُمْ“ تیسرے پر لکھا ہوتا تھا: ”مُلَصَّقٌ“۔ دو تیر اور ہوتے تھے، ایک پر لکھا ہوتا تھا: ”الْعَقْلُ“ اور دوسرے پر لکھا ہوتا تھا: ”الْغَفْلُ“؛ اس طرح کل سات تیر ہوئے۔

عام طور پر ان کے یہاں کوئی جھگڑا کسی کے نسب کے بارے میں ہوتا کہ یہ تمہارے قبیلے سے ہے یا نہیں؛ تو اس جھگڑے کے لیے تو وہ تین تیر استعمال کئے جاتے تھے۔ اور اگر کسی کے قتل کا معاملہ ہو، اور اس سے خون بہا اور دیت لینی ہو، تو اس کے لیے آخری دو تیر استعمال کئے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ اور کوئی بھی اہم کام ہوتا تھا تو اس کے لیے پہلے والے دو تیر استعمال ہوتے تھے۔ اور چوں کہ وہ لوگ بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے، اور ہر قبیلے کا ایک بت ہوا کرتا تھا، اور وہ بت جس مکان اور بت خانے میں رکھا ہوتا تھا اس کے پجاری کی بہت ساری ذمہ داریاں اور ڈیوٹیاں ہوتی تھیں، ان میں سے ایک ذمہ داری اور ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ لوگوں کے معاملات میں مشورہ دے اور فیصلہ کرے۔ یہ سب تیر الگ الگ تھیلوں میں اس پجاری کے پاس اسی بت خانے میں رکھے ہوتے تھے۔ اب مثلاً: کسی کو سفر کرنا ہوتا تو وہ مندر کے اس پجاری کے پاس جاتا اس کو ہدیہ پیش کرتا، پھر سوال کرتا کہ: ایک تجارتی سفر کا ارادہ ہے، اس سلسلہ میں کیا فیصلہ ہے؟ تو وہ دو تیر والا چمڑے کا ایک تھیلا نکالتا۔

اور بعض روایتوں میں ہے کہ وہ دو تیر نکال کر اس پر کپڑا ڈال دیتا تھا، آنکھیں

بندر کے کچھ بڑا کر ایک تیر اٹھاتا تھا اور اس پر دیکھتا کہ کیا لکھا ہوا ہے، اگر وہ تیر ہوتا جس پر ”أَمْرِي رَيْبٌ“ لکھا ہوتا تھا کہ مجھے میرے رب نے اس کام کو کرنے کا حکم دیا؛ تو کہتا یہ سفر کرو، اس میں کامیابی ہے۔ اور اگر دوسرا تیر نکلتا جس پر لکھا ہوتا تھا ”نَهَائِي رَيْبٌ“ مجھے میرے رب نے اس کام سے منع کیا؛ تو کہتا کہ یہ سفر کرنے جیسا نہیں ہے۔ اور یہاں رب بول کرو ہی بت مراد ہوتا تھا جو اس مندر میں رکھا ہوتا تھا، اور اس کی بنیاد تو ہم پر تھی۔ یہ سارے طریقے زمانہ جاہلیت میں رائج تھے، اور اس کا بڑا رواج تھا۔

ایک غلط رواج

آج کل بھی فال کے نام پر بہت کچھ کیا جاتا ہے، جیسے: بعض لوگ کرتے ہیں کہ قرآن کھولو، ایک دو صفحات ادھر ادھر سے دیکھ کر کہتے ہیں کہ، یہ کرو، اور یہ مت کرو۔ ان سے پوچھئے کہ یہ طریقہ کہیں کسی حدیث میں آیا ہے؟ بالکل نہیں۔ اور بعض طریقے تو زمانہ جاہلیت والے طریقوں سے بالکل مشابہ ہو جاتے ہیں، اس لیے ان سارے طریقوں کو چھوڑ کر حضور اکرم ﷺ نے استخارہ کا طریقہ بتایا ہے، وہ کرو۔

استخارہ کی لغوی تحقیق

استخارہ عربی زبان کا لفظ ہے، اور عربی زبان کے مصدر استفعال سے ہے۔ اب اس کا مادہ کیا ہے؟ تو بعض حضرات تو فرماتے ہیں کہ استخارہ ”خیر“ سے مشتق ہے، ”سین“ اور تاء طلب کا معنی دینے کے لیے آتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ سے خیر اور بھلائی طلب کرنا۔ گویا جو کام کرنا ہے اس میں اللہ تعالیٰ سے خیر کا سوال کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے جو حضور اکرم ﷺ نے بتلایا۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مادہ ”خَبَّرَ“ ہے، جس کا معنی ہے انتخاب اور فیصلہ۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:

﴿مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ﴾ تو استخارہ یعنی اللہ تعالیٰ سے فیصلہ مانگنا کہ اے اللہ! میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں، تو ہی اس کام میں میرے لیے فیصلہ کر دے کہ میں کروں یا نہ کروں۔

استخارہ کن کاموں میں کیا جائے؟

”إِذَا هُمْ أَحَدُكُمْ بِالْأَمْرِ“ یعنی جب تم کو کوئی معاملہ پیش آئے۔ یہاں کون سا معاملہ مراد ہے؟ تو سمجھنا چاہیے کہ ایک تو روزمرہ کے معاملات ہوتے ہیں جن کو امور عادیہ کہا جاتا ہے، جیسے: کھانا، پینا، سونا، دوکان اور کاروبار پر جانا وغیرہ؛ اس کے لیے استخارہ نہیں کیا جائے گا، یہ تو روزمرہ کے امور عادیہ ہیں۔

کچھ کام وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور شریعت کی طرف سے لازم اور ضروری کئے گئے ہیں، جیسے: پنج وقتہ نماز پڑھنا، روزے رکھنا، حج کرنا وغیرہ۔ تو اب میں حج کروں یا نہ کروں؟ ایسا استخارہ نہیں کیا جائے گا۔ جب تم پر حج فرض ہو گیا ہے تو وہ تو کرنا ہی کرنا ہے، اس میں استخارہ کیا معنی رکھتا ہے؟ میں نماز پڑھنے کے لیے جاؤں یا نہ جاؤں؟ یہ استخارہ کی چیز نہیں ہے۔ جو چیز شریعت کی فرض و واجب کی ہوئی ہے؛ اس میں استخارہ کیا کرنا؟

کچھ کام حرام اور ممنوع ہیں، ان کے بارے میں استخارہ کرنا کہ مثلاً: فحشاں جگہ ڈاکہ ڈالنا ہے؛ جاؤں یا نہ جاؤں؟ جیسے: بعض لوگ (لاٹری کا) نمبر پوچھنے کے لیے جاتے ہیں۔ ارے بھائی! یہ تو حرام کام ہے جو کرنے کا ہے ہی نہیں۔ تو جو حرام اور ناجائز کام ہیں ان کے لیے بھی استخارہ نہیں ہے۔

استخارہ تو ان کاموں میں ہوتا ہے جو جائز ہیں، یا کم از کم مستحب ہیں کہ جن کے کرنے میں ثواب ہے، اور نہ کرنے میں کوئی گناہ نہیں، جیسے: فلاں گاؤں میں مسجد بنانی ہے، تو بناؤں یا نہ بناؤں؟ اس کا استخارہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ مسجد نہ بنانے پر

کوئی گناہ ہونے والا نہیں ہے۔ یا مسجد تو بنانی ہی ہے لیکن کون سے گاؤں یا شہر میں بناؤں، اس کا استخارہ کر سکتے ہیں۔ تو استخارہ ناجائز کام کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ جائز اور مباح کام کے لئے ہوتا ہے۔ مثلاً: آپ کا روبرو کرنا چاہتے ہیں، اب کون سا کاروبار کروں، کپڑوں کی دلالی کا کروں، دوکان کھولوں، ہوٹل کھولوں، فلاں کام کروں، یا فلاں کروں؛ کئی چیزیں آپ کے سامنے ہیں اور مختلف لوگوں نے مختلف باتیں رکھی ہیں کہ تمہارے لیے فلاں چانس ہے، اور فلاں چانس بھی ہے، اور وہ سب جائز کام ہیں؛ تو اب آپ استخارہ کیجئے، پھر فیصلہ کیجئے۔ یا مثلاً: کوئی سفر درپیش ہے، اور اس کے معاملہ میں تردد ہے کہ کروں یا نہ کروں۔ یا مثلاً: نکاح کا معاملہ ہے، لڑکی کا رشتہ کرنا ہے، اور تردد ہے کہ کروں یا نہ کروں؛ تو اس سلسلہ میں استخارہ کر لیجئے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی اہم کام ہو، جو روزمرہ کا نہ ہو، بلکہ زندگی میں ایک آدھ بار کیے جانے والے کاموں میں سے ہو؛ ایسے کاموں میں آدمی کو چاہیے کہ استخارہ کرے، بس! شرط یہ ہے کہ وہ جائز کام ہو۔

مسنون استخارہ

”دور کعت نفل پڑھے“: اور یہ یاد رہے کہ ایسا بھی ضروری نہیں ہے کہ سوتے وقت ہی ہو، کبھی بھی نماز پڑھ کر دعا کر لیجئے، بس مکروہ وقت نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں! یہ ہے کہ اطمینان اور یکسوئی والا استخارہ وہ ہے کہ رات کو سونے سے پہلے دور کعت پڑھ کر دعا کر لی جائے، پھر سنت کے مطابق دائیں کروٹ پر رخ کر کے سو جائے، لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے، اس دعا کے پڑھنے کے بعد سو جانے والی بات کسی حدیث میں نہیں آئی ہے، اگر آپ نے دور کعت نماز پڑھ کر استخارہ والی دعا پڑھ لی، تو مسنون استخارہ ہو گیا اور حدیث پر عمل ہو گیا۔ یہ یاد رہے۔

دعا کے آداب

حدیث میں دعا کے آداب آئے ہیں، تو آداب کا تقاضہ ہے کہ اس دعا سے پہلے ان کا بھی لحاظ کر لیا جائے۔ دعا کے آداب میں سے یہ ہے کہ دعا کی شروعات اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء سے کی جائے، جیسے: کسی کے نام درخواست لکھتے ہیں اور عرضی لے کر جاتے ہیں تو اپنی بات پیش کرنے سے پہلے اس کے القاب و آداب لکھے جاتے ہیں کہ، آپ ایسے ہیں اور ویسے ہیں، لوگوں کی حاجتوں کی طرف توجہ کرنے والے ہیں، میں بھی آپ کی خدمت میں اس امید پر یہ درخواست پیش کر رہا ہوں کہ اس کو آپ قبول فرمائیں گے۔ یہ پورا ایک طریقہ ہے، اسی کو تمہید کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی حمد بہت پسند ہے، اس لیے دعا کے آداب میں سے یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی جائے۔

یہ سب حمد و ثناء ہی ہے

بعض لوگ سوچتے ہیں کہ حمد کے لیے عربی کے الفاظ کہاں سے یاد کریں؟ تو بھائی الحمد شریف تو سب کو یاد ہی ہوتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی حمد ہی ہے، نماز میں پڑھی جانے والی ثناء بھی حمد ہی ہے، تیسرا اور چوتھا کلمہ بھی اللہ تعالیٰ کی حمد ہی ہے، آیت الکرسی بھی حمد ہی ہے، ان میں سے کوئی بھی پڑھ لو۔ یہ سب آسانی کے لیے بتلا رہا ہوں، اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء آگئی۔ پھر دعا کو قبولیت سے قریب کرنے والی چیز نبی کریم ﷺ پر درود ہے، اس لیے حمد و ثناء کے بعد درود پڑھو، سب سے اعلیٰ درود وہی ہے جو نماز کے اندر پڑھا جاتا ہے جس کو درود ابراہیمی کہتے ہیں، اس کے علاوہ بھی دوسرے درود پڑھنا چاہو تو پڑھو، اس کے بعد پھر استحارہ والی یہ دعا پڑھو۔

دعائے استخارہ کی تشریح

”اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُكَ بِعِلْمِکَ“ اے اللہ! میں تیرے علم کے ذریعہ تجھ سے خیر کا سوال کرتا ہوں۔ جیسے: کوئی ہم سے زیادہ جاننے والا ہوتا ہے تو ہم اس سے کہتے ہیں کہ بھائی! اس سلسلہ میں آپ ہی بتاؤ۔ تو اللہ تعالیٰ کا علم ساری چیزوں کو محیط ہے، تو اس میں آدمی اللہ تعالیٰ سے خیر و بھلائی یا فیصلہ مانگتا ہے۔

”وَأَسْتَغْفِرُكَ بِقُدْرَتِکَ“ اور تیری طاقت سے میں طاقت چاہتا ہوں۔ ہم لوگوں نے اپنا ذہن ایسا بنالیا کہ ہماری سوچ اسباب و وسائل تک محدود ہو گئی۔ جیسے: ایک آدمی تجارت کرنا چاہتا ہے، تو اس کے لیے جگہ اور جتنے کونٹیکٹ (Contact) ضروری ہیں وہ، اور ایڈورٹائز وغیرہ؛ یہ ساری چیزیں اختیار کر لیتا ہے، پھر وہ آدمی سمجھتا ہے کہ اب میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ یہیں آکر ہم سے غلطی ہو جاتی ہے، حالاں کہ ایک مؤمن کی نظر ان اسباب و وسائل کی طرف نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہونی چاہیے، اسباب و وسائل کو سبب کے درجہ میں اختیار کرے، لیکن نظر مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہی ہونی چاہیے، بھروسہ و اعتماد اسی پر ہو، کرنے والا وہی ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ”عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ“ میں نے اپنے رب کو اپنے پختہ ارادوں کے ٹوٹنے پر پہچانا۔ آدمی کیسے کیسے پکے ارادے کرتا ہے اور اس کے لیے کیسی لمبی چوڑی پلاننگ کرتا ہے، لیکن ساری پلاننگ زلزلہ کے ایک جھٹکے میں ختم ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے انسان کی ساری پلاننگ کی کیا حیثیت ہے؟

جب جیب کٹی

ایک آدمی گھوڑا خریدنے جا رہا تھا، کسی نے پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ کہا: گھوڑا

خریدنے۔ پوچھنے والے نے کہا: ان شاء اللہ کہو۔ تو وہ کہتا ہے: اس میں ان شاء اللہ کیا کہنا! میرے پاس پیسے ہیں، بازار جا رہا ہوں، وہاں گھوڑے بکنے کے لیے آئے ہیں، میں خریدنے کے لیے جا رہا ہوں، اگر پسند آ گیا تو لے لوں گا؛ اب اس میں کیا باقی رہ گیا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے بھائی! جاؤ۔ دوسرے دن بازار لگنے والا تھا، یہ آدمی گیا، رات میں ایک مسافر خانہ میں آرام کیا، اسی میں اس کی جیب کٹ گئی۔ صبح اُٹھ کر دیکھتا ہے تو پیسے ہی نہیں ہیں، اب کیا گھوڑا خریدتا! واپس لوٹ رہا تھا، وہی آدمی ملا تو پوچھنے لگا کہ بھائی! کیا ہوا؟ گھوڑا نہیں خریدا؟ تو یہ کہتا ہے: بس! ان شاء اللہ میں جا رہا تھا، ان شاء اللہ وہاں پہنچا، ان شاء اللہ رات کو سو گیا، ان شاء اللہ صبح جب اُٹھا تو دیکھا کہ ان شاء اللہ میری جیب کٹ گئی تھی، تو ان شاء اللہ اب میں واپس ہو رہا ہوں۔ جب جیب کٹی تو سبق سمجھ میں آ گیا، اور ایسا آیا کہ جہاں ان شاء اللہ نہیں کہنا چاہیے وہاں بھی ان شاء اللہ منہ سے نکل رہا ہے۔

دعائے استخارہ کی روح

اسی لیے اسباب اختیار کرنے کے بعد بھی مؤمن کی نگاہ اور اعتماد تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہی پر ہونی چاہیے؛ اسی کا نام توکل ہے۔ اور اعلیٰ درجہ کا توکل یہی ہے کہ بظاہر سب کچھ نظر آ رہا ہے، ایک پائی کی بھی کمی نہیں ہے، دل کا یقین کہتا ہے کہ یہ کام ہو کر رہے گا؛ پھر بھی اس پر بھروسہ نہ ہو۔ مؤمن تو ہر وقت یہی کہتا کہ اگر اللہ تعالیٰ کرے گا تو ہوگا۔ استخارہ کی دعا میں یہی سکھایا گیا ہے۔ توکل یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد و بھروسہ، تفویض یعنی اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرنا۔ جیسے: ہمارا چھوٹا بچہ کہتا ہے کہ ابا جان! میرے پاس یہ سب کچھ ہے، لیکن آپ جو فیصلہ کریں گے، میں تو اسی پر چلوں گا؛ تو آپ اندازہ لگائیے کہ باپ کو اس بچے کے ساتھ کیسا تعلق ہوگا؟ پھر باپ پوری

کوشش کرے گا کہ یہ کام پورا ہونا ہی چاہیے۔ تو ہم جب اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیں گے اور کہیں گے کہ: اے اللہ! میں نے یہ اسباب تو اپنی جگہ پر اختیار کر لیے، لیکن میرے علم اور میری قدرت کی کیا حیثیت ہے، تیرا علم تیری قدرت اور تیرا فیصلہ ہی سب کچھ ہے، تو جو کرے اسی پر میں آس اور امید لگائے ہوئے بیٹھا ہوں؛ تو پھر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کیا کرتا ہے۔

در اصل نبی کریم ﷺ کی تعلیمات ہر مومن کا مزاج یہی بنانا چاہتی ہے۔ اسباب کے اختیار کرنے سے منع نہیں کیا، بلکہ اسباب کا حکم دیا کہ اسباب اختیار کرو، لیکن نظر ان اسباب پر نہیں ہونی چاہیے، بلکہ نظر اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونی چاہیے۔ اسی کو کہتے ہیں: ”وَأَسْتَغْفِرُكَ بِقُدْرَتِكَ“ اے اللہ! تیری طاقت سے میں طاقت حاصل کرنا چاہتا ہوں، میرے اندر قدرت اور طاقت ہی کہاں ہے، قدرت والا تو تو ہی ہے، تیری ذات ہی سے میں مدد و قدرت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

”وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيمِ“ اور اے اللہ! میں تیرے بڑے فضل کا سوال کرتا ہوں، میرا تجھ پر کوئی حق نہیں ہے۔ کیا بندے کی اللہ تعالیٰ پر کوئی زبردستی ہے؟ وہ دے تو اس کا فضل ہے، اور اگر نہ دے تو اس سے چھین کر کون لے سکتا ہے؟ اس لیے کہا کہ: اے اللہ! تیرا فضل بہت بڑا ہے، اسی فضل عظیم کا میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔

آگے فرمایا: ”فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا أَقْدِرُ“ اس لیے کہ تو قدرت رکھتا ہے، میرے اندر تو کوئی قدرت اور طاقت نہیں ہے۔

”وَتَعْلَمُ وَلَا أَعْلَمُ“ اور سارا علم تو تیرے پاس ہے، میں تو کچھ جانتا بھی نہیں، اس کام کا آئندہ کیا نتیجہ ہونے والا ہے، اور آگے پیچھے، اندر باہر اس کے کیا اثرات ہیں؛ وہ سب تو جانتا ہے، میں تو جانتا بھی نہیں۔

”وَأَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ“ اور تو غیب کی باتوں کو بھی جاننے والا ہے۔

دعا کا عجیب و غریب انداز

یہ سب کہنے کے بعد اب آگے کہا جا رہا ہے کہ: اے اللہ! اگر تیرے علم میں یہ ہے کہ ”یہ کام“ جس کا میں ارادہ کر رہا ہوں، اس میں میرے لیے میرے دین کے اعتبار سے، دنیوی زندگی کے اعتبار سے، انجام کار اور نتیجہ کے اعتبار سے بھلائی ہے؛ تو اس کام کو تو میرے لیے آسان کر دے، اور میری تقدیر میں لکھ دے۔ دیکھو! جتنی بھلائیاں ہو سکتی ہیں، وہ سب مانگ لیں۔

اور بعض روایتوں میں ہے کہ فوری طور پر میرے اس کام میں میرے لیے دنیا اور آخرت میں بھلائی ہے، تو اے اللہ! اس کام کو میرے لیے مقدر فرما دے، اور اس کا فیصلہ کر دے کہ یہ کام ہو جائے، اور اس کام کو میرے لیے آسان بھی کر دے، پھر اس کام میں میرے لیے برکت رکھ دے۔ اور اے اللہ! اگر تو نے اپنے علم میں یہ بات طے کی ہے کہ ”یہ کام“ میرے لیے میرے دین، میری دنیوی زندگی، اور میرے انجام کار کے اعتبار سے برا ہے، اس میں میرے لیے بھلائی نہیں ہے، تو اس کام کو مجھ سے پھیر دے، اور مجھے اس سے پھیر دے، اور پھر بھلائی جہاں کہیں بھی ہو، اس کا میرے لیے فیصلہ کر دے، اور پھر مجھے اس پر راضی کر دے۔

بہت سی مرتبہ کوئی بات ہماری بھلائی کی ہوتی ہے، لیکن ہمارا دل اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا، پھر بعد میں کہتے ہیں کہ یا روہی ٹھیک تھا۔ اس لیے کہا کہ اس وقت میں اس کو دل سے مان لوں۔

غور کیجئے کہ حضور اکرم ﷺ نے کیسا کیسا مانگا ہے! کیسی عجیب و غریب چیزیں

ہیں! ایک بندہ جب اپنے کسی کام میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح سوال کرے گا کہ گویا اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر رہا ہے اور اس کے بعد آگے بڑھ رہا ہے، تو اندازہ لگائیے کہ کبھی وہ ناکام ہو سکتا ہے؟ اور اگر خدا نہ کرے کبھی ظاہری طور پر کوئی ناکامی ہوئی؛ تب بھی اس کا دل مطمئن رہے گا۔ ”هَذَا الْأَمْرُ“ کہتے وقت اس کام کا دل میں تصور کر لے، یا زبان سے اس کام کو بولے۔ یہ استخارہ کا طریقہ ہے۔

دیکھئے! نبی کریم ﷺ نے کیسی بہترین تعلیم دی ہے! ایک بندے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بالکلیہ جوڑ دیا، جیسا کہ پہلے بچہ کی ایک مثال دی تھی۔ اسی طرح ہمارا نوجوان بیٹا ہے جس کے پاس سب کچھ ہے، اس میں ساری صلاحیتیں ہیں اس کے باوجود سب کچھ ابا کے حوالہ کر دے کہ آپ جو کہیں گے وہی ہوگا، تو ابا جان کبھی کوئی ایسی شکل سوچیں گے ہی نہیں جس میں ناکامی ہو، بلکہ اس کو پورے طور پر کامیاب کرا کر ہی رہیں گے۔ اسی طرح بندہ جب اپنے آپ کو پورا اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دے گا اور اللہ تعالیٰ ہی سے توفیق مانگے گا اور اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر چلے گا؛ تو پھر وہ ضرور کامیاب ہوگا۔

استخارہ کے بعد پتہ کیسے چلے؟

اب استخارہ کے بعد فیصلہ خواب میں نظر آنا چاہیے یا نہیں؟ تو یہ دھیان رہے کہ خواب کا نظر آنا تو کوئی ضروری نہیں ہے۔ ہاں! کبھی آ بھی جاتا ہے کہ آدمی اس کام کو کرتے ہوئے دیکھتا ہے، گویا اشارہ ہوتا ہے کہ یہ کام کرو، کبھی اس کام سے دور ہوتے ہوئے اور بچتے ہوئے دیکھتا ہے، یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ کام مت کرو۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ اور اگر کوئی خواب تو نظر نہیں آیا، مگر استخارہ کرنے سے پہلے اس کام کو کرنے کا آپ کے دل میں جو خیال تھا وہ استخارہ کے بعد اور زیادہ جم گیا اور مضبوط ہو گیا، وہ

خیال اور قوی ہو گیا؛ یہ بھی اس بات کی علامت ہے کہ اس کام کو کرو۔ یا اس کام کا ارادہ استخارہ کے بعد کم ہو گیا؛ تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ مت کرو۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ استخارہ کے بعد اپنے کسی محسن سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ کرو، تو یہ علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس استخارہ کے نتیجے میں اس کے دل میں ڈالا ہے کہ اس سے کہو کہ اس کام کو کرے؛ لہذا اس کو کر لو۔ یا اس نے منع کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں منع کرنے کا خیال ڈالا، یہ اسی استخارہ کا اثر ہوتا ہے؛ لہذا مت کرو۔

استخارہ کتنے دن؟

اب استخارہ کتنے دنوں تک کیا جائے؟ تو فقہاء نے لکھا ہے کہ سات دن تک کیا جائے، اور اگر جلدی ہو تو ایک ہی دن میں سات مرتبہ یہ دعا پڑھ لی جائے۔ اور بعض حضرات تو فرماتے ہیں کہ یہ دعا پڑھ لینے کے بعد وہ کام کر ڈالو، جو خیر ہوگی وہی کام اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ سے کروائے گا۔

دوسرے سے استخارہ کروایا جاسکتا ہے؟

تو اس سلسلہ میں میں نے کسی کتاب میں دیکھا نہیں ہے، اور پہلے پہل جب میں نے سنا کہ کسی دوسرے سے استخارہ کروایا جاتا ہے، تو مجھے بھی عجیب و غریب لگا کہ اپنا کام ہے اور دوسرے سے کیسے استخارہ کروایا جائے؟ لیکن اپنے بزرگوں میں سے بعض کے یہاں سنا کہ فلاں صاحب نے ان سے استخارہ کروایا اور انہوں نے کر کے دیا تو پھر ہم بھی ماننے والے بن گئے۔ ورنہ کسی کتاب میں میں نے یہ طریقہ دیکھا نہیں ہے کہ اپنا استخارہ دوسرے سے کرواؤ۔ یہاں اہل علم موجود ہیں، ان میں اگر کسی نے کسی کتاب میں دیکھا ہو، تو مجھے بھی بتادیں؛ تاکہ میرے علم میں اضافہ ہو جائے۔

استحباب الذهاب الى العيد الخ عید کی نماز کے لیے مختلف راستوں سے آنا جانا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

باب کا عنوان

آداب کا بیان چل رہا ہے، ایک اور ادب بتلایا جا رہا ہے کہ: عید کی نماز کے لیے جاتے ہوئے اور واپسی میں، اسی طرح بیمار کی خبر گیری اور عیادت کے لیے جانے آنے میں، اسی طریقہ سے حج کے لیے، اللہ کے راستہ میں جہاد کے لیے، جنازہ کی شرکت کے لیے، اور جتنے بھی نیکی کے کام ہیں، ان سب میں مستحب یہی ہے کہ اگر ایک راستہ سے جائے تو دوسرے راستہ سے لوٹے؛ تاکہ نیکی کی جگہیں زیادہ سے زیادہ ہو جائیں۔

قیامت کی کچھری کے گواہ

در اصل یہ بات تو قرآن پاک کی آیت اور احادیث سے ثابت ہے کہ بندے کے اعمال کے متعلق قیامت میں اللہ تعالیٰ جن گواہوں کو قائم فرمائیں گے، ان میں زمین کے وہ حصے بھی ہوں گے جہاں اس نے وہ اعمال کیے تھے۔ آدمی جو بھی اعمال کرتا ہے ان کے متعلق مختلف گواہ قیامت کے دن پیش کیے جائیں گے، جیسے: کورٹ کا دستور ہے کہ مجرم کے خلاف ثبوت مہیا کیے جاتے ہیں اور ان ثبوت کو پیش کرنے کے بعد اس کے اوپر جرم ثابت کیا جاتا ہے، پھر سزا کا فیصلہ سنایا جاتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی کارروائی کی جائے گی، اگرچہ اللہ تعالیٰ ساری چیزیں جانتے ہیں، وہ دانا و بینا ہیں، سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ حجت قائم کرنے کے لیے بندوں کے خلاف گواہ پیش کریں گے، اور ان گواہوں کے ذریعہ ان کے گناہوں کو ثابت کیا جائے گا، اور اس کے بعد سزا سنائی جائے گی۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿يَوْمَ عِنْدَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا﴾ اس دن زمین اپنی خبریں سنائے گی۔ اس کے

متعلق مفسرین لکھتے ہیں کہ جو بھی اعمال اچھے یا برے اس نے زمین پر کیے ہیں، قیامت کے روز زمین کا وہ حصہ اور ٹکڑا اس کے متعلق گواہی دے گا۔

اسی طرح دوسرے گواہ انسان کے اعضاء ہوں گے وہ بھی گواہی دیں گے۔ اس لیے کہ جب آدمی کو پیش کیا جائے گا اور اس نے گناہ کیے ہوں گے تو دنیا کی طرح مجرم اوّل وہلہ میں از خود اپنے گناہ کا اقرار نہیں کرے گا، اس کی کوشش یہی ہوگی کہ ان سے انکار کر دے، پھر جب دیکھے گا کہ انکار سے بات بننے والی نہیں ہے، اور میرے خلاف چاروں طرف سے گواہ قائم ہو چکے ہیں، اگر انکار کروں گا تب بھی میری بات سنی جانے والی نہیں ہے؛ تو پھر مجبوراً اقرار کرے گا۔

تطبیق آیات

بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کچھ سوالات کیے کہ قرآن پاک کی کچھ آیتوں میں آپس میں تعارض ہے، ایک آیت سے ایک بات معلوم ہوتی ہے اور دوسری آیت سے دوسری بات ثابت ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ اس نے کہا: قرآن پاک کی بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے گفتگو کریں گے اور بات چیت ہوگی۔ اور بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاموشی سی طاری ہوگی، کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اور بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنے گناہوں سے انکار کریں گے کہ ہم نے کبھی کفر و شرک نہیں کیا تھا: ”وَاللّٰهُ رَبَّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ“ اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: پہلے تو وہ لوگ خاموش رہیں گے، لیکن اس کے بعد دیکھیں گے کہ لوگوں کو طلب کیا جاتا ہے اور ان سے پوچھا جاتا ہے،

اس موقع پر اہل ایمان کو بھی طلب کیا جائے گا اور لوگوں سے چھپا کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو سوالات کیے جائیں گے کہ تم نے یہ عمل کیا تھا؟ یہ عمل کیا تھا؟ بندہ مؤمن اس کا اقرار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس کے گناہوں کو معاف کر دو۔ یہ دیکھ کر کفار آپس میں کہیں گے کہ یہاں تو معاملہ بہت آسان ہے، جو بات کہی جاتی ہے اس کو مان لیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اسی بنیاد پر انکار کریں گے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی زبان پر مہر لگا دی جائے گی، پھر ان کے ہاتھ اور دوسرے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ ان گواہی دینے والوں میں زمین کے حصے بھی ہوں گے جہاں وہ عمل کئے تھے۔ (بخاری شریف، کتاب التفسیر: سورہ حم مجید)

زمین و آسمان روتے ہیں

بلکہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ آدمی کا جب انتقال ہوتا ہے تو زمین کے جن حصوں پر وہ نیک اعمال کرتا تھا اور اس کے نیک اعمال آسمان کے جن دروازوں سے اوپر پہنچائے جاتے تھے، زمین کا وہ حصہ اور آسمان کا وہ دروازہ اس کی موت پر روتے ہیں۔ اسی کو قرآن نے کہا کہ ”ان کافروں کی ہلاکت پر زمین اور آسمان نہیں روتے“ (سورہ دخان) اس کی تفسیر میں حضرات مفسرین نے لکھا ہے کہ اہل ایمان جو نیک اعمال کرنے والے ہوتے ہیں ان کی موت پر زمین روتی ہے، اور زمین کے وہ حصے جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتا تھا؛ وہ بھی روتے ہیں (شعب الایمان: ۳۰۱۸) اس لئے کہ زمین کے جس حصہ پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے، وہ خوش ہوتی ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے استعمال کیا گیا۔ تو جب بندہ مؤمن مرجاتا ہے تو زمین کا وہ حصہ اور جگہ ویران ہو جاتی ہے؛ لہذا وہ روتی ہے۔ مسلمان کی موت پر چاہے انسان روئے یا نہ

روئے، لیکن وہ جگہ ضرور روتی ہے، اور آسمان کے جن دروازوں سے اعمال جاتے تھے وہ بھی روتے ہیں۔

زیادہ گواہ تیار کر لو

مطلب یہ ہے کہ یہ ساری جگہیں گواہی دیتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ ساری چیزیں نوٹ کی جاتی ہیں۔ اسی لیے حدیث پاک میں آتا ہے کہ اللہ کی تسبیح کو انگلیوں پر گنا کرو، کیوں کہ وہ قیامت کے دن گواہی دیں گی (ترمذی: باب ما جاء في عقد التسبيح باليد).

ابوداؤد: باب التسبيح بالخصی) جہاں وہ گناہوں کو بتائے گی، وہیں وہ یہ بھی بتائے گی کہ ان پر تم نے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا تھا۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ زمین کے وہ حصے جہاں پر آدمی عبادت کرتا تھا وہ بھی اس کے حق میں گواہی دیں گے۔ اس لیے شریعت کی نگاہ میں یہ بات مطلوب ہے کہ آدمی زیادہ سے زیادہ زمین کے حصے اپنی گواہی کے لیے تیار کرے۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ آدمی فرض نماز پڑھنے کے بعد تھوڑی سی جگہ بدل کر نفل اور سنت پڑھتا ہے، اس میں جہاں اور بہت ساری حکمتیں ہیں، وہیں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس طرح گویا دو جگہیں قیامت کے دن آپ کے حق میں گواہی دیں گی۔

علامہ نووی رحمہ اللہ نے باب قائم کیا ہے کہ: عید کی نماز کے لیے جاتے ہوئے ایک راستہ استعمال کرو اور واپسی میں دوسرے راستے سے لوٹو؛ یہ مستحب ہے۔ چوں کہ عید کی نماز ایک عبادت ہے، اس کی ادائیگی کے لیے جب آدمی جائے گا تو کوئی نہ کوئی راستہ تو اختیار کرے گا۔

عمل چھوٹا سا؛ فضیلت بڑی

اسی طرح بیمار کی خبر گیری اور عیادت کے لیے جانے آنے میں بھی مختلف راستے

اختیار کرنا پسندیدہ ہے۔ کسی بیمار کی بیمار پرسی بھی بہت بڑا نیکی کا کام ہے۔ آج کل اس کی طرف سے بھی بہت غفلت برتی جاتی ہے، اگر کچھ تعلق ہو تو کر لیتے ہیں، ورنہ نہیں کرتے، حالاں کہ ایک مؤمن کا دوسرے مؤمن پر حق ہے، اس لئے اہل محلہ اور اہل مسجد میں سے کسی کے متعلق جب دیکھیں کہ وہ نظر نہیں آ رہا ہے، تو حق ہے کہ اس کی عیادت کے لیے جائیں؛ اس پر بڑا ثواب ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ کوئی آدمی کسی بیمار کی عیادت کے لیے صبح کے وقت گیا تو شام تک ستر ہزار (۷۰۰۰۰) فرشتے اس کے لیے دعا کرتے ہیں اور کوئی شام کو گیا تو صبح تک ستر ہزار (۷۰۰۰۰) فرشتے دعا کرتے ہیں۔ حدیث پاک میں یہاں تک آتا ہے کہ کوئی آدمی جب کسی مریض کی عیادت کے لیے جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں دوڑتا ہوا جاتا ہے۔ ایک چھوٹا سا عمل ہے؛ لیکن اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔

یہ اہتمام صرف عید میں نہیں

اس لیے بیمار کی عیادت، حج، اللہ کے راستے میں جہاد اور جنازہ کی شرکت کے لیے اور اس جیسے جتنے بھی نیکی کے کام ہیں، ان کے لیے اگر آپ جارہے ہیں تو کوئی نہ کوئی راستہ تو اختیار کرنا ہی پڑے گا، اس لیے وہاں سنت یہی ہے کہ اگر ایک راستہ سے جائے تو دوسرے راستہ سے لوٹے۔ یہ حکم صرف عید کی نماز کی سنت نہیں ہے، آج کل لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں، اس لیے عید کی نماز کے لیے اس کا اہتمام بھی کرتے ہیں، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ عید کی نماز کے علاوہ تمام عبادات کے کاموں میں یہی حکم ہے۔ جنازہ کی شرکت، بیمار کی عیادت وغیرہ؛ سارے نیکی کام کے لیے ایک راستہ سے جائیں اور دوسرے راستہ سے لوٹیں۔ اس کی وجہ وہی ہے کہ آدمی جب چپل کران

راستوں سے گزرے گا تو قیامت میں زمین کے وہ حصے آپ کے حق میں گواہی دیں گے کہ: اے اللہ! یہ بندہ عید کی نماز پڑھنے کے لیے مجھ پر سے چل کر گیا تھا، اور واپس لوٹتے وقت مجھ پر سے چل کر لوٹا تھا۔ بیمار کی عیادت کے لیے مجھ پر چل کر گیا تھا اور وہاں سے واپسی میں مجھ پر سے چل کر لوٹا تھا۔ یہ بھی آداب میں سے ہے۔ اس لیے جب ان اعمال کو انجام دیں تو ساتھ ساتھ ان چیزوں کا بھی اہتمام کریں۔

آپ ﷺ کی ذات نمونہ ہے

نیکی کے جتنے بھی اعمال بتائے گئے ہیں ان کو انجام دینے کے طریقے بھی نبی کریم ﷺ نے بتائے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی ذات کو نمونہ بنا کر بھیجا ہے، اس لیے ہر کام کو اسی طریقہ کے مطابق انجام دینے کی کوشش کرنی چاہیے جو حضور ﷺ نے بتائے ہیں؛ تب ہی وہ عمل مقبول ہوگا۔ جیسے: اگر آپ کسی جگہ پر کسی چیز کے بنانے کا آرڈر (Order) دیں اور آپ نے اس کا ایک نمونہ بھی دے رکھا ہے، پھر اگر بنانے والا اس نمونہ سے ذرا بھی ادھر ادھر کرے گا تو آپ اس چیز کو (Reject) اور رد کر دیں گے کہ یہ ہمارے آرڈر کے مطابق نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ نمونہ میں ذرا سا بھی فرق نہیں آنا چاہیے۔ آپ ﷺ کی ذات بابرکات کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہر عمل کے واسطے نمونہ بنایا ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ آپ کی ذات انسانوں کے لیے نمونہ ہے، جب نمونہ ہے تو پھر ہر چھوٹے بڑے عمل میں اسی کو دیکھا جائے گا، تبھی وہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوگا۔ اس لیے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

نبی کریم ﷺ کا طرز عمل

۱۹:- عن جابر بن عبد اللہ عن النبی ﷺ إِذَا كَانَ يَوْمُ عِيدٍ خَالَفَ

الطَّرِيقَ. (رواہ البخاری)

قَوْلُهُ: ((خَالَفَ الطَّرِيقَ)) یعنی: ذَهَبَ فِي طَرِيقٍ، وَرَجَعَ فِي طَرِيقٍ آخَرَ.

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب عید کا دن ہوتا تھا تو نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم عید کی نماز کے لیے ایک راستہ سے تشریف لے جاتے تھے اور دوسرے راستہ سے واپس تشریف لاتے تھے۔

انادات:- اس کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ عبادت کی جگہ زیادہ سے زیادہ ہو۔

۷۲۰:- وعن ابن عمر رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَخْرُجُ مِنْ طَرِيقِ

الشَّجَرَةِ، وَيَدْخُلُ مِنْ طَرِيقِ الْمُعَرَّسِ. وَإِذَا دَخَلَ مَكَّةَ، دَخَلَ مِنَ الثَّنِيَّةِ إِلَى الْعُلْيَا، وَيَخْرُجُ مِنَ الثَّنِيَّةِ السُّفْلَى. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ جب حج کے

لیے یا جہاد کے لیے یا کسی اور کام کے لیے مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے جاتے، تو شجرہ والے راستہ سے مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے، اور مُعَرَّس والے راستہ سے مدینہ منورہ میں واپس داخل ہوتے تھے (گویا داخل ہونے کے لیے الگ راستہ اور نکلنے کے لیے دوسرا راستہ اسی مقصد کے لیے اختیار کیا گیا، اور ان سفروں میں حج کے بھی اسفار ہوتے تھے، تو) جب آپ ﷺ حج یا عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے تھے تو مکہ کا جو بالائی حصہ یعنی جنت المعلیٰ والا راستہ ہے، اُدھر سے آپ مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے تھے اور وہ جو ذیلی راستہ ہے، اُدھر سے واپس لوٹتے تھے (گویا اس طریقہ سے آپ نے یہ تعلیم دی کہ آدمی ایک راستہ سے جائے اور دوسرے راستے سے آئے۔ لہذا ہم اپنے تمام عبادت کے کاموں میں اس کا اہتمام کریں)۔

استحباب تقدیم الیمن فی
کل ماہو من باب التکریم
ہر اچھے کام میں دائیں طرف سے شروع
کرنا مستحب ہے

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

استحباب تقدیم الیمین فی کلِّ مَا هُوَ مِنْ بَابِ التَّكْرِيمِ كَالْوُضُوءِ
وَالْغُسْلِ وَالتَّيَمُّمِ، وَلُبْسِ الثَّوْبِ وَالتَّعْلِ وَالْحُفِّ وَالسَّرِّ أَوَّلِ
وَدُخُولِ الْمَسْجِدِ، وَالسَّيِّ وَالْكِ، وَالْاِكْتِحَالِ، وَتَقْلِيمِ الْأُظْفَارِ،
وَقَصِّ الشَّارِبِ، وَنَتْفِ الْإِبْطِ، وَحَلْقِ الرَّأْسِ، وَالسَّلَامِ مِنْ
الصَّلَاةِ، وَالْأَكْلِ، وَالشُّرْبِ وَالْمُصَافْحَةِ وَاسْتِلَامِ الْحَجَرِ الْأَسْوَدِ
وَالخُرُوجِ مِنَ الْخَلَاءِ، وَالْأَخْذِ وَالْعَطَاءِ، وَغَيْرِ ذَلِكَ هَذَا هُوَ فِي مَعْنَاهُ.
وَيُسْتَحَبُّ تَقْدِيمُ الْيَسَارِ فِي ضِدِّ ذَلِكَ، كَالَاِمْتِحَاطِ وَالْبُصَاقِ
عَنِ الْيَسَارِ، وَدُخُولِ الْخَلَاءِ، وَالخُرُوجِ مِنَ الْمَسْجِدِ، وَخَلْعِ الْحُفِّ
وَالْتَّعْلِ وَالسَّرِّ أَوَّلِ وَالثَّوْبِ، وَالْاِسْتِنْجَاءِ وَفِعْلِ
الْمُسْتَقْدَرَاتِ وَأَشْبَاهَ ذَلِكَ

عنوان کی وضاحت

ایک اور ادب بتلا رہے ہیں کہ جو اچھے اور عزت کے کام سمجھے جاتے ہیں ان کو
انجام دینے میں داہنی طرف سے شروعات ہونی چاہیے۔ ایک آدمی وضو کرنا چاہتا ہے تو
پہلے داہنا ہاتھ دھوئے، پھر بائیں ہاتھ دھوئے۔ اسی طرح جہاں جہاں دایاں اور بائیں
ممکن ہو؛ وہاں ایسا کرے۔ اور جہاں دایاں بائیں ممکن نہ ہو، تو وہاں سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا۔ یہی حال غسل کا ہے کہ جب غسل کے لیے بیٹھے تو بدن کے دائیں حصہ پر
پہلے پانی ڈالے، پھر بائیں حصہ پر ڈالے۔ اسی طرح تیمم میں جب ہاتھوں پر ہاتھ
پھیرے تو پہلے سیدھے ہاتھ پر، پھر اُلٹے ہاتھ پر پھیرے۔

اسی طرح جب کپڑے پہنتے تو ازار میں پہلے سیدھا پیر پھر اُلٹا پیر ڈالے، پہلے سیدھی آستین پھر اُلٹی آستین پہنے۔ جوتے پہننے میں بھی پہلے سیدھا پیر پھر اُلٹا پیر۔ موزہ میں بھی پہلے دائیں پھر بائیں میں پہنے۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے دعا و درود پڑھ لے اور پہلے سیدھا پیر، پھر اُلٹا پیر داخل کرے۔ جب مسواک کرے تو پہلے داہنی جانب پھر بائیں جانب۔ سرمہ لگانے میں پہلے داہنی جانب، پھر بائیں جانب۔ ناخن کاٹنے میں پہلے دایاں ہاتھ، پھر بایاں ہاتھ، پہلے دایاں پیر، پھر بایاں پیر۔ اسی طرح جب مونچھیں کاٹے تو دائیں طرف سے شروع کرے اور بائیں جانب ختم کرے۔ بغل کے بالوں کو اکھاڑنے میں بھی اس کا خیال رکھے۔ بغل کے بالوں کو اکھاڑنا مسنون ہے، اگر کسی آدمی کے لئے بال کا اکھاڑنا ممکن نہیں ہے کہ اکھاڑنے میں تکلیف ہوتی ہے؛ تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ویسے اگر عادت ڈال لی جائے تو پھر آسان ہو جاتا ہے، اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ اکھاڑنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بغل میں بدبو نہیں رہتی۔

نماز کا سلام جب پھیرا جائے گا تو پہلے دائیں طرف، پھر بائیں طرف۔ کھانے میں بھی اپنے سامنے جو چیز ہے اس میں سے دائیں طرف سے، دائیں ہاتھ سے کھائے۔ پینے میں بھی دائیں ہاتھ سے پیے۔ مصافحہ کرنے میں ہاتھ ملاتے ہیں، تو اس میں بھی دایاں ہاتھ ملائے۔ حجرِ اسود کو بوسہ دے تو دائیں طرف سے بوسہ دیں گے، بیت الخلاء سے باہر نکلنے میں پہلے دایاں پیر، پھر بایاں پیر۔ کوئی چیز آپ لے رہے ہیں، یاد دے رہے ہیں، تو لینے میں دایاں ہاتھ سے لیں، اور دینے میں بھی دایاں ہاتھ استعمال کریں۔ بہت سے لوگ ان چیزوں کی طرف دھیان نہیں دیتے، اس کی وجہ سے معاملہ اُلٹ جاتا ہے۔ اصل ضرورت اس کی ہے کہ کچھ دنوں تک دھیان اور توجہ سے ان کاموں کو کیا جائے تو ان شاء اللہ خود بخود عادت پڑ جائے گی، بچوں کو بھی اسی کی

عادت ڈالی جائے، کچھ دنوں تک اگر اس کی عادت ڈالیں گے تو خود بخود وہ اسی طرح کرنا شروع کر دیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر ایسا کام جس میں عزت کا پہلو نکلتا ہو، اس میں دائیں طرف سے شروعات کیا کریں۔ اور اگر معاملہ اُلٹا ہے کہ اس میں عزت کا پہلو نہیں ہے تو اس صورت میں پہلے بائیں طرف سے کیا جائے گا۔ چنانچہ آپ ناک صاف کرنا چاہتے ہیں، تھوکرنا چاہتے ہیں، تو دائیں طرف نہیں تھوکیں گے، بلکہ بائیں طرف تھوکیں گے، اور بیت الخلاء میں داخل ہوں گے تو پہلے بایاں پیر اندر رکھیں گے، پھر دایاں پیر۔ مسجد میں داخل ہونا تو عزت کی چیز ہے، لیکن مسجد سے نکلنا اس کے برعکس ہے، اس لیے پہلے بایاں پیر نکالیں گے، پھر دایاں پیر۔ استنجاء بائیں ہاتھ سے کریں گے۔ اسی طرح جتنے بھی کام ہیں ان کے اندر اسی بات کا خیال رکھا جائے۔ تو جتنے بھی اچھے کام ہیں ان میں ادب یہ ہے کہ آدمی دائیں طرف سے شروع کرے، اور جو اس کے برعکس ہے اس میں بائیں طرف سے شروع کرنا چاہیے۔ یہ ایک عنوان قائم کیا ہے، اور اس کے تحت اسی کے متعلق آیتیں اور روایتیں پیش کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک آیت پیش کی ہے: ﴿فَأَمَّا مَن أُوتِيَ كِتَابَهُ يَمِينًا فَيَقُولُ هَٰؤُلَاءِ أَقْرَبُوا كِتَابِيَّةً﴾ (الحاقة: ۱۹) ﴿جواللہ کے نیک بندے ہوں گے ان کو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا نامہ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ گویا داہنے ہاتھ میں نامہ اعمال کا دیا جانا، یہ ان کی نجات کی علامت قرار دیا۔ اور وہ اتنے خوش ہوں گے کہ مارے خوشی کے لوگوں کو بتاتے پھریں گے، جیسے: کسی آدمی کا رزلٹ آیا، اور وہ اعلیٰ نمبر سے کامیاب ہوا، تو وہ اس کو بند کر کے جیب میں نہیں رکھ دیتا، بلکہ دوستوں کو بتاتا پھرتا ہے کہ دیکھو! یہ میرا رزلٹ آیا ہے۔ ویسے ہی اس آیت میں ہے کہ جس کو اس کا

نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ لوگوں سے کہے گا کہ: لو! میرا نامہ اعمال پڑھو۔

حضورِ اکرم ﷺ کی پسند

۷۲:- وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: کان رسول اللہ ﷺ یُعِجُّبُهُ النَّيِّبُ

فِي شَأْنِهِ كَلِّهِ: فِي طَهْوَرِهِ، وَتَرَجِّلِهِ، وَتَعَلِّلِهِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو ہر اچھے کام (جو

عزت و اکرام اور نعمت کے سمجھے جاتے ہیں، ان) میں دائیں طرف سے ابتدا کرنا پسند تھا۔ چنانچہ آپ جب وضو فرماتے تھے تو دائیں طرف سے شروع کرتے تھے (دایاں ہاتھ، پھر بایاں ہاتھ۔ دایاں پیر، پھر بایاں پیر۔ اسی طرح غسل کرنے میں حبیباً کہ بتلایا گیا) اور سر پر کنگھا کرنے میں پہلے دائیں طرف، پھر بائیں طرف (ڈاڑھی میں کنگھی کرتے تو پہلے دائیں طرف، پھر بائیں طرف کرتے۔ یہی سنت اور مستحب طریقہ ہے) اور جوتے پہننے میں بھی پہلے دائیں پیر میں، پھر بائیں پیر میں پہنتے تھے۔

افادات:- چند دنوں تک اس کا اہتمام کرنا پڑتا ہے، یہاں تک کہ جب

آدمی کی طبیعت اس کی عادی بن جاتی ہے تو اس کے بعد خود بخود عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے، شروع میں ذرا توجہ رکھنی پڑتی ہے۔ اور اگر توجہ اور اہتمام نہیں رکھتے تو شیطان اُلٹا ہی کرواتا ہے، اسی لیے لوگ جب مسجد سے نکل رہے ہوں تو کھڑے ہو کر دیکھیے، جوتو جہ کر کے جوتے پہننے والے ہوں گے، وہی دایاں جوتا پہلے پہنیں گے، ورنہ شیطان اُلٹا ہی ڈالوائے گا۔ اسی طرح مسجد میں آنے والے جب جوتے نکالتے ہیں، وہاں بھی شیطان اُلٹا ہی کرواتا ہے۔ اس لئے چند دنوں تک کچھ توجہ کرنی پڑے گی۔

حضورِ اکرم ﷺ کا عمل

۷۲۲:- وعنها قالت: كَانَتْ يَدُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ الْيَمْنَى لَطُفُورَةً وَطَعَامِيهِ، وَكَانَتْ الْيُسْرَى يَخْلَايَهُ وَمَا كَانَ مِنْ أَدَى.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا دایاں ہاتھ غسل وغیرہ اور کھانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اور استنجاء، یا کوئی گندی چیز ہوتی (مثلاً: ناک صاف کرنی ہوتی، تو) بائیں ہاتھ استعمال ہوتا تھا۔

بہی تو کمالِ نبی ہے

افادات:- یہ سب زندگی کے آداب ہیں جو آپ ﷺ نے سکھائے ہیں، آپ ﷺ کا تعلق اپنی امت کے ساتھ ایسا تھا جیسے ایک شفیق اور مہربان باپ کا اپنی اولاد کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ باپ اپنے بچوں کو ہر چیز سکھاتا ہے، اگر وہ نہیں سکھائے گا تو بچوں کو یہ سب آداب معلوم بھی نہیں ہو سکیں گے۔

اور آپ ﷺ کا یہی انداز اور طریقہ تربیت غیروں کے لیے باعثِ اعتراض بنا۔ ابن ماجہ شریف میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک یہودی نے ایک مرتبہ ان سے بطور استہزاء و مذاق کہا: ”إِنِّي أَرَى صَاحِبَكُمْ يُعَلِّمُكُمْ كُلَّ شَيْءٍ حَتَّى الْجُرَاقَةَ“ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے ساتھی (یعنی نبی کریم ﷺ) تم کو ہر چیز سکھاتے ہیں، یہاں تک کہ پیشاب پاخانہ کا طریقہ بھی سکھاتے ہیں؟ اس کے جواب میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا: جی ہاں! نبی کریم ﷺ نے قضائے حاجت کے موقع پر کیا کرنا چاہیے وہ بھی ہمیں بتایا کہ ہم قبلہ کی طرف رخ کر کے بیٹھیں، دائیں ہاتھ سے استنجاء نہ کریں، تین سے کم پتھر پراکتفاء نہ کریں، لید اور ہڈی وغیرہ

سے استنجاء نہ کریں (ابن ماجہ: ۳۱۶) گویا آپ ﷺ نے ہر چیز بتائی اور اس کی تعلیم بھی دی کہ بیٹھنے میں کیسی ہیئت اختیار کریں، کون سے ہاتھ سے استنجاء کریں، کون سے ہاتھ سے نہ کریں؛ یہی تو آپ ﷺ کا کمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے آپ کو بھیجا تھا اس میں چھوٹی سے چھوٹی بات بھی آپ ﷺ نے نہیں چھوڑی جس کی طرف متوجہ نہ کیا ہو۔ یہ سب وہی تعلیمات ہیں۔ اسی لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے عملی طور پر بتلایا کہ کون سے کام دائیں ہاتھ سے کیے جاتے ہیں، اور کون سے کام بائیں ہاتھ سے کیے جاتے ہیں۔ اگر ہمارا بچہ بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا ہے، یا گلاس پکڑتا ہے، تو ہم اس کو ٹوکتے نہیں، حالاں کہ اس کو محبت سے ٹوکا اور بتایا جانا چاہیے کہ: بیٹا! ایسا نہیں کیا کرتے۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہر چیز بتلائی ہے، لیکن آج کل ہم لوگوں کا مزاج ایسا بنتا جا رہا ہے کہ ایسی کوئی چیز ہو تو کہتے ہیں کہ یہ تو ہماری شان کے خلاف ہے۔

آج کل کی بد تہذیبی کی بڑی وجہ

آج کل عام طور پر بد تہذیبی اور بے ادبی عام ہوتی جا رہی ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ ماں باپ اور بڑوں کی طرف سے تربیت اور ادب سکھانے کے معاملہ میں کوتاہی برتی جاتی ہے، وہ یوں سمجھتے ہیں کہ اس کو یہ بات کیا کہی جائے؟ نہیں بھائی! ان کو ہر ہر چیز بتلانی چاہیے، اگر باپ اپنے بیٹے کو نہیں سکھائے گا تو آخر اس کو کب آئے گا؟ پھر اگر بیٹا اسی طرح رہے گا تو بعد میں لوگ باپ ہی پر الزام دیں گے کہ باپ نے اس کو کھانے پینے کا طریقہ بھی نہیں سکھایا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے۔ آگے روایت آئے گی وہاں معلوم ہوگا کہ نبی کریم ﷺ چھوٹوں اور بڑوں ہر

ایک پربرا برنگرانی رکھتے تھے، اگر کسی سے کوئی چیز ادب کے خلاف ہو جاتی، تو فوراً آپ اس پر تنبیہ فرماتے تھے، ٹوکتے تھے اور نصیحت فرماتے تھے۔

تر بیت کا مؤثر ترین طریقہ

آج ہمارا معاملہ یہ ہو گیا ہے کہ پہلے تو ٹوکتے نہیں ہیں، نہ اس کو درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر اگر لوگوں کی طرف سے کچھ کہا جاتا ہے تو غصہ میں آکر اس کی پٹائی شروع کر دیتے ہیں۔ تربیت کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ چھوٹوں کو محبت سے بتلایا جاتا ہے، بلکہ چھوٹا ہو یا بڑا؛ کوئی بات آپ جتنی محبت سے ان کو بتائیں گے، اس پر اتنی ہی زیادہ اثر انداز ہوگی۔

ایک صحابی کی روایت پہلے گزر چکی ہے کہ ایک مرتبہ نماز کے اندر کسی کو چھینک آئی، اس پر وہ نماز کی حالت میں ”یرحمک اللہ“ کہنے لگے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سبحان اللہ سبحان اللہ کہنے لگے۔ یہ سوچ رہے ہیں کہ مجھ سے ایسا کیا کام ہو گیا کہ سب ایسا کہہ رہے ہیں۔ میں نے بولنا شروع کیا کہ میں نے ایسا کیا کہا، تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ ان کو معلوم نہیں تھا کہ نماز میں بول نہیں سکتے۔ پھر صحابہ نے اپنی رانوں پر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ خیر! یہ کہتے ہیں کہ مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں رک گیا۔ پھر نماز کے بعد حضور ﷺ نے مجھے بلایا۔ وہ صحابی فرماتے ہیں: ”وَاللّٰهُ مَا حَزَنَيْتُ وَلَا قَهَرْنِي وَلَا شَتَمَنِي“ آپ ﷺ نے مجھے نہ مارا، نہ ڈانٹا، نہ مجھ پر غصہ کیا؛ بلکہ بڑی محبت سے فرمایا کہ: یہ نماز ہے اور نماز میں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، اس میں دنیا کی باتیں اور دوسری چیزیں نہیں ہوتیں۔ اب غور کیجئے کہ وہ تو بڑا آدمی تھا، تو پھر چھوٹوں کو تو اور زیادہ محبت سے بتانے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم یا تو کہتے ہی نہیں، اور جب کہنے پر آتے ہیں تو ڈنڈا لے کر آگے بڑھتے

ہیں، ہمارا حال ایسا ہے:-

اگر غفلت سے باز آیا؛ جفت کی * تلافی کی بھی ظالم نے؛ تو کس کی پہلے تو کہیں گے ہی نہیں، اور جب کہنے پر آئیں گے؛ تو پٹائی کریں گے۔ گویا ہمیں پٹائی کے علاوہ تعلیم و تربیت کا اور کوئی طریقہ آتا ہی نہیں ہے، حالاں کہ یہ بالکل غلط طریقہ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں کسی عورت کو، کسی غلام کو، بلکہ کسی جانور تک کو نہیں مارا۔

شان کے خلاف نہیں

توبات چلی تھی کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک یہودی نے اعتراض کے طور پر ایک بات کہی تھی کہ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے ساتھی تم کو ہر چیز سکھاتے ہیں، یہاں تک کہ پیشاب پاخانہ کا طریقہ بھی بتاتے ہیں۔ اندازہ لگائیے کہ آپ سید الانبیاء اور سید الاولین والآخرین ہیں، اگلوں پچھلوں کے سردار ہیں، لیکن کبھی آپ نے یہ نہیں سوچا کہ کیا میں ان کو پیشاب پاخانہ کا طریقہ بتاؤں؟ یہ میری شان کے مطابق ہے؟ آپ ﷺ تو ہر چیز سکھانے کے لیے آئے تھے، اور آپ ﷺ نے وہ پورا پورا امت کو سکھا دیا۔ آج کل ہمارا مزاج ایسا بنتا جا رہا ہے کہ فلاں کام تو میری شان کے خلاف ہے، بلکہ اگر کوئی اس کی طرف دھیان دیتا ہو، تو دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ: ارے مولانا! آپ اس میں کیوں دخل دیتے ہیں؟ آپ کی شان تو بڑی اونچی ہے۔ خود تو کرتے نہیں، اور کوئی بے چارہ کر رہا ہے، تو اس کو روکنے کی کوششیں کرتے ہیں۔

آپ بیتی

ہمارے یہاں مدرسہ میں کسی زمانہ میں طلباء کی نگرانی میرے ذمہ تھی، جب

نماز کے اور دوسرے اوقات میں میں دارالاقامہ (Boarding) میں جاتا تھا تو بعض لوگ کہتے تھے کہ: آپ حدیث کی بڑی بڑی کتابیں پڑھاتے ہیں؛ اور آپ وہاں جاتے ہیں؟ میں کہا کرتا تھا کہ: ہم نہیں جائیں گے تو کون جائے گا؟ اور ان بچوں کو کون سکھائے گا؟ ان کی نگرانی کون کرے گا؟۔

آج کل بچے جو بگڑتے جا رہے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی روک ٹوک نہیں ہے، ان کی نگرانی اور نگہداشت نہیں ہے۔ ان کو تو ہر چیز پر نگرانی کی ضرورت ہے۔ ایک مرتبہ آپ کسی بچے کو ٹوکیں گے، اور جب وہ دیکھے گا کہ میری غلط حرکت پر ٹوکا جا رہا ہے، تو پھر دوسری مرتبہ وہ چونکے گا، اور ایسا نہیں کرے گا۔ لیکن اگر اس نے دیکھ لیا کہ کوئی ٹوکنے والا نہیں ہے، تو دھیرے دھیرے معاملہ آگے بڑھتا جائے گا۔

تربیت کا اصل طریقہ

آپ احادیث کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کسی بھی بڑے یا چھوٹے کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش آتی تو نبی کریم ﷺ اس پر فوراً تنبیہ فرماتے۔ وہاں کوئی مار پٹائی نہیں ہوتی تھی، بلکہ بس ٹوک دیا کرتے تھے کہ: یہ جو ہوا وہ مناسب نہیں ہوا، یوں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن آج کل ہمارا مزاج یہ بن گیا ہے کہ کسی کو کچھ کہو مت۔ اگر کہتے ہیں تو اُسے برا معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ کچھ کہنے کا ماحول ہی نہیں رہا۔ لیکن یاد رکھئے! پھر بھی اگر آپ کسی کو محبت سے کہیں گے تو وہ ضرور سنے گا، ڈانٹ ڈپٹ اور پٹائی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، حضور ﷺ کا مزاج اور تربیت کا طریقہ یہی تھا۔

عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ہماری کوتاہیاں

۲۳:- وعن أم عطية رضي الله عنها أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهْنِ فِي غَسَلِ ابْنَتِهِ

زَيْدٌ نَحْنُ نَحْنُ: اَبْدَأْنِ بِمَيِّمَتِهَا، وَمَوَاضِعِ الْوُضُوءِ مِنْهَا.

ترجمہ:- حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا جب انتقال ہوا (تو ان کو غسل تو عورتیں دے رہی تھیں، لیکن نبی کریم ﷺ پرودہ کے پیچھے سے ان کو غسل دینے کا طریقہ بتلا رہے تھے کہ اس طرح غسل دو) آپ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے کہ: ان کے دائیں طرف سے غسل دینا شروع کرو، اور وضو بھی دائیں طرف سے کراؤ۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ پردہ کے اہتمام کے ساتھ عورتوں کو بھی تعلیم دی جاسکتی ہے، لیکن ہماری تو پوری زندگی گزر جاتی ہے، کبھی ہم نے معلوم ہی نہیں کیا کہ گھر کی عورتیں کس طرح کپڑے دھوتی ہیں؟ کس طرح بچوں کو استنجاء کرواتے ہیں؟ بعض عورتوں کو تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی کپڑا اگر ناپاک ہو جائے تو اس کو اس طرح دھویا جائے کہ دھونے والا اپنی طاقت کے مطابق اس کو اتنا نچوڑے کہ اس میں قطرہ بھی باقی نہ رہے، دوسری اور تیسری مرتبہ بھی اسی طرح نچوڑے، جس کی وجہ سے بہت سی جگہوں پر تو کپڑے پاک ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

چھوٹے بچے ان کے ساتھ ہوتے ہیں، ان کا پیشاب پاخانہ کپڑوں پر گر جاتا ہے تو اس کو کس طرح صاف و پاک کیا جائے؟ اس کا طریقہ ان کو معلوم نہیں ہوتا، ان ساری چیزوں کی اپنے گھروں میں نگرانی کی ضرورت ہے۔ ایک دوسرے بتلائیں گے تو وہ آسانی سے عمل کرنے لگ جائیں گی۔ ہم تو ادھر دھیان ہی نہیں دیتے۔ بچہ اگر کہیں فرش پر پیشاب پاخانہ کر دے، تو اس فرش کو کس طرح پاک کرتی ہیں؟ یا کپڑوں پر پیشاب پاخانہ کر دے تو کپڑوں کو کس طرح پاک کرتی ہیں؟ چار پائی پر یا لحاف پر پیشاب پاخانہ کر دے، تو اس لحاف کو کس طرح پاک کرتی ہیں؟ یہ سب کبھی ہم نے ان سے پوچھا؟

اس کی طرف توجہ ہی نہیں ہے۔ حالاں کہ یہ ساری چیزیں دھیان دینے کی ہیں، اگر یہ سب ہوگا تب ہی شریعت کی دوسری تعلیمات پر عمل ہوگا۔ جب پاکی و ناپاکی کا ہی اہتمام نہیں ہوگا؛ تو پھر نمازیں کیسے درست ہوں گی اور دوسری باتیں کیسے ٹھیک ہوں گی؟

یہاں دیکھئے کہ نبی کریم ﷺ کی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے انتقال پر جو عورتیں ان کو غسل دے رہی تھیں، نبی کریم ﷺ خود ان کو پردہ کی آڑ میں سے بیٹھ کر غسل کا طریقہ بتلا رہے ہیں کہ وضو اور غسل میں دائیں طرف سے ابتدا کرو۔

مردہ کو جب غسل دیتے ہیں تو پہلے اس کو وضو کرایا جاتا ہے، پھر بائیں کروٹ پر لٹا کر دائیں کروٹ پر پانی ڈالتے ہیں، پھر دائیں کروٹ پر لٹا کر بائیں کروٹ پر پانی ڈالتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے باقاعدہ طریقہ بتلایا اور اس میں بھی آپ نے دائیں طرف سے شروع کرنے کی تلقین فرمائی۔

ان چیزوں کی طرف بھی توجہ ہو

۷۲:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قَالَ: إِذَا انْتَعَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِالْيَمِينِ، وَإِذَا نَزَعَ فَلْيَبْدَأْ بِالشِّمَالِ. لِتَكُنَ الْيَمِينُ أَوَّلَهُمَا تَنْعَلُ، وَآخِرُهُمَا تُنْزَعُ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی آدمی جوتا پہنے تو دائیں پاؤں سے شروع کرے، اور جب نکالے تو بائیں پاؤں سے شروع کرے؛ تاکہ دائیں پاؤں میں پہلے جوتا جائے اور آخر میں نکالا جائے۔

افادات:- آستین کو چڑھانے اور اتارنے میں بھی یہی طریقہ ہے۔ جوتا پہننے کے لئے بھی نبی کریم ﷺ نے اہتمام سے ہدایت دی۔ کیا ہم نے بھی اپنے بچوں کو

کبھی اس کی طرف متوجہ کیا؟ کیا ہم نے زندگی میں کبھی بھی اپنے بچوں کو بٹھا کر ان کو جوتا پہننے کا طریقہ بتایا؟ ہمیں نبی کریم ﷺ کی ان تعلیمات کو سیکھنے کی ضرورت ہے کہ جب آپ ﷺ نے اتنے اہتمام سے آدابِ زندگی ہمیں بتائے ہیں، تو ہم ان کی طرف سے اتنی غفلت کیوں برتیں؟ ہم ان کو سیکھنے اور سکھانے کا اہتمام نہیں کرتے، حالاں کہ یہ تو ہماری ذمہ داری ہے۔ اس لئے ادھر توجہ ہونی چاہیے۔

۷۲۵:- وعن حفصة رضي الله عنها أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَجْعَلُ يَمِينَهُ لَطْعَامِهِ وَشَرِبِهِ وَثِيَابِهِ، وَيَجْعَلُ يَسَارَهُ لِمَا سِوَى ذَلِكَ.

ترجمہ:- ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنے دائیں ہاتھ کو کھانے، پینے اور کپڑوں کے لیے استعمال فرماتے تھے (مطلب یہ ہے کہ اچھے کاموں کے لئے استعمال کرتے تھے اور ان کی شروعات دائیں ہاتھ سے کرتے تھے) اور بائیں ہاتھ کو اس کے برعکس کام یعنی گندی چیزوں میں (مثلاً: قضائے حاجت وغیرہ کے لئے) استعمال فرماتے تھے۔

۷۲۶:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: إِذَا لَبِسْتُمْ، وَإِذَا تَوَضَّأْتُمْ، فَأَبْدُوا أَبْيَاحَكُمْ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم لباس (کرتہ، پاجامہ وغیرہ) پہنو، یا وضو کرو، تو اپنی دائیں جانب سے شروع کرو۔
افادات:- اب ہم لوگ وضو میں تو اس کا اہتمام کرتے ہیں لیکن کپڑے پہننے میں بہت سے لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے، حالاں کہ نبی کریم ﷺ اُمت کو بڑے اہتمام سے اس کی تاکید فرما رہے ہیں۔

۷۲۷:- وعن أنس رضي الله عنه أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَتَى مِنًى، فَأَتَى الْجُمُرَةَ

فَرَمَاهَا ثُمَّ أَتَى مَنَزِلَهُ بِمَتْنٍ وَنَحْرٍ، ثُمَّ قَالَ لِلْحَلَّاقِ: ((خُذْ)) وَأَشَارَ إِلَى جَانِبِهِ الْأَيْمَنِ، ثُمَّ الْأَيْسَرِ، ثُمَّ جَعَلَ يُعْطِيهِ النَّاسَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

وفی روایۃ: لما رمى الجمرة، ونَحَرَ نُسْكَهُ وَحَلَّقَ، نَاولَ الحَلَّاقَ شِقَّةَ الْأَيْمَنِ فَحَلَّقَهُ ثُمَّ دَعَا أَبَا طَلْحَةَ الْأَنْصَارِيَّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فَأَعْطَاهُ إِيَّاهُ، ثُمَّ نَاولَهُ الشِّقَّةَ الْأَيْسَرَ.. فَقَالَ: ((اِحْلِقْ)) فَحَلَّقَهُ فَأَعْطَاهُ أَبَا طَلْحَةَ، فَقَالَ: ((اقْسِمْهُ بَيْنَ النَّاسِ)).

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ حج کے موقع پر منی میں تشریف لائے تو جمرہ کے پاس تشریف لے گئے، اس کی رمی فرمائی، پھر منی میں جہاں آپ کی قیام گاہ تھی وہاں تشریف لے گئے اور جانور ذبح کیا (قربانی کی) پھر بال کاٹنے والے سے فرمایا: میرے بال کاٹو، اس وقت آپ نے اپنے سر کے دائیں حصہ کی طرف اشارہ کیا، پھر بائیں طرف اشارہ کیا؛ پھر آپ ﷺ وہ بال لوگوں کو عطا فرمانے لگے۔

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابوطحہ انصاری رضی اللہ عنہ کو بلا کر بال ان کے حوالے کئے اور فرمایا: یہ لوگوں میں تقسیم کر دو۔ چنانچہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے بال مبارک لوگوں کے اندر تقسیم کئے۔

افادات:- اس سے ہمیں ایک بات یہ سیکھنے ملی کہ جب ہم کسی نئی کھانسی یا سعال بنوانے جائیں، تو پہلے دائیں طرف، پھر بائیں طرف سے بال کٹوانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

مکتب آداب الطعام

کھانے کے آداب

باب التسمية في أوله

والحمد في آخره

کھانے سے پہلے بسم اللہ

اور

کھانے کے بعد الحمد للہ پڑھنا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آدابِ زندگی

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہاں سے کھانے کے آداب بتلا رہے ہیں۔

جیسا کہ بتایا تھا کہ زندگی گزارنے کا جو عمدہ سے عمدہ طریقہ ہو سکتا ہے وہ پورا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھایا ہے۔ کھانا کھانا ہو تو کس طرح کھایا جائے، کوئی چیز پینی ہو تو کس طرح پی جائے، لیٹنا ہو تو کیسے لیٹیں، قضائے حاجت کیسے کریں، ”معاشرت“ یعنی لوگوں کے ساتھ مل جل کر جو زندگی گزارتے ہیں تو کس کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے، باپ کے ساتھ، ماں کے ساتھ، بھائی کے ساتھ، بہن کے ساتھ، بیوی کے ساتھ، پڑوسی کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کرنا چاہیے، اس کی ساری تفصیلات بتائی ہیں؛ یہی ”معاشرت“ کہلاتی ہے، اور یہ سب ”آدابِ معاشرت“ کہلاتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: آج کل لوگوں نے دین کو صرف عبادت کے اندر محدود کر رکھا ہے کہ نماز روزہ وغیرہ جو عبادتیں ہیں ان کا اہتمام کیا جاتا ہے، اور ”معاشرت“ یعنی زندگی گزارنے کا جو طریقہ ہے اس کے متعلق تو یوں سمجھتے ہیں کہ شریعت نے کوئی ہدایت دی ہی نہیں ہے، اس معاملہ میں ہم آزاد ہیں جس طرح چاہیں کریں؛ حالاں کہ ایسی بات نہیں ہے۔ شریعت میں تو ہر چیز کے متعلق مکمل تفصیلات بتلائی گئی ہیں۔

کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کا فائدہ

۷۲۸:- وعن عُمَرَ بْنِ أَبِي سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ:

((سَمِّ اللَّهَ، وَكُلْ بِمِيعِنِكَ، وَكُلْ حَتَّى يَلِيكَ)) متفقٌ عَلَيْهِ

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عمر بن ابوسلمہ رضی اللہ عنہما (جو اُم المؤمنین حضرت

اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے صاحبزادہ ہیں، ان کے پہلے شوہر حضرت ابوسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پیدا ہوئے تھے، حضرت ابوسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتقال کے بعد حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہوا تو یہ اپنے چھوٹے بچوں کو ساتھ لے کر حضور ﷺ کے یہاں آئی تھیں، اس لیے حضرت عمر بن ابوسلمہ رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ کی تربیت و نگرانی میں تھے ایک مرتبہ وہ کھانے کے لیے بیٹھے تھے، خود) فرماتے ہیں (کہ میرا ہاتھ ادھر ادھر گھومنے لگا، جیسے: بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ ادھر ہاتھ مارا، ادھر ہاتھ مارا۔ تو) حضور اکرم ﷺ نے مجھے (تین چیزیں) بتلائیں [۱]: کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھو [۲]: اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ [۳]: اپنے سامنے سے کھاؤ (ادھر ادھر سے مت کھاؤ۔)

افادات:- باب کا عنوان بھی یہی قائم کیا ہے کہ کھانے کے معاملہ میں پہلا ادب یہ ہے کہ کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھے اور اللہ کا نام لے۔ آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ روزی اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی میں استعمال کر رہا ہوں، کھا رہا ہوں، پی رہا ہوں، پہن رہا ہوں؛ یہ سب چیزیں کس کی دی ہوئی ہیں؟ جتنی بھی چیزیں ہیں ان سب میں پہلے یہ دیکھنا ہے کہ یہ ساری نعمتیں کہاں سے آئی ہیں؟ اللہ تعالیٰ ہی نے عطا فرمائی ہیں اور اسی کی دی ہوئی ہیں، تو جس نے مجھے دی ہے اسی کے نام سے میں اس کو استعمال کرنا شروع کروں۔ کھانا جس نے دیا ہے تو کھانا شروع کرنے سے پہلے مجھے اسی کا نام لینا چاہیے، تبھی تو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تعلق پیدا ہوگا اور اس کا استحضار رہے گا، پھر اس کے احکامات پر عمل کی توفیق ہوگی، اور پھر اس کی ذات کے ساتھ رشتہ قوی ہوگا۔

مثلاً: ایک آدمی کو کھانا کھلایا جائے اور بتلایا جائے کہ فلاں صاحب کی طرف سے دعوت ہے، تو اس کے دل میں داعی کے متعلق شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، پھر شکر کا

یہی جذبہ داعی کے ساتھ محبت پیدا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، پھر اگر بار بار یہی سلسلہ ہوتا رہے تو یہی چیز آگے جا کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کی طرف آمادہ کرے گا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کرتے وقت آدمی اگر یہ سوچے کہ میں جو کھانا کھانے جا رہا ہوں، یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، تو اس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ رشتہ مضبوط ہوگا۔

کیا ہم نے کبھی سوچا؟

اور کیا ہم نے کبھی سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے کھانے کے لیے کیسا عجیب و غریب نظام چلایا ہے؟ ہم روٹی توڑ کر کھاتے ہیں لیکن کیا کبھی سوچا کہ یہ روٹی کس طرح بنی؟ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ نے فضائل صدقات میں لکھا ہے کہ ایک بزرگ کے یہاں ایک شخص مہمان ہوئے، روٹیاں رکھی گئیں، تو جیسے بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں کہ کون سی کچی ہے، اور کون سی جلی ہوئی ہے، تاکہ ان میں جو اچھی ہو اسی کو نکال کر کھائیں۔ انہوں نے بھی الٹ پلٹ کر ناشروع کی تو ان بزرگ نے کہا: کیا دیکھتے ہو؟ ایک روٹی جو تیار ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے، اس پر تین سو ساٹھ (۳۶۰) محنتیں لگ چکی ہیں۔

ظاہر ہے کہ آدمی ذرا سوچے تو سہی کہ دانہ زمین کے اندر بویا جاتا ہے، تو زمین میں بونے سے پہلے زمین کو ہل کے ذریعہ نرم کیا جاتا ہے، پھر اس کے اندر کھاڈ ڈالی جاتی ہے، پانی ڈالا جاتا ہے۔ پھر جو پانی بارش کے ذریعہ سے آتا ہے، اس کے متعلق سوچے کہ بارش کیسے تیار ہوئی؟ سورج کی گرمی سمندروں کے اوپر پڑی، وہاں سے بھاپ اٹھی، بادل بنے، اور معلوم نہیں کیسے کیسے فرشتے ان بادلوں کو کہاں کہاں سے چلا کر کہاں لے گئے، اور کہاں انہوں نے پانی برسایا، پھر یہ پانی زمین کے اندر گیا، پھر زمین میں

بیج ڈالا گیا، اس کی پوری نگرانی کی گئی، پھر زمین سے کوئیل نکلی۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھو کہ اس کی کوئیل کتنی نازک ہوتی ہے کہ ایک چھوٹا سا بچہ بھی انگلی مار کر اس کو مسل کر رکھ دے، لیکن اللہ تعالیٰ نے سخت زمین کو پھاڑ کر اسے باہر نکالا، پھر وہ بڑھا اور اس کے اندر سے دانہ نکلا، اور اس دانہ کے اوپر سورج کی گرمی لگی، اس نے اس کو پکایا، اور نہ معلوم کیا کیا محنتیں ہوئیں، نگرانی اور چوکیداری کرنے والوں نے چوکیداری اور نگرانی کی، پھر اس کی کٹائی ہوئی، کھلیان لے جایا گیا، وہاں جانوروں کے ذریعہ سے دانے اور بھوسے کو الگ کیا گیا، پھر وہ بازار میں پہنچا، پہلے بڑے بیوپاری کے پاس گیا، پھر چھوٹے بیوپاری کے پاس گیا، اور پتہ نہیں کہاں کہاں ہوتا ہوا یہاں آیا، پھر چٹکی میں پیسا گیا، اس کے بعد آٹا تیار ہوا اور اب اس کو پکایا گیا۔ آدمی سوچے تو سہی کہ ایک روٹی کے تیار ہونے میں کتنی محنتیں ہوئیں؟ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

ابر و باد و مه و خورشید و فلک در کارند * تا تو نان نہ به کف آری و به غفلت نہ خوری
بادل، ہوا، اور چاند و سورج؛ یہ سب اللہ تعالیٰ نے تمہاری خدمت کے لیے ایک نوکر کی طرح بے گار کے طور پر لگا رکھے ہیں۔ نوکر تو وہ ہوتا ہے جسے ہمیں تنخواہ بھی دینی پڑتی ہے، لیکن اگر کوئی حاکم کسی کو زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جائے اور کہے کہ یہ کام کرو، اور اس کے اوپر کوئی مزدوری بھی نہ دی جائے؛ اسے بے گاری کہتے ہیں۔ تو اس کائنات کی جتنی بھی چیزیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے بے گار رکھ دی ہیں، یعنی ہماری خدمت کے لیے مقرر کی ہیں، اس پر ہمیں کوئی تنخواہ و معاوضہ نہیں دینا پڑتا۔ یہ سورج کی روشنی اور گرمی استعمال کر رہے ہیں، اگر بل دینا پڑتا تو ہمارا کیا حال ہوتا؟ بجلی کا بل ادا کرنے سے ہم عاجز ہو جاتے ہیں، تو سورج کی روشنی کا بل کہاں ادا کر پاتے؟ اسی طرح ہوا استعمال کر رہے ہیں اگر اس کا میٹر لگا دیا جاتا؛ تو ہمارا کیا حال ہوتا؟۔

تو یہ ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مفت میں مل رہی ہیں، اس لیے آدمی کھانا کھانے کے لیے جب بیٹھے تو اس کو سوچنا چاہیے کہ میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کو استعمال کرنے جا رہا ہوں، اسی لئے حضور اکرم ﷺ فرما رہے ہیں کہ: جس ذات نے ہمیں یہ کھانا دیا ہے پہلے اسی کا نام لے کر کھانا شروع کرو، اور بسم اللہ پڑھو، تاکہ اس کے ساتھ تعلق قائم ہو، اس کی محبت دل کے اندر پیدا ہو۔ ہمارے سامنے تو جب کھانا آتا ہے تو ہم بھوک کی وجہ سے ایسے بے تاب ہوتے ہیں کہ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں، بسم اللہ بھی یا نہیں رہتی، کبھی یہ سوچتے ہی نہیں کہ یہ کھانا کہاں سے آیا؟ حالاں کہ صرف ایک لمحہ کے لئے استحضار کر لینے کی ضرورت ہے۔ آدمی ذرا سوچے کہ اس وقت مجھ سے اللہ کا نام کیوں بلوایا جا رہا ہے!

ایک ہی نعمت میں کئی نعمتیں

ہمارے اکابر فرماتے ہیں: صرف کھانا ہی نعمت نہیں ہے، بلکہ جس وقت آدمی کھانا کھا رہا ہے، اسی وقت اللہ تعالیٰ کی کئی اور نعمتوں کو بھی وہ استعمال کر رہا ہے۔ جیسے: اگر کھانا بغیر لذت کا ملتا، تب بھی ہمیں کھانا ہی پڑتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اتنا ہی نہیں کیا کہ صرف کھانا دے دیا، بلکہ لذت والا کھانا دیا۔ تو خود کھانا ایک نعمت ہے، پھر جو لذت اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر رکھی وہ دوسری نعمت ہے۔ پھر عزت کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہمیں دے رہے ہیں، ورنہ ایسا ہوتا کہ بے عزتی کے ساتھ ڈال دیا جاتا جیسے: بعضوں کے سامنے ذلت کے ساتھ ڈال دیا جاتا ہے، ہمارے ساتھ ایسا تو نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بے عزتی کے ساتھ کھلایا۔ پھر بھوک دی، یہ مستقل ایک نعمت ہے، ورنہ کھانا بھی ہو، لذت بھی ہو، اور عزت کے ساتھ دسترخوان پر بٹھا کر ہمیں کھلائیں، لیکن ہمارے اندر کھانے کا تقاضہ ہی نہ ہوتا، بھوک ہی

نہ لگتی؛ تو کھانے کا کیا لطف آتا! معلوم ہوا کہ بھوک بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ پھر جس وقت ہم کھانا کھا رہے ہوتے ہیں تو عافیت کے ساتھ کھا رہے ہوتے ہیں۔ ورنہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو کھانا بھی ملا، لذت والا بھی ملا، عزت کے ساتھ ملا، بھوک بھی لگی ہوئی ہے، لیکن کوئی مصیبت آگئی، ایک دم سے کوئی عزیز بیمار ہو گیا، کسی پر ہارٹ کا حملہ ہو گیا؛ تو اب کھانا کھا رہے ہیں، لیکن بالکل بے دلی کے ساتھ کھا رہے ہیں، اس میں عافیت نہیں ہے، جب آدمی عافیت کے ساتھ کھانا کھاتا ہے تو پُر سکون انداز سے کھاتا ہے۔ اچھا! پھر دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کا مزہ بھی الگ ہی ہوتا ہے، اس لئے کہ اکیلے بیٹھ کر کھانے کی صورت میں اتنا نہ کھا پاتا، جتنا دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر کھا سکتا ہے۔ تو غور کرو کہ اس ایک نعمت کے اندر بے شمار نعمتیں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ آدمی ان سب چیزوں کو سوچے، جب آدمی یہ ساری چیزیں سوچے گا تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے گا، اور پھر اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تعلق پیدا ہوگا، اسی تعلق کو پسند کرنے کے لیے ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے اللہ کا نام لو۔

مضطرب اور روزی پہنچانے کا سرکاری انتظام

اور واقعہ یہ ہے روزی کے معاملہ میں اگر آدمی غور کرے تو اس کو ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ روزی کے لیے کیسا عجیب و غریب انتظام فرماتے ہیں۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب نور اللہ مرقدہ کا سنایا ہوا ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں، ان کو یہ واقعہ افغانستان کے مجددی خاندان کے ایک بزرگ نے بتایا تھا، وہ اپنے خاندان کے بڑے صاحب رسوخ عالم بھی تھے، جس زمانہ میں ظاہر شاہ افغانستان کا حکمران تھا اس زمانہ میں ایک موقع پر ان کو بادشاہ کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ ہم آپ کو ایک خاص سفارت کے لیے

ایک خاص پیغام لے کر موسکو (Moscow) بھیجنا چاہتے ہیں، آپ تیاری کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے تیاری کر لی، ہوائی جہاز کا سفر تھا، گھر والوں نے ان کو ایک بڑا سا ٹفن تیار کر کے دیا کہ ہوائی جہاز میں کھانا تو ملے گا، لیکن کیا معلوم وہ کیسا ہوتا ہے، اس لئے یہ کھانا ساتھ لے جائیے، بہت بڑے ٹفن میں بہت کچھ بنا کر دیا تھا۔ اچھا! ان کو یہاں سے یہ ہدایت دی گئی تھی کہ پہلے آپ کو کابل سے دوشنبہ (جو وہیں ایک مقام کا نام ہے) جانا ہے، پھر وہاں سے آگے جانے کی ہدایت وہیں سے دی جائے گی، پیغام آنے تک آپ کو ایئر پورٹ کے لاؤنچ ہی میں انتظار کرنا ہے۔

یہ کہتے ہیں کہ میں دوشنبہ پہنچا اور لاؤنچ میں بیٹھا ہوا اس انتظار میں تھا کہ آگے کیا ہدایت ملتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے شیشہ میں سے میں نے ایک منظر دیکھا کہ باہر ایک کوڑا دان تھا، اس کے پاس ایک عورت آئی اور کوئی چیز اٹھا کر کپڑے میں لپیٹی اور جلدی جلدی جانے لگی۔ میں اٹھا اور باہر نکل کر اس سے پوچھا: یہ کیا ہے؟ وہ کہنے لگی: یہ میرا معاملہ ہے۔ انہوں نے کہا: مجھے بتاؤ۔ جب دیکھا تو ایک مری ہوئی مرغی تھی جو اس عورت نے اٹھائی تھی، حالاں کہ وہ عورت شریف معلوم ہو رہی تھی، اس سے کہا: یہ کیوں لے جا رہی ہو؟ اس نے کہا: میری حالت ایسی ہے کہ میرے لیے اس وقت اس کا کھانا جائز ہے۔ فوراً ان کو خیال آیا، اس سے کہا کہ: اس کو پھینک دو اور ٹھہرو۔ پھر انہوں نے وہ ٹفن جو گھر سے ساتھ لائے تھے، جس میں وافر مقدار میں کھانا تھا وہ پورا اٹھا کر اس عورت کے ہاتھ میں دے دیا کہ اس کو لے جاؤ، اور واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ان کے نام کا اعلان ہوا، ان کو بلایا گیا اور بتایا گیا کہ آپ کو جس مقصد کے لیے وہاں بھیجا جا رہا تھا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی، اس لئے آپ واپس آ جائیں، وہ واپس گھر آ گئے اور سوچنے لگے کہ، آخر مجھے وہاں کیوں بھیجا گیا تھا؟ بہت سوچنے کے بعد نتیجہ یہی نکلتا ہے

کہ اس عورت کو ٹفن پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے سرکاری طور پر یہ انتظام کیا تھا۔

دوسروں کے نام سے کھلاتے ہیں

اس لیے میں دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں کسی بڑے آدمی نے کھلوایا کہ فلاں وقت آپ کے یہاں آرہے ہیں، اور کھانا کھائیں گے، اس لیے ان بڑے آدمی کے شایان شان کھانا تیار کروایا جاتا ہے، لیکن وقت آنے پر اطلاع ملتی ہے کہ وہ نہیں آئیں گے، اور پھر دوسرے کچھ مہمان آجاتے ہیں، لہذا ان کے سامنے وہ کھانا رکھا جاتا ہے۔ اب یہ مہمان اگر پہلے سے اطلاع بھی کرتے تو ان کے لیے اتنا اہتمام نہیں کیا جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کو یہی سارے پکوان کھانا منظور تھے تو دوسرے کے نام سے ان کے لئے انتظام کروایا گیا۔

چیونٹی کی روزی کا منظر

ہم نے اپنے بچپن میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ مضمون نگار نے تصورات کے اندر ایک عمدہ منظر قائم کیا تھا کہ افغانستان کے فلاں علاقہ میں بادام کا ایک باغ ہے، وہاں بادام لگے، جب سیزن آیا تو بادام اتارے گئے، ان کو بورپوں میں بھرا گیا، وہاں سے پاکستان لائے گئے، وہاں کے بازار میں بکے، ایک بیوپاری اسے ہندوستان لایا، دہلی کے کسی بازار میں فروخت ہو کر سورت آئے، اور سورت کے بیوپاری سے آپ نے خریدے، اپنے گھر لائے، پھر کسی مولوی صاحب کی دعوت کی تو اس میں زردہ پکایا جس میں وہی بادام ڈالا گیا، ان صاحب نے کھایا، اور کھاتے وقت دانتوں کے اندر اس بادام کے کچھ ذرات رہ گئے، وہ واپس لوٹ رہے تھے، پلیٹ فارم پر بیٹھ کر حلال کر رہے تھے کہ اس خلال کے دوران ایک ذرہ دانت میں سے نکلا، انہوں نے اسے

پھینکا، وہاں ایک چیونٹی تھی اس نے اس کو اٹھالیا۔

یہ سارا ایک تصوراتی منظر قائم کیا گیا ہے جس سے وہ بھی بتانا چاہتا ہے کہ چیونٹی کی روزی تو اتنی سی ہی ہے، اس کو تھوڑا کلو دو کلو چاہیے، اس کو تو ایک دو ذرے ہی چاہئیں، اس کی روزی پہنچانے کا اللہ تعالیٰ نے کیسا عجیب انتظام کیا کہ اتنی دور ایک چیز پیدا ہوئی جو اس کی روزی تجویز تھی تو اس تک پہنچائی۔ کیا کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ اس چیونٹی کے منہ کے اندر جو ذرہ پہنچا ہے، وہ کہاں سے کس طرح آیا؟ حقیقت کی دنیا میں اس سے بھی زیادہ عجیب واقعات رونما ہوتے ہیں؛ لیکن ہم غور نہیں کرتے۔

روزی کا انتظام؛ ہمارے بس کی بات نہیں

ہم بھی بہت سی مرتبہ کیلا کھا کر اس کا چھلکا پھینک دیتے ہیں اور کوئی بکری آکر اس کو اٹھا کر کھا لیتی ہے۔ اب سوچنے کی ضرورت ہے کہ وہ کیلا کہاں تیار ہوا تھا، کہاں کہاں سے ہو کر ہمارے ہاتھ میں آیا، ہم نے کھایا اور چھلکا پھینکا، اور اس بکری نے کھایا اب بکری کی روزی تو یہی چھلکا ہے، اس کو کیلا نہیں کھانا ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے لیے چھلکا ہی مقدر ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے یہ چھلکا کہاں سے بھیج دیا؛ یہ سوچنے کی بات ہے۔ اس لیے صرف انسان ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کے واسطے۔ چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی، چیونٹی ہو یا بکری۔ روزی کا انتظام کیا ہے، ہر ایک کو اللہ تعالیٰ روزی پہنچا رہا ہے اور روزی پہنچانے کا اس نے جو ذمہ لے رکھا ہے اس کو وہ پورا کر رہا ہے۔ انسان اگر یہ چیز سوچے تو واقعہ یہ ہے اس میں اس کے لئے بڑی عبرت کا سامان موجود ہے، کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ یہ کام کر سکے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسی حکومت دی تھی کہ اس سے پہلے نہ کسی کو ملی اور نہ بعد میں کسی کو ملے گی۔ ایک مرتبہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: باری تعالیٰ! میں ایک سال کے لیے تمام مخلوق کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: اے سلیمان! یہ تمہارے بس کا کام نہیں ہے۔ کہا: ایک مہینے کی۔ کہا: نہیں کر سکتے۔ کہا: ایک ہفتہ کی۔ کہا: نہیں کر سکتے۔ کہا: ایک دن کی۔ تو کہا: نہیں کر سکتے، لیکن اچھا چلو، تم کہتے ہو تو ایک دن کی کر کے دیکھ لو۔ انہوں نے کھانا پکوانا شروع کیا، ان کے تابع تو جنات بھی تھے، انہوں نے جنات اور انسان سب کو کام پر لگایا، اور تمام جگہوں سے بہت سارا کھانا منگوایا اور آٹھ روز تک پکویا جاتا رہا۔ پھر سمندر کے کنارے دسترخوان لگایا گیا، اس لئے کہ اتنی بڑی جگہ اور کہاں ملتی۔ اور جو کھانا پکویا تھا وہ سب وہاں رکھ دیا، پھر سوچا کہ کس سے شروعات کی جائے، تو خیال آیا کہ سمندر کی مخلوق سے ابتداء کی جائے، چنانچہ اعلان کرایا۔ ایک مچھلی باہر آئی اور ذرا سی دیر میں سب کچھ چٹ کر گئی اور کہنے لگی کہ اور کچھ ہے؟ حضرت سلیمان علیہ السلام کہنے لگے: اب کیا چاہیے؟ اس نے کہا: ابھی تو میری بھوک باقی ہے۔ پھر اس مچھلی نے کہا: آج جو کھایا اس کا ڈبل روزانہ ایک وقت کھاتی ہوں اور جب سے میں پیدا ہوئی ہوں میرا اللہ مجھے دو وقت برابر کھلا رہا ہے، لیکن اے سلیمان! آج تمہاری دعوت کی وجہ سے مجھے بھوکا رہنا پڑا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کہنے لگے: روزی دینا اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، کسی انسان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ بہر حال! اللہ تعالیٰ ہی تمام مخلوق کو روزی پہنچانے والا ہے۔

تو بسم اللہ پڑھنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ ویسے ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعہ

بندہ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک تعلق پیدا کیا جا رہا ہے۔ صرف اپنے خیال، زاویہ نگاہ، اور سوچنے کے انداز کو بدلنے کی ضرورت ہے، اگر ادھر دھیان دیا جائے گا تو دھیرے دھیرے یہی چیز اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ بنے گی۔

اس روایت میں ایک ادب یہ بتلایا کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھی جائے۔ اور دیکھو! حضرت عمر بن ابوسلمہ رضی اللہ عنہما چھوٹے بچے تھے، لیکن چھوٹا سمجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چھوڑ نہیں دیا، بلکہ ان کو ہدایات دیں اور آداب سکھائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پچھلے کئی ابواب سے علامہ نووی رحمہ اللہ نے زندگی کے آداب سے متعلق نبی کریم ﷺ کی جو تعلیمات ہیں ان کو پیش کرنا شروع کیا ہے، چنانچہ باب کا عنوان قائم کیا تھا: ”التَّسْبِيَةُ فِيْ أَوَّلِهِ وَآخِرِهِ“ کھانے سے پہلے اللہ کا نام لینا اور کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور تعریف بیان کرنا۔ یہ کھانے کے آداب میں سے ہے۔ اس باب میں کھانے کے آداب سے متعلق دو چیزیں بتائی ہیں۔ گزشتہ مجلس میں ایک آپچی ہے، آج حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت پیش کر رہے ہیں۔

شروع میں نہیں تو جب یاد آئے

۷۲۹:- وعن عائشة رضي الله عنها قالت قال رسول الله ﷺ: إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَذْكُرِ اسْمَ اللَّهِ تَعَالَى، فَإِنْ نَسِيَ أَنْ يَذْكُرَ اسْمَ اللَّهِ تَعَالَى فِي أَوَّلِهِ، فَلْيَقُلْ: بِسْمِ اللَّهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی جب کھانے کا ارادہ کرے، تو اللہ تعالیٰ کا نام لے، اور اگر کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو درمیان میں جب بھی اس کو یاد آئے، ”بِسْمِ اللَّهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ“ پڑھ لے۔

افادات:- صرف ”بسم اللہ“ کہا تب بھی سنت تو ادا ہو جائے گی، اور اگر بسم اللہ الرحمن الرحیم پوری پڑھے تو بہت اچھا ہے اور عام طور پر کھانے سے پہلے یہ دعا پڑھی جاتی ہے: ”بِسْمِ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ“ (المستدرک علی الصحیحین للحاکم/ حدیث: ۷۰۸۴) اصل تو یہ ہے کہ کھانے کا عمل جب شروع ہو، اس وقت اللہ کا نام لیا جائے، یہی مستحب اور

ادب ہے، لیکن اگر کوئی آدمی شروع میں اللہ کا نام لینا بھول جائے اور درمیان میں یاد آجائے تو یہ نہ سمجھے کہ میں تو محروم ہو گیا، بلکہ نبی کریم ﷺ نے اس کا بھی طریقہ بتا دیا کہ درمیان میں جب یاد آجائے تو ”بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلُهُ وَاٰخِرُهُ“ پڑھ لے یعنی اللہ کا نام شروع میں بھی اور آخر میں بھی لیتا ہوں (سنن ابی داؤد، باب التَّسْبِيحَةِ عَلَى الطَّعَامِ) ایک روایت میں یہ بھی ہے: ”بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلُهُ وَاَوْسَطُهُ وَاٰخِرُهُ“ شروع میں، درمیان میں اور آخر میں اللہ کا نام لیتا ہوں۔ (تحفۃ الذاکرین بعدۃ الحصن الحصین من کلام سید المرسلین ص: ۱۹۲)

بہر حال! نبی کریم ﷺ نے یہ بھی ایک طریقہ بتا دیا۔ کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا کوئی فرض اور واجب نہیں ہے کہ اگر چھوٹ گیا تو اس کی قضاء کی جائے، لیکن ایک نیک عمل ہے، اور شریعت کی تعلیمات ہمیں یہ بتلاتی ہیں کہ جو کسی عمل کا اپنے آپ کو پابند بنائے، اس کو چاہیے کہ اپنے عمل پر اہتمام کے ساتھ پابندی کے ساتھ عمل کرتا رہے، اس کو چھوڑنے کی نوبت نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کسی ایک لائن اور طریقہ سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری اور نیکیاں حاصل کرنے کی توفیق دی اور نیکی حاصل کرنے کا جو طریقہ آپ نے اپنی زندگی میں جس وقت جس اعتبار اور جس لائن سے بھی اپنا رکھا ہے، وہ طریقہ اگر کسی وجہ سے اپنے وقت پر چھوٹ گیا تو اس کو دوسرے وقت ادا کر لو، اگرچہ وہ فرض اور واجب نہیں، نہ اس کی قضاء واجب ہے، لیکن جب وہ نیکی کا ایک کام ہے جو ہم اپنے نامہ اعمال میں اس وقت پر اندراج نہ کر سکے، اور درمیان یا اخیر میں یاد آ گیا، تو اسی وقت پڑھ لیں۔

حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کا معمول

ہمارے بزرگوں نے اسی حکم سے ایک اور بات بتلائی ہے۔ ہمارے حضرت

مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خادم خاص حضرت مولانا ابراہیم صاحب پانڈور افریقی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: بعض مرتبہ سفر میں دیکھا کہ کسی وجہ سے حضرت کے نوافل جن کا معمول ہوا کرتا تھا وہ ادا نہیں ہو پائے، مثلاً: مغرب کے بعد اواہین کی عادت تھی، اور کسی وجہ سے وہ ادا نہ ہو پائے، جیسے: نماز کے بعد کچھ لوگوں سے ملنا ہے، یا بیان کا پروگرام رکھ دیا گیا ہے، اگر اواہین میں مشغول ہوتے ہیں تو جو لوگ سننے کے لیے بیٹھے ہیں ان کو انتظار کرنا پڑتا ہے، ان کو انتظار کی زحمت نہ ہو اس لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اپنی اواہین کو روک کر آدمی پروگرام میں مشغول ہو، تو مولانا فرماتے ہیں: حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ مغرب کے بعد وہ نوافل ادا کرنے کی نوبت نہیں آئی کیوں کہ عشاء تک بیان میں مشغولی رہی تو جب عشاء کی اذان ہوتی تھی تو عشاء کی سنتیں ادا فرماتے تھے اور ساتھ میں ان نوافل کو بھی ادا فرما لیتے تھے۔

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے تھے، ان کے متعلق لکھا ہے کہ: ایک مرتبہ کسی جگہ جا رہے تھے، مغرب کے بعد وہاں پہنچنا تھا، لیکن وقت پر نہیں پہنچ پائے، راستہ میں مغرب کی نماز پڑھنے کی نوبت آئی تو اس خیال سے کہ وہاں لوگ انتظار میں ہوں گے مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعت سنت مؤکدہ ادا کیں اور اواہین چھوڑ کر جہاں جانا تھا وہاں پہنچے، لوگ پہلے سے انتظار ہی میں تھے، بیان میں مشغول ہو گئے، اسی میں عشاء کا وقت آ گیا۔ عشاء کے بعد پھر کچھ دیر تک مشغولی رہی۔ بعد میں ساتھیوں سے پوچھا: بھائی! اواہین کا کیا ہوا؟ کہا: حضرت! وہ تو چھوٹ گئیں، اس لیے کہ پروگرام میں مشغول ہو گئے تھے، اگر اواہین میں مشغول ہوتے تو لوگوں کو

انتظار کی زحمت برداشت کرنی پڑتی، تو حضرت نے اپنے ماتحتوں کی تربیت کے لیے بتایا کہ جب عشاء کی اذان ہوئی تو اذان اور نماز کے درمیان میں جو وقت ملا تھا، ہم نے تو اس وقت اواین بھی ادا کر لی۔ پھر فرمایا: اگرچہ یہ فرض اور واجب نہیں، لیکن جب ہم اس کے عادی ہو گئے ہیں کہ اپنے نامہ اعمال میں روزانہ اتنی نفل کا ثواب لکھوائیں، تو آج کیوں خالی جانے دیں، اگر اس مقررہ وقت پر نہ لکھو پائے تو بعد میں جب اللہ تعالیٰ موقعہ دے اس وقت اس کا اہتمام کر لینا چاہیے۔ بزرگوں سے یہی چیزیں سیکھنے کی ہوتی ہیں۔

ہمارے دیگر اکابر کو بھی دیکھا کہ وہ اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ کوئی معمول وقت پر ادا نہ ہو پایا تو دوسرے وقت میں اس کو۔ قضاء کی نیت سے نہیں، لیکن۔ ادا کر لیتے ہیں، اس لیے کہ جس نیک عمل کی پابندی کر رہے تھے، کیوں اس عمل سے محروم رہیں۔ اس روایت میں نبی کریم ﷺ نے جو طریقہ بتایا کہ کھانے کے شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھی اور درمیان میں یاد آ گیا تو آدمی یہ سوچے کہ شروع میں تو نہیں پڑھ سکا ثواب درمیان میں تو پڑھ لوں۔

منون دعائیں؛ حفاظت کا ذریعہ

۷۳۰:- وعن جابر بن عبد الله قال: سمعتُ رسول الله ﷺ يقول: إِذَا دَخَلَ الرَّجُلُ بَيْتَهُ، فَذَكَرَ اللَّهَ تَعَالَى عِنْدَ دُخُولِهِ، وَعِنْدَ طَعَامِهِ، قَالَ الشَّيْطَانُ لِأَصْحَابِهِ: لَا مَبِيتَ لَكُمْ وَلَا عَشَاءَ. وَإِذَا دَخَلَ فَلَمْ يَذْكُرِ اللَّهَ تَعَالَى عِنْدَ دُخُولِهِ، قَالَ الشَّيْطَانُ: أَذْرَكْتُمُ الْمَبِيتَ، وَإِذَا لَمْ يَذْكُرِ اللَّهَ تَعَالَى عِنْدَ طَعَامِهِ، قَالَ: أَذْرَكْتُمُ الْمَبِيتَ وَالْعَشَاءَ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے

ہوئے سنا: جب کوئی آدمی اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ کا ذکر کرتا ہے، دعا پڑھتا ہے، اور جب کھانے کے لیے بیٹھتا ہے تو اس وقت کی دعا پڑھتا ہے؛ تو شیطان اپنے لشکر سے کہتا ہے: اس گھر میں نہ تو قیام کی گنجائش ہے اور نہ کھانے کا کوئی انتظام ہے۔ اور جب آدمی اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ کا نام نہیں لیتا تو شیطان اپنے لشکر سے کہتا ہے: تم کو اس گھر میں ٹھکانہ تو مل گیا۔ اور جب کھانے کے لیے بیٹھتا ہے اور بسم اللہ نہیں پڑھتا، تو شیطان اپنے رفقاء سے کہتا ہے: ٹھکانہ بھی مل گیا اور کھانا بھی مل گیا۔

افادات:- لہذا جب آدمی گھر میں داخل ہو تو وہ دعا پڑھ لینی چاہیے جو نبی کریم ﷺ نے ہمیں سکھائی ہے: **اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَ الْمَوْجِبِ، وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ، بِسْمِ اللَّهِ وَكُنْثَنَا، وَبِسْمِ اللَّهِ خَرَجْنَا، وَعَلَى اللَّهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا** (سنن ابی داود: ۵۰۹۶) اگر دعا یاد نہ ہو تو اس کو لکھ کر گھر کے دروازہ پر لگا دو؛ تاکہ جب داخل ہو تو اس پر نظر پڑے تو یاد آجائے، ایک مدت تک جب یہ معاملہ رہے گا تو ان شاء اللہ عادت پڑ جائے گی، اور پھر آسان ہو جائے گا۔

پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ایک تو ان دعاؤں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ایک خاص نسبت پیدا ہوتی ہے، جب آدمی موقع بہ موقع، ہر کام میں ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کا نام لے گا اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں بیٹھے گی، اللہ کی ذات کے ساتھ تعلق قائم ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی یاد ہر وقت باقی رہے گی۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اس طرح آدمی اللہ تعالیٰ سے خیر مانگ رہا ہے، یعنی کہ میرا گھر میں داخل ہونا بھی بہتر اور اچھے انداز میں ہو۔ کیوں کہ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کی غیر موجودگی میں گھر میں کیا ہوا ہے، ہو سکتا ہے کہ گھر میں داخل ہوئے اور بیوی نے کہا کہ بچہ کو بخار ہے۔ جب پہلے ہی سے بہتری مانگ لی اور کوئی پریشان کن خبر سن لی

یا اور کوئی پریشانی سے واسطہ پڑا، تو چوں کہ پہلے ہی سے دعا مانگ لی ہے کہ بہترین داخل ہونا نصیب ہو، تو اللہ تعالیٰ خیر عطا فرمادیں گے۔ اس کے بعد جب گھر سے نکلنے کا وقت آئے تو اللہ تعالیٰ اچھے انداز سے نکلنا نصیب کرے۔ یہ نہیں کہ داخل ہوئے تو پتہ چلا کہ بچہ بیمار ہے تو نکلنا بھی اچھا نہیں ہوا، اگر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ لی ہے تو دونوں چیزیں اچھے انداز میں مل جائیں گی، اور جیسا کہ پہلے بھی بتایا تھا کہ آپ ﷺ کی تعلیمات میں ان چیزوں کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

شیطانی اثرات کا توڑ

حضرات انبیاء ہدایت کے لیے دنیا میں آتے ہیں، اور اللہ کی مخلوق کا اللہ کی ذات سے تعلق قائم کرتے ہیں، ہر چیز میں اور ہر موقع پر ان کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ اپنے رب سے جڑے، اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق قائم ہو، اس کے لئے مختلف طریقے اور راستے بتلاتے ہیں۔ اور شیطان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے دور ہو، اس کا تعلق کم ہو، یا کٹ جائے۔ انسان کا بچہ جو نہی دنیا میں قدم رکھتا ہے، اسی وقت سے یہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ روتا ہے، اس لیے کہ جب وہ دنیا میں قدم رکھتا ہے تو شیطان اس کے دل کو چھوٹا ہے (بخاری شریف: باب وانی أعبى لها بك وخرى بها من الشيطان الرجيم) تو ایک نئی چیز جو آج تک اس کو پیش نہیں آئی تھی وہ اس کو پیش آتی ہے، جس کی وجہ سے وہ بچہ ایک طرح کا اجنبی پن محسوس کرتا ہے، اور روتا ہے۔

در اصل شیطان کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل پر وسوسہ اندازی کی قدرت دی ہے، اس سے زیادہ اور کچھ طاقت اس کے پاس نہیں، وہ ڈنڈا لے کر آپ سے گناہ نہیں

کروائے گا، اور نہ آپ کا ہاتھ پکڑ کر گناہ کروائے گا، اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف اتنی ہی طاقت دی گئی ہے کہ وہ انسان کے دل میں وسوسہ اندازی کر سکے، اور اسی کے ذریعہ وہ آدمی کو گناہوں پر آمادہ کرتا ہے۔ اب وہ ماں جس کے پیٹ میں بچہ ہے اس کے دل پر تو وسوسہ اندازی کر سکتا ہے، لیکن اس کو اتنی طاقت نہیں کہ جب تک وہ بچہ ماں کے پیٹ میں ہے اس کو ٹچ (Touch) بھی کر سکے، کیوں کہ وہ بچہ ابھی تک دنیا میں نہیں آیا ہے۔ جتنے انسان دنیا میں آچکے ہیں ان پر تو وہ اپنا تصرف کر سکتا ہے، لیکن اس بچہ پر نہیں، اس لیے کہ جب تک وہ ماں کے پیٹ میں ہے دوسرے عالم میں ہے، حالانکہ وہ ماں کے پیٹ میں ہے، ماں کا دل بھی اندر ہے اور اس کا بھی دل اندر ہی ہے، لیکن ماں کے دل پر تصرف کر سکتا ہے، اس بچہ کے دل پر تصرف نہیں کر سکتا، کیوں کہ بچہ ابھی دنیا کی چیز نہیں بنا، لیکن اس کے پیدا ہوتے ہی شیطان پہنچ جاتا ہے اور اس کے دل کو ٹٹولنے لگتا ہے۔

شیطان اپنے کام میں بہت ہوشیار ہے، اس لیے کہ اس کی محنت کا میدان انسان کا دل ہے، اور نیا انسان دنیا میں آیا تو جہاں محنت کرنی ہے وہاں جائزہ لینے کے لئے پہنچ جاتا ہے۔ جیسے: چور جب کسی مکان میں چوری کرنے والا ہوتا ہے تو ایک دم سے وہاں نہیں پہنچ جاتا، بلکہ دو چار روز آگے پیچھے سے پلاننگ کرتا ہے، جائزہ لیتا ہے کہ وہ مکان کہاں ہے، اور کہاں سے داخل ہونا ہے، ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد وقت آنے پر وہ اپنا کام کرتا ہے۔ اسی طرح شیطان کا معاملہ بھی ہے کہ بچہ جب بڑا ہوگا اس وقت وہ مکلف ہوگا، لیکن دنیا میں اس کے آتے ہی شیطان دیکھ لیتا ہے کہ میرا ایک نیا شکار دنیا میں آیا ہے، اس کا جائزہ لے لو۔ جیسے: دوا بنانے والی کمپنی اپنی دوا فروخت کرنے کے لیے سیلس مین رکھتی ہے، ان کو جیسے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی شہر میں کسی ڈاکٹر

نے نیا شفاء خانہ کھول دیا ہے، تو فوراً وہ پہنچ جاتے ہیں کہ ہماری محنت کا نیا میدان ہے، ان سے ملاقات کرتے ہیں۔ شیطان بھی جب دیکھتا ہے کہ کوئی نیا بچہ دنیا میں آیا ہے تو اس کے دل کو جا کر ٹٹولتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے اثرات کو دور کرنے کے لیے اس کا بدل رکھا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ بچہ جب پیدا ہو تو جو آلائشیں ماں کے پیٹ سے لے کر نکلا ہے اس کو دھونے کے بعد غسل دے کر دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے۔ یہ اذان و اقامت کے جو کلمات کہلوائے جارہے ہیں وہ شیطان کے انہی اثرات کو دور کرنے کا کام کرتے ہیں جو اس بچہ کے دل کو چھونے کے نتیجہ میں آتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی رسالت اور اسلام کے بنیادی عقائد ہیں، ان کو گویا اس کے دل میں اتارنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بچہ اگرچہ ابھی کچھ جانتا نہیں ہے، لیکن اس کا دل ٹیپ ریکارڈ جیسا ہے، اس میں وہ چیز محفوظ ہوگی اور وقت آنے پر اپنا کام کرے گا۔

خود ہی موقع دیں؛ پھر پریشان ہوں!

اب شیطان اپنے اثرات ڈالنے، اپنی زمین ہموار کرنے اور وسوسہ اندازی کے واسطے ابھی سے محنت کر رہا ہے۔ جیسے کسی کے اوپر محنت کرنی ہوتی ہے، تو پہلے ماحول کو سازگار بنایا جاتا ہے، جب ماحول سازگار ہو جائے گا، اس کے بعد اس پر محنت کی جائے گی۔ اسی لئے اس حدیث پاک میں بتایا گیا کہ آدمی جب گھر میں داخل ہوتا ہے، تو شیطان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اللہ کا نام نہ لے، اس لیے کہ آدمی جب اللہ کا نام لئے بغیر گھر میں داخل ہوتا ہے تو شیطان کو بھی اندر آنے کا موقع مل جاتا ہے، وہ اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ آج رات تم کو یہاں ٹھہرنے کا موقع مل گیا، گویا قیام کی بکنگ

ہوگئی۔ پھر جب کھانے کے لیے بیٹھا اور بسم اللہ نہیں پڑھی تو کھانے کی بھی بنگ ہوگئی۔ اب یہ ہوگا کہ جب شیطان پورے لشکر کے ساتھ گھر میں داخل ہو چکا، تو ویسے باہر رہ کر بھی وسوسہ اندازی کر سکتا تھا، لیکن اب وسوسہ سازی کے لیے جس قسم کا ماحول مطلوب ہے وہ اس کو حاصل ہو گیا، اب اور اچھے انداز میں وہ اپنی محنت کرے گا اور گمراہ کرے گا۔ پھر جب اس کو کھانا مل جائے گا تو اب کھانے میں شریک ہو جائے گا، اس لیے کھانے کی جو برکت اور نورانیت ہے وہ حاصل نہیں ہوگی، اس کے بعد شیطان کو مزید وسوسہ اندازی کا موقع مل جائے گا۔

اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: جب گھر میں داخل ہو تو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر داخل ہونا اور جب کھانے کے لیے بیٹھو تو اللہ کا نام لینا، کیوں کہ شیطان کا کام ہے کہ وہ انسان کی ہر چیز میں اپنا حصہ لگانا چاہتا ہے، اس کے گھر میں، کھانے میں، رہائش گاہ میں؛ یہاں تک کہ مرد جب اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستری کرتا ہے، تو اس صحبت میں بھی شیطان شریک ہونا چاہتا ہے۔ اس لیے اس موقع پر بھی دعا سکھائی گئی ہے۔ وہ دعا یہ ہے: ”بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ، وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا“

اسی طرح آدمی جب بیت الخلاء میں جاتا ہے تو وہاں بھی شیطان اس کی شرم گاہ سے کھینے کی کوشش کرتا ہے، اس وقت بھی تعلیم دی گئی کہ پہلے بسم اللہ کہو اور پھر یہ دعا پڑھو: ”اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبْثِ وَالْخُبَّائِثِ“ یہ ساری دعائیں معمولی نہیں ہیں، بلکہ ان دعاؤں کے ذریعہ ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے قائم ہوتا ہے، اور اسی کے ذریعہ شیطان کے حملوں سے حفاظت کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ ہم ان دعاؤں کا اہتمام نہیں کرتے، گویا کہ ہم نے خود شیطان اپنے اوپر حملہ کرنے کا موقع دیا، پھر جب شیطان کی وسوسہ اندازی ہوتی ہے تو پریشان ہوتے ہیں۔ لہذا ہم پہلے

سے شیطان کو ماحول سازگار بنانے اور اپنے اوپر حملہ کرنے کا موقعہ ہی کیوں دیں؟ اگر ان دعاؤں اور ان ساری تعلیمات کا اہتمام کریں گے تو اس کے حملوں سے محفوظ ہو جائیں گے، اور اگر تھوڑے بہت ہو بھی گئے تو جب اللہ تعالیٰ سے پناہ حاصل کریں گے تو شیطان کے شر سے جلدی اور آسانی سے بچ جائیں گے۔ اس لیے اس کا خاص اہتمام خود بھی کرنا چاہیے اور اپنے گھر والوں کے پاس بھی کرانا چاہیے۔

شیطان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں

۷۳۱:- وعن حذيفة بن اليمان رضي الله عنه قال كُنَّا إِذَا احْضَرَ نَامَعَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ طَعَامًا، لَمْ نَضَعْ أَيْدِينَا حَتَّى يَبْدَأَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، فَيَضَعُ يَدَهُ، وَإِنَّا احْضَرْنَا مَعَهُ مَرَّةً طَعَامًا، فَجَاءَتْ جَارِيَةٌ كَاتِمًا تُدْفِعُ، فَذَهَبَتْ لِتَضَعَ يَدَهَا فِي الطَّعَامِ، فَأَخَذَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِيَدِهَا، ثُمَّ جَاءَ أَعْرَابِيٌّ كَأَنَّمَا يُدْفِعُ، فَأَخَذَ بِيَدِهِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: إِنَّ الشَّيْطَانَ يَسْتَحِلُّ الطَّعَامَ أَنْ لَا يَذْكُرَ اسْمَ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ، وَإِنَّهُ جَاءَ بِهِدِ الْجَارِيَةِ لِيَسْتَحِلَّ بِهِ، فَأَخَذْتُ بِيَدِهَا، فَجَاءَ بِهَذَا الْأَعْرَابِيٍّ لِيَسْتَحِلَّ بِهِ، فَأَخَذْتُ بِيَدِهِ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، إِنَّ يَدَهُ فِي يَدِي مَعَ يَدَيْهِمَا.. ثُمَّ ذَكَرَ اسْمَ اللَّهِ تَعَالَى وَآكَلَ.

ترجمہ:- حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جب کھانے کے لیے نبی کریم ﷺ کے ساتھ کسی دعوت یا کھانے میں حاضر ہوتے تھے تو ہم کھانے کے لیے اپنے ہاتھ آگے نہیں بڑھاتے تھے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کھانا شروع فرمائیں۔ ایک مرتبہ ایک دعوت کے موقعہ پر ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے ساتھ موجود تھے، کھانا دسترخوان پر چن دیا گیا، ابھی نبی کریم ﷺ نے کھانا شروع نہیں فرمایا تھا، اپنا دست مبارک آگے نہیں بڑھایا تھا کہ ایک بچی

تیزی کے ساتھ آئی، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی دھکے دے کر اس کو لارہا ہے، اس نے کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا تو نبی کریم ﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا (یعنی اس کو کھانے نہیں دیا، اس لیے کہ اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی) اس کے بعد ایک دیہاتی تیزی سے آیا اور اس نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا تو حضور اکرم ﷺ نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا (کھانے کے اندر ہاتھ ڈالنے نہیں دیا، اس لیے کہ اس نے بھی بسم اللہ نہیں پڑھی تھی) اس کے بعد حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کھانے پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، شیطان اس کھانے کو اپنے لیے حلال کر لیتا ہے۔ پھر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے؛ شیطان کا ہاتھ ان دونوں کے ہاتھ کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع فرمایا۔

فوائد حدیث

افادات:- اس روایت سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوئے:-

[۱]:- یہ بھی ادب میں سے ہے کہ بڑوں کے ساتھ جب کھانے کے لیے بیٹھے ہوں تو جب تک بڑے کھانا شروع نہ کریں، چھوٹوں کو کھانا شروع نہیں کرنا چاہیے، جب وہ شروع کریں تب دوسروں کو چاہیے کہ کھانا شروع کریں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرات صحابہ کا یہی معمول تھا۔

[۲]:- یہ بھی معلوم ہوا کہ جو آدمی اپنے چھوٹوں کو اپنے ساتھ لے کر کھانے کے لیے بیٹھا ہو، اس کو چاہیے کہ ان کی نگرانی کرے کہ انہوں نے بسم اللہ پڑھی یا نہیں، اگر نہ پڑھی ہو تو ان کو کھانا کھانے نہ دے، ان کا ہاتھ پکڑ لے، اور کہے کہ پہلے بسم اللہ پڑھو، اس کے بعد کھانا شروع کرو۔ تربیت کا یہی تقاضہ ہے۔ دیکھیے! یہاں نبی کریم ﷺ

نے اس بچی کا ہاتھ پکڑ لیا، اس لیے کہ اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بچوں کو ادب سکھانا چاہیے۔

آج کل تو ماں باپ اس کا اہتمام ہی نہیں کرتے، جب بچہ کی مرضی ہوگی تو کھائے گا، خادمہ اور نوکرانی اس کو کھلا دے گی، ماں باپ اپنی اپنی مرضی سے کھائیں گے۔ ماں باپ کو یہ پرواہ ہی نہیں کہ بچوں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلائیں کہ ان کو کھانے کے آداب سے واقفیت ہو؛ حالاں کہ ماں باپ کے لیے ضروری ہے کہ باقاعدہ خود بیٹھ کر بچوں کو اپنے ساتھ بٹھائیں اور اس کا اہتمام کرائیں۔

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی کو چاہیے اپنے چھوٹوں اور ماتحتوں کی نگرانی کرے، ان کی طرف سے اگر ان آداب کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی ہو تو اس پر ٹوٹے اور آئندہ آداب کے اہتمام کے ساتھ تمام کاموں کی ادائیگی کی تاکید کرے۔

[۳] :- دراصل شیطان اپنا ہاتھ ڈال کر اس کھانے کو اپنے لیے حلال کرنا چاہتا تھا، اس لیے وہ اس بچی کو دوڑاتا ہوا لایا، وہ چاہتا تھا کہ یہ بچی بغیر بسم اللہ پڑھے جلدی سے اس کھانے میں ہاتھ ڈال دے، تاکہ اس کو واسطہ بنا کر اس کھانے میں شریک ہو جائے، لیکن حضور ﷺ نے بچی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس تدبیر میں کامیاب نہیں ہوا تو دیہاتی کو لے آیا، وہ دوڑا ہوا آیا اور اس نے بھی بغیر بسم اللہ کہے ہاتھ آگے بڑھا کر کھانا چاہا، تو حضور ﷺ نے اس کا بھی ہاتھ پکڑ لیا، اس لیے کہ اگر حضور ﷺ اس کو کھانے دیتے تو شیطان اس کے ساتھ شریک ہو جاتا۔

شروع میں نہیں؛ تو اخیر میں سہی

۴۳۲ :- وعن أمية بن حنبلٍ صحابيٍّ رضي الله عنه قال: كان رسول الله ﷺ

جَالِسًا، وَرَجُلٌ يَأْكُلُ، فَلَمْ يُسَمِّ اللَّهَ حَتَّى لَمْ يَبْقَ مِنْ طَعَامِهِ إِلَّا لَقْمَةٌ، فَلَمَّا رَفَعَهَا إِلَى فِيهِ، قَالَ: بِسْمِ اللَّهِ أَوَّلُهُ وَآخِرُهُ، فَضَحَكَ النَّبِيُّ ﷺ ثُمَّ قَالَ: مَا زَالَ الشَّيْطَانُ يَأْكُلُ مَعَهُ، فَلَمَّا ذَكَرَ اسْمَ اللَّهِ اسْتَقَاءَ مَا فِي بَطْنِهِ. (رواه أبو داود والنسائي)

ترجمہ:- حضرت امیہ بن مخشبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ تشریف فرما تھے، ایک آدمی کھانا کھا رہا تھا، کھانے کے شروع میں اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی (اس لیے شیطان بھی کھانے میں اس کے ساتھ شریک تھا۔ اس آدمی کو تو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن نبی کریم ﷺ دیکھ رہے تھے) یہاں تک کہ اس کے کھانے میں سے ایک ہی لقمہ باقی بچا تھا کہ اس کو یاد آ گیا کہ میں نے شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھی ہے، لہذا اس نے فوراً کہا: ”بِسْمِ اللَّهِ أَوَّلُهُ وَآخِرُهُ“ یہ منظر دیکھ کر نبی کریم ﷺ ہنس پڑے، پھر ارشاد فرمایا: شیطان برابر اس آدمی کے ساتھ شریک رہا، آخر میں جب اس نے یہ دعا پڑھی تو شیطان نے کھایا ہوا قے کر دیا (یعنی شیطان اس کھانے کو ہضم نہیں کر سکا۔)

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ اخیر میں بھی یاد آ جائے تو پڑھ لے۔ بعض لوگ سوچتے ہیں کہ شروع میں نہیں پڑھی تو اب اخیر میں کیا پڑھنی؟ یہ بھی شیطانی دھوکہ ہے۔ جو طریقہ ہمیں بتایا گیا ہے ہمیں تو اس پر عمل کرنا ہے۔ اس طرح کی سوچ اور خیال بھی شیطانی وسوسہ ہے، شیطان اپنے کھانے کو محفوظ کرنا چاہتا ہے۔

بعض لوگوں کا مزاج اعتراض والا ہوتا ہے اور آج کل عموماً ایسا مزاج بن گیا ہے کہتے ہیں کہ جب شیطان نے قے کر دی تو اس سے ہمیں کیا فائدہ ملا؟ ایک صاحب نے ایک مرتبہ یہی سوال کیا تھا۔ اس کا جواب ظاہر ہے کہ شیطان کو اس کھانے میں شریک ہونے کی وجہ سے وسوسہ اندازی کا اچھا موقع فراہم ہو جاتا ہے، اور شیطان کے اثرات کھانے میں آ جاتے ہیں، لیکن جب بسم اللہ پڑھ لی گئی، چاہے آخری لقمہ سے پہلے ہی

کیوں نہ ہو، اور شیطان نے قے کر دی، تو اب شیطان کو اس راہ سے اس پر قابو پانے کا موقع نہیں ملے گا۔ معلوم ہوا کہ آخری لقمہ پر بھی یاد آ جائے تو بسم اللہ پڑھ لی جائے۔

بسم اللہ کی برکت

۷۳۳:- وعن عائشة رضي الله عنها قالت: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَأْكُلُ طَعَامًا فِي سِتَّةٍ مِنْ أَصْحَابِهِ، فَبَاءَ عُرَائِيٌّ، فَأَكَلَهُ بُلْقَمَتَيْنِ. فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: أَمَا إِنَّهُ لَوْ سَمَّى لَكَفَّاكُمُ. (رواه الترمذی).

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ چھ رفقاء کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ ایک دیہاتی آیا اس نے دو لقموں میں کھانا ختم کر دیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ آدمی اگر بسم اللہ پڑھتا تو یہ کھانا تم سب کو کافی ہو جاتا۔

افادات:- شیطان کے شریک ہونے سے کھانے کی برکت ختم ہو گئی۔ کھانے کی برکت یہی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کا نام لے، اور سب شریک ہونے والے بھی اللہ کا نام لیں؛ تاکہ شیطان کو کسی ایک کے واسطے سے بھی کھانے میں شریک ہونے کا موقع نہ ملے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ مؤمن ایک آنت سے کھاتا ہے (یعنی کم غذا سے اس کا پیٹ بھر جاتا ہے) اور غیر مسلم سات آنت سے کھاتا ہے (خوب ڈٹ کر کھاتا ہے) (باب المؤمن يأكل في معي واحد) آپ غور کرنا کہ ان کے کھانے کی مقدار مسلمانوں کے کھانے کی مقدار سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ آپ اگر چاہیں تو عملی طور پر تجربہ کر کے دیکھ لیں، وہ زیادہ ہی کھائیں گے۔ اور جو مسلمان بسم اللہ نہیں پڑھتے وہ بھی زیادہ ہی کھائیں گے۔ بسم اللہ پڑھ کر جو لوگ کھانے کا اہتمام کرتے ہیں تو کم غذا میں اللہ تعالیٰ ان کو سکون عطا فرما دیتے ہیں۔

اور بسم اللہ کو جتنے یقین کے ساتھ پڑھنے والا ہوگا اتنی ہی اس کے کھانے کی مقدار گھٹی جائے گی۔ اس لیے ہم اہل اللہ کو دیکھیں گے کہ کم غذا میں بھی ان کا کام چل جاتا ہے۔

دستر خوان اٹھانے کی دعا

۷۳۴:- وعن أبي أمامة رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا رَفَعَ مَائِدَتَهُ، قَالَ: الْحَمْدُ لِلَّهِ حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيهِ، غَيْرُ مَكْفِيٍّ، وَلَا مُوَدَّعٍ، وَلَا مُسْتَغْنَى عَنْهُ رَبَّنَا۔ (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب دسترخوان اٹھاتے تو یہ دعا پڑھتے تھے: ”تمام تعریف اللہ کے واسطے ہے، بہت زیادہ پاکیزہ اور برکت والی تعریف۔ اس کھانے کی شکرانہ کے ذریعہ سے کفایت نہیں کی گئی (یعنی جیسا شکر کا حق ہے ویسا شکر ہم نے ادا نہیں کیا) اور نہ اس کو چھوڑا جا رہا ہے۔ اور اے ہمارے رب! نہ ہم اس سے بے پروا ہی اختیار کر رہے ہیں۔“

افادات:- انسان کی عادت ہے کہ اس کو جس چیز کی حاجت ہوتی ہے اور جس چیز کا وہ محتاج ہوتا ہے، اس کو حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوتا ہے، اور جب وہ چیز نظر آتی ہے تو لپک کر اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس پر حملہ کر دے گا، لیکن جہاں اس کی اس سے ضرورت پوری ہوگئی کہ بس! اس چیز کی طرف سے بے پروا ہی اختیار کر لیتا ہے۔ کھانا: اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، جب بھوک کی وجہ سے ہم کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں، اس وقت کھانے کی طرف ہماری طبیعت کی جو رغبت، میلان و کشش ہوتی ہے، وہ ظاہر ہے۔ لیکن جب پیٹ بھر جاتا

ہے اور کھانے سے ہم اپنے ہاتھ کھینچتے ہیں، تو وہ کشت اور میلان جو شروع میں تھا اب باقی نہیں رہتا، اس کی وجہ سے کسی کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ کیا یہ کھانے کی طرف سے ایک طرح کا استغناء اور بے پرواہی ہے؟ اس دعا کے ذریعہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ عرض کر رہا ہے کہ: اے اللہ! میں جو ہاتھ کھینچ رہا ہوں وہ اس لیے نہیں کہ مجھے ضرورت نہیں ہے، بلکہ مجھے تو اس کی ضرورت ہے، میں تو ابھی تھوڑی دیر (چار پانچ گھنٹے) کے بعد دوبارہ اسی احتیاج و بے چینی اور رغبت و میلان کے ساتھ کھانے کی طرف دوبارہ ہاتھ بڑھانے والا ہوں، اس وقت بے پرواہی کی وجہ سے ہاتھ نہیں ہٹایا جا رہا ہے، اور اس کھانے کے شکرانہ کا جو حق تھا، وہ بھی ہم پوری طرح ادا نہیں کر سکے۔

گناہوں کی معافی کی بشارت

۷۳۵:- وعن معاذ بن أنسٍ رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: مَنْ أَكَلَ طَعَامًا، فَقَالَ: الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَطْعَمَنِي هَذَا، وَرَزَقَنِيهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِنِّي وَلَا قُوَّةٍ، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ. (رواه أبو داود والترمذی)

ترجمہ:- حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی کھانا کھائے پھر یہ دعا پڑھے: تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے یہ کھانا کھلایا اور یہ کھانا مجھے میری کسی تدبیر اور طاقت کے بغیر روزی کے طور پر عطا فرمایا (یعنی مجھ میں یہ طاقت نہیں تھی کہ میں یہ کھانا حاصل کرتا) تو اس کے پچھلے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

افادات:- کھانے کے دو ادب بتانے کے لیے یہ باب قائم کیا تھا، ایک تو شروع میں بسم اللہ پڑھنا یعنی اللہ کا نام لینا، اور آخر الحمد للہ یعنی اللہ کی تعریف و شکر ادا کرنا۔ پہلی مجلس میں بتا چکا ہوں کہ کھانے کی جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے وہ کستنی

مخنتوں کے بعد تیار ہوتی ہے، اگر ہم خود ان ساری مخنتوں کو استعمال کر کے کھانا تیار کرنا چاہتے تو نہیں کر سکتے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا نظام ہے جس کے نتیجہ میں یہ ساری چیزیں ہم تک پہنچتی ہیں۔ اور ہم نے جو کھانا کھایا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہے، اس پر شکر تو ویسے بھی ادا کرنا چاہیے تھا، اس کی حمد و ثناء ہمارے لیے ضروری ہے ہی، لیکن یہاں شکر ادا کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انعام دیا جاتا ہے کہ پچھلے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور گناہوں سے مراد صغیرہ گناہ ہیں، اس لیے کہ کبیرہ تو بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔ بہر حال! اس عمل پر گناہوں کی معافی کی بشارت بھی ہمیں سنائی جا رہی ہے۔ غور کیجئے کہ کتنا آسان نسخہ ہے!

اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

باب لا یعیب الطعام واستحباب مدحه

کھانے میں عیب نہ نکالے
اور اس کی خوبی بیان کرنے کا پسندیدہ ہونا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ کھانے کے آداب کا بیان چل رہا ہے، اسی سلسلہ میں آج ایک باب قائم کرتے ہیں: کھانے میں نہ کوئی عیب نکالے اور نہ کھانے کی برائی کرے۔ اور دوسری بات یہ کہ اس کی تعریف کرنے کا پسندیدہ ہونا۔

کچھ بھی بے کار نہیں قدرت کے کارخانہ میں

۴۳۶:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: مَا عَابَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ طَعَامًا

قَطُّ، إِنِ اشْتَهَا أَكَلَهُ، وَإِنْ كَرِهَهُ تَرَكَهُ. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا، نہ کبھی اس کی برائی کی۔ اگر پسند ہوتا تو آپ اس کو تناول فرما لیتے اور کھا لیتے، اور اگر پسند نہ ہوتا تو اس کو چھوڑ دیتے۔

افادات:- کھانا: یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق ہے، اس کی نعمت ہے، اس کا ایک عطیہ ہے، تو حق یہ ہے کہ آدمی اس نعمت اور عطیہ کے اوپر کوئی عیب نہ لگائے، اگر طبیعت کی رغبت ہے اور وہ چیز پسند ہے تو شوق سے کھائے، اور اگر پسند نہیں ہے تو اس کی برائی نہ بیان کرے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ اگر کھانا پسند نہیں ہے تو بس اس کی برائی کا دفتر کھول دیتے ہیں، ایسا کرنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق، اس کی نعمت اور عطیہ کی ناقدری کرتا ہے، آپ کو اگر پسند نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ چیز بے کار ہے:-

نہیں ہے کوئی چیز نیک زمانہ میں * کچھ بھی بے کار نہیں قدرت کے کارخانہ میں

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جتنی بھی چیزیں پیدا کی ہیں ان کی پیدائش میں کوئی نہ کوئی حکمت اور

مصلحت ضرور موجود ہے۔ ظاہری اعتبار سے وہ چیز چاہے کتنی ہی بری معلوم ہو، لیکن تکوینی اعتبار سے اس کا وجود اپنے اندر کسی نہ کسی فائدہ، حکمت اور مصلحت کو لیے ہوئے ہوتا ہے، سانپ اور بچھو جیسے موزی اور تکلیف دینے والے جانوروں کا وجود بھی مصلحت سے خالی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کائنات میں جو پیدا کیا ہے، اس کا بھی کوئی مقصد اور مصلحت ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہی بخوبی جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کی مصلحتوں کا انسان کہاں احصاء کر سکتا ہے اور تمام مصلحتوں کو کہاں جان سکتا ہے؟ کوئی چیز اگر آپ کے اور ہمارے علم میں نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں

مکھی کی پیدائش کا ایک فائدہ

ایک متکبر بادشاہ ایک مرتبہ اپنے محل میں تکبر کے ساتھ تخت پر بیٹھا ہوا تھا، ایک مکھی آکر اس کی ناک پر بیٹھ گئی، اس نے اڑایا، پھر آ کر بیٹھ گئی، پھر اڑایا، پھر آ گئی۔ بعض کھیاں ضدی ہوتی ہے کہ جتنا بھی اڑاؤ، واپس آ کر بیٹھ جاتی ہے (ویسے مکھی کو عربی زبان میں ”ذُبَاب“ کہتے ہیں۔ ذُبَاب کا معنی کسی چیز کو بھگانا اور دور کرنا، اور ”آب“، ”یُوب“ کا معنی لوٹنا؛ تو ”ذُبَاب“ اور ”آب“ مل کر ”ذُبَاب“ بنا ہے، کُلَّمَا ذُبَابٌ آبٌ یعنی اس کو بھگایا گیا تو وہ پھر لوٹ کر آئی، اسی سے عربی زبان میں اس کا نام ”ذُبَاب“ بنا ہے، اس کی خاصیت ہی یہ ہے کہ اس کو بھگاؤ تو وہ پھر آئے گی۔) تو اس بادشاہ نے اس کو دو تین مرتبہ بھگایا لیکن وہ پھر آ کر بیٹھی تو وہ بادشاہ کہنے لگا: معلوم نہیں کہ اللہ میاں نے یہ لکھیاں کیوں پیدا کی ہیں؟ اس کے اندر کوئی منفعت تو ہے نہیں، صرف نقصان ہی نقصان نظر آتا ہے۔ ایک اللہ والے وہاں بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے کہا: اس کا ایک فائدہ اس سے بڑا اور کیا ہو سکتا ہے کہ تیرے جیسے مغرور اور متکبر انسان کے غرور کو توڑ رہی ہے،

اللہ تعالیٰ نے اس مکھی کے ذریعہ تجھے بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ چھوٹی سی معمولی مخلوق اگر تجھے ستانا چاہے اور تو اپنے آپ کو اس سے بچانا چاہے تب بھی اس کو روک نہیں سکتا۔ بار بار تو اسے بھگا رہا ہے اور وہ واپس آ کر بیٹھ رہی ہے، تجھ میں تو اتنی بھی طاقت نہیں کہ اسے اپنے پاس سے ہٹا سکے اور دربار سے نکال سکے، تو اس نے تیرے غرور اور تکبر کو خاک میں ملا دیا، اس سے بڑا فائدہ اور کیا ہو سکتا ہے!

بچھو کے ذریعہ جان بچائی

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر میں سورہ فاتحہ کی تفسیر بہت تفصیل سے کئی صفحات کے اندر لکھی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کو بیان کرتے ہوئے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بزرگ دریائے دجلہ کے کنارہ جارہے تھے، انہوں نے ایک بڑا سا بچھو دیکھا جو تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اتنا بڑا بچھو یہاں کیسے آ گیا، تو یہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ کچھ دور کنارے کنارے چل کر جب آگے پہنچے تو دیکھا کہ دریا میں سے ایک بچھو باہر آیا، یہ بچھو اس کے اوپر سوار ہو گیا اور وہ کچھو دریا پار کرنے لگا۔ ان بزرگ نے دیکھا تو انہوں نے بھی سامنے والے کنارے پر جانے کے لیے ایک کشتی کرایہ پر لی، اس میں بیٹھے اور سامنے والے کنارہ پر پہنچے، تو وہ بچھو بھی اس بچھو کو لے کر سامنے والے کنارہ پر پہنچ چکا تھا، وہاں وہ بچھو اتر اور آگے بڑھنے لگا۔ یہ بزرگ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے، ایک جگہ جا کر دیکھا کہ ایک نوجوان شراب پی کر بے ہوش پڑا ہے اور اس کے پاس شراب کا گلاس پڑا ہوا ہے، اور ایک بڑا اثر دہا اپنا پھن پھیلائے ہوئے اس کو کاٹنے کے لیے تیار ہے۔ اتنے میں یہ بچھو وہاں پہنچا اور ایک دم کو دریا اس اثر دہے کے پھن میں ایک ڈنک مارا جس کی وجہ سے وہ

اثر دہا گرا اور مر گیا۔ پھر وہ بچھو وہاں سے واپس روانہ ہو گیا، دریا کے کنارے پر پہنچا، اسی کچھوے پر سوار ہوا اور وہ اس کو لے کر روانہ ہوا۔ یہ سارا قصہ ان بزرگ نے دیکھا تو سوچنے لگے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی شان دیکھو کہ بظاہر تو یہ جانور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی جان لیتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اسی کے ذریعہ انسانوں کی جان کی حفاظت کا بھی کام لیتے ہیں۔ جب وہ نوجوان ہوش میں آیا تو ان بزرگ نے اس کو بتایا کہ تو تو شراب کے نشے میں مدہوش تھا، اور تیری حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسا ایسا انتظام کیا۔ یہ سن کر اس کو احساس ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے اسے توبہ کی توفیق دی۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کوئی بھی چیز دنیا میں بے کار نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی چیزیں دنیا میں بنائی ہیں وہ کسی نہ کسی مقصد اور منفعت کے لیے ہیں، اس میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور پوشیدہ ہے۔

پاخانہ کے کیڑے سے علاج!

ایک کتاب ”قلیوبی“ نامی ہمارے بچپن میں پڑھی تھی جس میں عجیب و غریب قصے لکھے ہوئے ہیں، ایک قصہ یاد آتا ہے۔ پاخانہ کا ایک کیڑا ہوتا ہے جو پیٹ کے اندر پیدا ہوتا ہے، جسے ہم لوگ کرم کہتے ہیں، پاخانہ کے ساتھ نکلتا ہے اور اسی میں چلا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ اس کو دیکھ کر ایک صاحب سوچنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کیوں پیدا کیا ہے، بے کار معلوم ہوتا ہے، اس کا کوئی مقصد تو سمجھ میں نہیں آتا، ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا۔ ایک مدت کے بعد اس کی آنکھ میں ایک بیماری ہو گئی، مختلف ڈاکٹروں اور حکیموں سے بہت علاج کرایا، بڑی رقمیں خرچ کیں، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ایک بہت پرانہ تجربہ کار طبیب تھا، کسی نے کہا کہ اس کا تجربہ بہت زیادہ ہے اس کے پاس جاؤ، وہ صاحب

اس کے پاس گئے، اس نے سارے حالات پوچھے، پھر کہا: پاخانہ کا جو کیڑا ہوتا ہے اس کو پیس کر آنکھ میں لگاؤ، کبھی کبھی یہ بیماری اس سے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ وہ آدمی سمجھ گیا کہ میری زبان سے جو جملہ نکلا تھا تو اللہ تعالیٰ نے میری عبرت اور سزا کے لیے مجھے اس بیماری میں مبتلا کیا ہے۔ اس لیے ہمیشہ کچھ بھی بولنے میں آدمی کو بہت ہی احتیاط کرنی چاہیے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”الْبَلَاءُ مُوَكَّلٌ بِالْمَنْطِقِ“ مصیبت بولنے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ بہت سی مصیبتوں کو ہم بول کر دعوت دیتے ہیں، کوئی بڑا بول آدمی بول دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو وہ پسند نہیں آتا، پھر اللہ تعالیٰ اس کے اسی بول پر اس کو آزمائش میں ڈال دیتے ہیں۔

یہ کس مرض کی دوا ہے؟

سید غوث علی پانی پتی رحمہ اللہ ایک بزرگ تھے ان کے حالات میں ”تذکرہ غوثیہ“ نامی ایک کتاب ہے، اس میں ان کے ملفوظات کے اندر ایک لطیفہ لکھا ہے کہ: ایک چھپکلی ایک دیوار پر لٹکی ہوئی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا تو باری تعالیٰ سے عرض کیا: یا اللہ! اس کو کیوں پیدا کیا؟ یہ کس مرض کی دوا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! یہ چھپکلی بھی کب سے مجھ سے یہی پوچھ رہی ہے کہ: اے اللہ! موسیٰ کو آپ نے کیوں پیدا کیا؟ یہ کس مرض کی دوا ہے؟ اگرچہ یہ تو ایک لطیفہ ہے، لیکن سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ جیسے: ہم بچوں کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں، تو وہ بچے بھی ہمارے متعلق بہت کچھ تبصرے کرتے ہیں جن کو کبھی کبھی سننے کی ضرورت ہے، اس سے آدمی کو پتہ چل جاتا ہے۔

کھانے کی نعمت، اور ہمارا طرز عمل

خیر! میں نے عرض کیا تھا کہ کھانا اللہ تعالیٰ کی نعمت اور عطیہ ہے، اس کا دیا ہوا

رزق ہے، اور اس میں بڑی مصلحتیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے جب اس کو پیدا کیا اس وقت اپنی توجہ اس کی طرف منعطف فرمائی، اس سے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ہمیں اگر وہ چیز پسند نہیں ہے اور اچھی نہیں لگتی ہے، تو نہ کھائیں، کوئی زبردستی تو نہیں ہے، لیکن اس کی برائی بیان کرنے میں اپنی زبان کو اور وقت کو لگانے کی آپ کو کس نے اجازت دی؟ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا معمول بتایا کہ آپ کو اگر وہ چیز پسند آتی تو کھا لیتے اور اگر پسند نہ آتی تو چھوڑ دیتے۔ اسلام نے یہی تعلیم دی ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں اللہ تعالیٰ کا رزق ہیں، اس کی قدر اور تعظیم کرنی چاہیے، ادب کرنا چاہیے۔

آج کل تو کھانے کی ایسی بے عزتی ہوتی ہے کہ اللہ کی پناہ! جو کھانا بچتا ہے اس کو لوگ کوڑے دان میں ڈال دیتے ہیں، خاص کر ہوٹلوں میں اور دعوتوں میں تو بڑی بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ کھانے کو ضائع و برباد کیا جاتا ہے، حالاں کہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ ایک ایک دانہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور بہت ہی قیمتی ہے۔

نعمت کی قدر دانی کا عجیب واقعہ

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ ایک واقعہ بیان کرتے تھے۔ ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ گزرے ہیں جو میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے، راندیر ہی میں ان کا مزار ہے۔ ہمارے مدارس میں سنن ابو داؤد پڑھائی جاتی ہے، عام طور پر اس کی سند میں میاں صاحب آتے ہیں۔ مفتی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: میں ایک مرتبہ ان کے یہاں گیا، کھانے کا وقت ہوا تو انہوں نے کہا کہ آپ بھی کھانے میں شریک ہو جائیے، ہم کھانے کے لیے بیٹھے، جب ہم کھانے سے فارغ

ہو چکے تو مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ میں دسترخوان لپیٹنے لگا تا کہ اندر جو کچھ ہے اس کو باہر پھینک آؤں۔ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کیا کر رہے ہو؟ میں نے کہا: حضرت! دسترخوان صاف کرنے کے لیے لپیٹ رہا ہوں۔ تو میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: دسترخوان صاف کرنا آتا ہے؟ میں نے کہا: حضرت! یہ بھی کوئی علم اور فن ہے جو سیکھنے کی ضرورت ہو؟ فرمایا: ہاں! اسے بھی سیکھنے کی ضرورت ہے۔ پھر کہا: لاؤ! مجھے دو۔ انہوں نے میرے پاس سے لے لیا، اس کو پھر سے کھولا، اور ہم لوگ کھاتے وقت ہڈیاں چوس کر اس پر ڈالتے ہیں، اسی طرح کچا گوشت نکال کر ڈال دیتے ہیں، تو میاں صاحب نے اس طرح کا گوشت الگ کیا، ہڈیاں الگ کیں، روٹی کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو الگ کیا، چھوٹے چھوٹے ذرات کو الگ کیا۔ اس طرح کل چار حصے بنائے، پھر فرمانے لگے: دیکھو! یہ جو کچا گوشت ہے اس کو میں فلاں جگہ پر رکھوں گا، وہاں بلی آتی ہے اور اس کو معلوم ہے کہ میری غذا وہاں رکھی ہوئی ہوتی ہے، وہ آکر اس کو کھالے گی۔ اور یہ جو ہڈیاں ہیں، اس کو فلاں جگہ رکھوں گا، وہاں کتے آتے ہیں اور ان کو معلوم ہے کہ یہاں ہماری غذا رکھی جاتی ہے، وہ آکر کھالیں گے۔ اور روٹی کے یہ بڑے ٹکڑوں کو اوپر کی دیوار پر رکھ دوں گا، کوئے اور چیلیں آکر لے لیں گے۔ اور یہ چھوٹے چھوٹے ذرات کو گھر میں جہاں چوٹیوں کے بل ہیں ان کے پاس رکھ دوں گا تو وہ کھالیں گی؛ اس لیے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا رزق ہے، اس کی نعمت ہے، ہم اس کو نہیں کھاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی دوسری مخلوق کے لیے رزق بنایا ہے، تو ہم اس کو کیوں ضائع کریں!

جنوں کی خوراک کا نظام

اسی لیے آپ کو معلوم ہوگا کہ استنجاء کے آداب جہاں بیان کیے جاتے ہیں

وہاں حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہڈی سے استنجاء کرنے سے منع کیا۔ کیوں؟ حدیث میں اس کی وجہ بھی بتلائی ہے کہ ذبح کیے ہوئے جانوروں کی ہڈیاں جو ہم کھانے کے بعد چوس کر صاف کر کے ڈال دیتے ہیں وہ جنوں کی خوراک ہے۔ اگر کوئی جن اللہ کا نام لے کر اس کو اٹھاتا ہے تو اس پر ایسا ہی گوشت چڑھا دیا جاتا ہے جیسے اس پر اصل میں تھا۔ جنوں کی خوراک کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ ایک نظام ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے ہڈیوں سے استنجاء کرنے سے منع فرمایا کہ جو آدمی اس سے استنجاء کرے گا تو گویا کہ اس کو بے کار اور ضائع کر رہا ہے، جو چیز جنوں کی خوراک کے کام آسکتی تھی، اب ان کے کام میں نہیں آئے گی۔ اسی طرح کونکے سے استنجاء کرنے سے بھی منع کیا ہے، کیوں کہ کونکے جنوں کے جانوروں کی خوراک ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے بڑی تاکید فرمائی ہے کہ کوئی نعمت ضائع نہ ہونے پائے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بڑی قدر ہونی چاہیے۔

ایک گھونٹ پانی کی قدر

حضرت شیخ رحمہ اللہ کے یہاں دیکھا کہ کوئی آدمی پانی پیتا اور بچا ہوا پھینک دیتا تو حضرت بہت سخت ناراض ہوتے کہ بھائی! پانی کیوں پھینک دیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ پانی ہمیں اتنی آسانی سے وافر مقدار میں بغیر زحمت کے مل جاتا ہے اس لیے ہمیں اس کی قدر نہیں ہے۔ میں نے پہلے بتایا تھا کہ چند سال پہلے جب گنڈ لا (۱) میں سمندری طوفان آیا تھا تو وہاں رفاہی کام کے لیے ہمارے یہاں سے یوسف علی بھائی گئے تھے، انہوں نے بتلایا کہ جب ہم پہلی مرتبہ وہاں پہنچے تو ہمارے پاس پینے کے پانی کی بوتلیں تھیں

(۱) گجرات کے ساحل سمندر پر ایک جگہ کا نام ہے۔

جسے دیکھ کر میسوں آدمی جمع ہو گئے اور کہنے لگے کہ: اس میں سے ایک ایک گھونٹ ہمیں دو۔ جن کو پانی میسر نہیں ہوتا ان سے پوچھو کہ اس ایک گھونٹ کی کتنی قدر ہے!

عبرت انگیز واقعہ

اور اس ایک گھونٹ پر بلکہ ایک قطرہ پر اللہ تعالیٰ کے یہاں کیسا کیسا معاملہ کیا جاتا ہے! ایک عجیب و غریب قصہ یاد آ گیا تو سنا دیتا ہوں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں یہ قصہ لکھا ہوا ہے کہ ایک آدمی کا انتقال ہو گیا، کسی نے اس کو خواب میں دیکھا کہ عذاب میں مبتلا ہے، اس نے پوچھا: تیرے ساتھ یہ معاملہ کیوں؟ اس نے کہا: میرے گناہوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوں۔ اس نے پوچھا: تیرے پیچھے کوئی دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کرنے والا نہیں؟ اس نے کہا: میری ایک لڑکی ہے، تم اس کو جا کر کہو کہ وہ میرے لیے کچھ ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کا اہتمام کرے اور یہاں بھیجے۔ وہ صبح اُٹھا اور معلوم کیا کہ فلاں کا مکان کہاں ہے، وہاں پہنچا تو دیکھا کہ مکان پر تالا پڑا ہوا ہے۔ لوگوں سے پوچھا: اس کی ایک لڑکی تھی وہ کہاں ہے؟ لوگوں نے بتلایا: وہ تو بڑی بداخلاق نکلی، کوٹھے پر بیٹھ گئی اور بدکاری میں مبتلا ہو گئی، اس وقت کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ پوچھا: مجھے اس سے ایک کام ہے، کہاں ملے گی؟ کسی نے بتلایا کہ: وہ اپنے کسی آشنا اور دوست کے ساتھ دریائے جمن پر نہانے کے واسطے گئی ہے۔ یہ آدمی وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ اپنے دوست کے ساتھ پانی سے کھیل رہی ہے۔ اب یہ سوچنے لگا کہ میں اس کو بتلاؤں بھی یا نہیں، لیکن پھر سوچا کہ ایک مرے ہوئے آدمی نے اپنی بیٹی کے نام ایک پیغام دیا ہے: تو میں پہنچا ہی دوں۔ چنانچہ اس نے وہیں کنارے پر کھڑے کھڑے اس کو مخاطب کر کے کہا کہ: میں نے خواب میں

تیرے باپ کو دیکھا کہ وہ عذاب میں مبتلا ہے اور اس نے میرے ذریعہ تجھ تک یہ پیغام کہلوایا ہے کہ تو اس کے لیے کچھ ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کا اہتمام کر۔ اب وہ تو اپنی مستی میں تھی، اور چلو میں پانی لے کر اپنے آشنا کے اوپر ڈال رہی تھی، اس میں سے ایک چلو اس کے اوپر ڈال کر کہنے لگی: لو! یہ میرے ابا کے ایصالِ ثواب کے لیے ہے۔ یہ بیچارہ تو بہت شرمندہ ہوا اور واپس چلا آیا کہ اب اس کو کیا کہا جائے۔ دوسری رات کو خواب میں دیکھا تو اس کا باپ اچھی حالت میں تھا۔ اس نے کہا: میں تو تیرے پیغام کو پہنچانے کے لیے تیری بیٹی کے پاس گیا تھا، لیکن اس کا ایسا ایسا معاملہ ہے اور اس نے تو مجھے اس طرح سے جواب دیا اور میرے ساتھ بھی ایسا سلوک کیا۔ اس پر اس نے کہا: اس کا عمل اس کے ساتھ؛ لیکن وہ چلو بھر کر اس نے جو پانی تیرے اوپر یہ کہہ کر ڈالا تھا کہ یہ ابا کے ایصالِ ثواب کے لیے ہے، اس پانی کا ایک قطرہ ایک جانور کے منہ میں گرا جو ندی کے کنارہ پر دروازے سے پیسا پڑا ہوا تھا، اور اندر جا کر پانی پی سکنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا، اُس ایک قطرے سے اس جانور کی پیاس بجھ گئی، اس کا ثواب مجھے ملا اور اسی پر اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت کر دی۔

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ پانی کا ایک قطرہ کتنا قیمتی ہے کہ ایک آدمی کو عذاب سے بچا سکتا ہے؛ تو پھر ایک گھونٹ کتنا قیمتی ہوگا! لیکن ہم اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو یونہی ضائع کر دیتے ہیں۔ پرانے زمانہ میں ہمارے دیہاتوں میں دیکھا کہ کھانا اگر بچتا تھا تو وہ لوگ اس کو پھینکنے کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ مختلف قسم کے غریب غرباء، بھنگی چمار، مزدور قسم کے لوگ ہر آبادی کے اندر رہتے ہی ہیں؛ ان کو دے دیا جائے۔ آج کل اس کی بالکل پرواہ نہیں کی جاتی، اور بچا ہوا کھانا ایسے ہی پھینک دیتے ہیں۔ لہذا اس بات کا ضرور اہتمام ہو کہ کھانا اللہ تعالیٰ کی قیمتی نعمت ہے جو ضائع نہیں ہونی چاہیے۔

اکابر کی کڑھن

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بیماری کے زمانہ میں ایک آدمی دودھ لایا، حضرت نے نوش فرما کر ایک دو گھونٹ بچ گئے تھے اس کو وہیں رکھ دیا اور حضرت کی آنکھ لگ گئی، جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ دودھ وہاں نہیں ہے۔ ایک صاحب کھڑے تھے ان سے پوچھا کہ یہاں دودھ رکھا تھا؟ کہاں گیا؟ انہوں نے کہا: میں نے پھینک دیا۔ اس پر حضرت بہت ناراض ہوئے کہ اللہ کے بندے! وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت تھی، تو نے اس کو پھینک کیوں دیا؟ تو ہی پی جاتا، ورنہ کسی جانور کو پلا دیتا تب بھی کارآمد تو ہوتا۔ ایسے ہی پھینکنا کیا معنی رکھتا ہے!

ہمارے بزرگوں کے یہاں اس بات کا بڑا اہتمام رہتا تھا کہ کوئی چیز بھی ضائع ہونے نہ پائے، اگر ایک ذرہ بھی ضائع ہو جاتا تو اس پر بہت کڑھتے۔ کبھی کسی پھل کا مزہ تھوڑا سا بدل جاتا ہے، یا ایک طرف سے تھوڑا سا زیادہ پک جانے کی وجہ سے بہت سی طبعیتیں اس کو کھانا پسند نہیں کرتیں، تو حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھا کہ اگر کوئی پھل اس طرح کا ہو جاتا تھا تو حضرت ایک مخصوص انداز سے فرماتے تھے کہ: کون اس کو وصول کرے گا؟ یہ سن کر جن کی طبعیتیں اس کو پسند نہیں کرتی تھیں وہ بھی مانگ لیا کرتے تھے، اور جب کوئی اس کو کھالیتا تو حضرت کو اس پر بڑی خوشی ہوتی تھی کہ یہ چیز ضائع ہونے سے بچ گئی۔

اور واقعہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، اس لیے ضائع نہیں ہونی چاہیے، اگر اس کی ناقدری ہو جاتی ہے تو بہت سی مرتبہ آدمی اللہ تعالیٰ کی دوسری بہت ساری نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔

پسند و ناپسند کے معاملہ میں معتدل تعلیم

یہاں حضور اکرم ﷺ کا کھانے کے معاملہ کا ایک ادب بتلایا: ”مَاعَابَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ طَعَامًا قَطُّ“ حضور اکرم ﷺ نے کبھی کسی کھانے پر عیب نہیں لگایا ”إِنْ اشْتَهَاهُ أَكَلَهُ، وَإِنْ كَرِهَهُ تَرَكَهُ“ اگر طبیعت میں رغبت ہوتی تو آپ تناول فرما لیتے، اور اگر رغبت نہیں ہوتی تو نہیں کھاتے تھے۔ اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر چیز ہماری طبیعت کو پسند ہی ہو، بعض کھانے ایسے بھی ہوتے تھے جو حضور ﷺ کی طبیعت کو بھی پسند نہیں تھے لیکن حضور ﷺ کبھی اس کی برائی نہیں فرماتے تھے، اس پر عیب نہیں لگاتے تھے۔

طبیعت کا کسی چیز کی طرف میلان اور اس کو پسند کرنا، نہ کرنا؛ ایک غیر اختیاری چیز ہے، یہ طبیعت کا ایک تقاضہ ہوتا ہے، کبھی طبیعت کسی چیز کو پسند کرتی ہے اور کبھی کسی چیز کو ناپسند کرتی ہے۔ تو اگر آپ کی طبیعت کو یہ کھانا ناپسند ہے تو یہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہے، اور یہ کوئی ضروری بھی نہیں کہ ہر چیز کو آپ پسند ہی کیجئے، لیکن یہ ہے کہ اگر آپ کی طبیعت کو پسند نہیں ہے تو آپ اس کی برائی نہ کریں، اس پر عیب نہ لگائیں، اس کی خوردہ گیری نہ کریں۔ اگر عیب لگائیں گے تو یہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی ناقدری ہوگی، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

سرکہ بہت اچھا سالن ہے

۷۳۷:- وعن جابر رضي الله عنه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَأَلَ أَهْلَهُ الْأُدْمَ، فَقَالُوا: مَا عِنْدَنَا إِلَّا خُلٌّ، فَدَعَاهُ، فَجَعَلَ يَأْكُلُ، وَيَقُولُ: نِعْمَ الْأُدْمُ الْخُلُّ، نِعْمَ الْأُدْمُ الْخُلُّ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ اپنے گھر والوں سے سالن مانگا (کہ روٹی کے ساتھ کھانے کے لیے کوئی سالن ہے؟) گھر والوں نے کہا: ہمارے پاس تو صرف سرکہ ہے۔ آپ ﷺ نے کہا: لاؤ۔ پھر نبی کریم ﷺ سرکہ میں روٹی ڈوبا ڈوبا کر کھانے لگے اور فرمانے لگے: سرکہ بہت اچھا سالن ہے، سرکہ بہت اچھا سالن ہے۔

سال بھر کا اناج بھر لینا توکل کے خلاف نہیں

افادات:- حالاں کہ حدیث پاک میں موجود ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا معمول یہ تھا کہ تمام ازواجِ مطہرات کے لیے سال بھر کا غلہ بھر دیا کرتے تھے۔ اس سے علماء نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جو لوگ سال بھر کا اناج خرید کر رکھ لیتے ہیں؛ یہ توکل اور تقویٰ کے خلاف نہیں ہے، خود نبی کریم ﷺ ازواجِ مطہرات کو سال بھر کا دے دیا کرتے تھے، لیکن ازواج بھی تو آپ ہی کی تھیں جو کثرت سے صدقہ و خیرات کرنے والی تھیں، اس لیے ان کو سال بھر کا جو دیا جاتا تھا وہ اپنی خوشی سے اللہ کے راستہ میں خرچ کر دیتی تھیں۔ اسی لیے حدیث پاک میں آتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ تین تین چاند ہم ایسے دیکھتے تھے کہ حضور اکرم ﷺ کے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، چولہا نہیں جلتا تھا۔ پوچھا گیا: پھر کیا کرتے تھے؟ فرمایا: کھجور کھا کر اس پر پانی پی لیتے تھے؛ یہی ہماری غذا ہوا کرتی تھی۔

کھانے کی اور بنانے والے کی تعریف

خیر! یہ روایت لا کر باب کا جو عنوان قائم کیا تھا اس کے دوسرے جزو **”اِسْتِحْبَابُ مَدَحِهِ“** کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ دیکھو! آپ ﷺ سرکہ کی تعریف فرما رہے ہیں، حالاں کہ ہم لوگ تو سرکہ کو کبھی سالن کے طور پر استعمال بھی نہیں کرتے، کبھی

زبان کے چٹانے کے لیے کھچڑا، حلیم وغیرہ میں ڈال لیتے ہیں، ورنہ اگر سالن کی جگہ پیش کر دیا جائے کہ آج تو سالن میں سرکہ ہی ہے، روٹی اور سرکہ کھا لو؛ تو کون ہے جو اس پیشکش کو بہ رضا و رغبت قبول کر لے؟ طبیعت پر بڑا گراں گزرے گا کہ اچھا! سالن کی جگہ پر سرکہ کھائیں؟ اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے، لیکن نبی کریم ﷺ سرکہ کھا رہے ہیں اور تعریف فرما رہے ہیں کہ: بڑا اچھا سالن ہے، بڑا اچھا سالن ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کھانے کی تعریف کرنی چاہیے، اس لیے کہ یہ بھی نعمت کا شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ ہے، جیسے: کوئی آدمی کوئی چیز لا کر پیش کرے، اور آپ کہیں کہ ماشاء اللہ! بڑی عمدہ چیز ہے، آپ نے تو بڑے موقع سے یہ چیز پیش کی۔ بس! آپ کے ان دو جملوں سے اس کا جی خوش ہو جائے گا، اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کے شکر کا حق ادا ہو جائے گا۔

پھر یہ ہے کہ اگر وہ سالن ہے تو جس نے وہ سالن بنایا ہے اس کی محنت کا بھی تو حق ہے کہ اس کا شکریہ ادا کیا جائے۔ اس نے اس سالن کو بنانے کے واسطے دھواں برداشت کیا، آگ کی گرمی برداشت کی، اپنا وقت لگایا، تکلیف و زحمت اٹھائی، اور آپ اتنے بخیل بن رہے ہیں کہ آپ کی زبان سے اس کی تعریف کے دو بول بھی نہیں نکل رہے ہیں؟ یہ کیسی بات ہوئی! ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس کا حق ہے کہ آپ کہیں کہ ماشاء اللہ! بہت اچھا کھانا بنایا ہے۔

حضرت ڈاکٹر عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کے خلیفہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے لکھا ہے کہ حضرت ایک قصہ بیان کیا

کرتے تھے: ایک مرتبہ ایک آدمی نے ان کی دعوت کی، وہ حضرت سے بیعت تھے، اور ان کی گھر والی بھی حضرت سے بیعت تھی، حضرت وہاں کھانے کے لئے تشریف لے گئے۔ اور حضرت کی عادت تھی کہ کھانے کے بعد گھر والوں کا شکریہ ادا کیا کرتے تھے کہ آپ نے کھانا پکایا، ماشاء اللہ بڑا لذیذ اور اچھا عمدہ پکا تھا۔ اللہ والے دوسروں کا جی خوش کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

معتز کا حال مکھی جیسا

اس پر بھی بعض لوگوں کو اعتراض ہوتا ہے۔ اگر کسی نے ایسا کہہ دیا تو بعض لوگ اس کو غلط جامہ پہناتے ہیں، حالاں کہ وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے یہ دو جملے بولنے میں کیا حکمت ہے، اللہ والے دراصل گھر والوں کی دلجوئی کرنا چاہتے ہیں، اور یہ نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔ لیکن جن کا مزاج ہی ٹیڑھا ہو اور جس کی طبیعت ہی میں کجی ہو، ان کا حال مکھی جیسا ہوتا ہے: مکھی جب کسی باغ میں جائے گی تو پورے باغ میں پھل اور پھول ہیں، لیکن کسی کونہ میں پاخانہ پڑا ہوگا تو وہ سب چھوڑ کر وہیں جائے گی اور اسی پر بیٹھے گی، پورے باغ میں پھل ہوتے ہیں وہ اس کو نظر ہی نہیں آتے، پاخانہ ہی نظر آتا ہے۔ تو جن لوگوں کا مزاج تنقیدی اور عیب جوئی والا ہوتا ہے، وہ اسی طرح کی باتیں کیا کرتے ہیں۔

خیر! حضرت ڈاکٹر عارفی رحمہ اللہ جب کھانے سے فارغ ہو کر جانے لگے تو چوں کہ گھر والی بھی بیعت تھی اس لئے پردہ کے پیچھے سے اس نے بھی سلام کیا، حضرت نے سلام کا جواب دینے کے بعد شکریہ کے کلمات کہے کہ: آپ نے کھانا ماشاء اللہ بڑا عمدہ پکایا تھا، ہمیں بہت پسند آیا۔ ایسا کہنا بھی چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا ہو،

اور ان کا حوصلہ بڑھے، دلجوئی بھی ہو جائے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب کے اس کہنے پر پردے کے پیچھے سے رونے کی اور سسکیوں کی آواز آنے لگی۔ حضرت ڈاکٹر صاحب بھی سہم گئے کہ پتہ نہیں، کیا بات ہوئی! کیا میری طرف سے کوئی ایسی چیز پیش آئی کہ وہ خاتون رونے لگ گئی۔ حضرت نے پوچھا: کیا میری طرف سے کوئی تکلیف پیش آئی؛ تو میں معافی چاہتا ہوں۔ تو اس خاتون نے رونے کو ضبط کرتے ہوئے کہا: نہیں حضرت! ایسا کچھ بھی نہیں ہے، بلکہ یہ جو آپ کے ساتھ میرے شوہر کھڑے ہیں نا، چالیس سال سے کھانا پکا کر ان کو کھلا رہی ہوں، آج تک ایک دن بھی انہوں نے ایسا کوئی جملہ نہیں کہا ہے کہ تم نے کھانا بہت اچھا پکایا، آج آپ کی دعوت تو ہم نے پہلی مرتبہ کی اور آپ یہ کہہ رہے ہیں؛ اس لئے میرا جی بھرا آیا۔

اس کا احسان اور ہمارا بخل!

آپ اور ہم اس مجلس میں جتنے بھی بیٹھے ہوئے وہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لیں کہ یہ واقعہ ہے یا نہیں؟ ہم کبھی ایسا کرتے ہیں؟ حالاں کہ وہ بیچاری ہماری جو خدمتیں کرتی ہے، اس کا مسئلہ بھی میں آپ کو بتا دوں (یہاں سے آواز گھروں تک بھی جا رہی ہے، خواتین بھی سن رہی ہیں) مسئلہ کے اعتبار سے بیوی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ آپ کے لیے کھانا پکائے، بلکہ وہ آپ سے یہ مطالبہ کر سکتی ہیں کہ ہمیں پکا پکایا کھلاؤ، لیکن جب وہ پکا کر ہمیں دے رہی ہے تو وہ ہم پر بڑا احسان کر رہی ہے۔ جب وہ اتنا بڑا احسان کر رہی ہے تو ہم اتنے کیوں بخیل بن رہے ہیں کہ ہماری زبان سے اس کی تعریف کا ایک جملہ بھی نہیں نکلتا؟ ہم صرف اتنا ہی کہہ دیں کہ آج کھانا بہت اچھا اور عمدہ پکایا ہے۔

بیوی کے مزاج سے واقفیت رکھنا سنت طریقہ ہے

واقعہ یہ ہے کہ جس کے دل پر گزرتی ہے وہی اس چیز کو محسوس کر سکتا ہے۔ ایک عورت جو آپ کے ساتھ پوری زندگی گزار رہی ہے؛ اس کے مزاج سے واقفیت رکھو۔ ویسے شوہر کے لیے ضروری ہے کہ اپنی بیوی کی دلجوئی کرتا رہے اور اس کے مزاج کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرتا رہے۔ پہلے بھی ایک حدیث گزری ہے اس کو تازہ کر دیتا ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اے عائشہ! جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو تو وہ بھی میں جان لیتا ہوں، اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو تو وہ بھی میں جان لیتا ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ یہ کیسے جان لیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو اور دورانِ گفتگو کسی بات پر قسم کھانے کی نوبت آتی ہے تو تم یوں کہا کرتی ہو: ”لَا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ“ محمد ﷺ کے رب کی قسم۔ اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو، اور دورانِ گفتگو کسی بات پر قسم کھانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو تم یوں کہا کرتی ہو: ”لَا وَرَبِّ إِبْرَاهِيمَ“ اس وقت میرا نام نہیں لیتی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! صرف آپ کا نام ہی زبان سے نہیں لیتی، ورنہ میرے دل میں تو آپ کی محبت بھری ہوئی ہے۔

عرض یہ کرنا ہے کہ دیکھئے! نبی کریم ﷺ نے ان کے مزاج کا کیسا مطالعہ کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مزاج کب کیسا ہوتا ہے؛ وہ بھی آپ ﷺ کو پتہ چلتا تھا۔

ہم اگر واقف نہیں تو بیوی کے مزاج سے!

ہماری تو ساری زندگیاں بیوی کے ساتھ گزر جاتی ہیں لیکن ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ بیوی کا مزاج کیا ہے! کبھی ہم نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا! کبھی اس کا

مطالعہ کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی! آپ فیکٹری اور دکان کے ایک ایک نوکر کے مزاج سے واقف ہیں، اپنی آفس کے ہر ملازم کے مزاج سے واقف ہیں کہ کس سے کب کس طرح کام لینا ہے، اگر واقف نہیں تو بیوی ہی کے مزاج سے واقف نہیں۔ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ وہ بیچاری اتنی خدمتیں کرتی ہے کہ آپ کے کپڑے دھوتی ہے، کھانا پکا کر دیتی ہے، بستر تیار کرتی ہے، لہذا اگر نیند نہ آئی ہو تب بھی کہہ دو کہ ماشاء اللہ! کیسا عمدہ بستر تیار کیا تھا کہ لیٹتے ہی آنکھ لگ جانے والی تھی، اس سے اس کا جی خوش ہو جائے گا۔ اور ایک مسئلہ آپ کو بتا دیتا ہوں کہ جن مواقع پر شریعت نے تو یہ (یعنی خلاف واقعہ بات) کی اجازت دی ہے، اس میں بیوی کو خوش کرنے والی بات بھی ہے۔

تو کھانے کی تعریف بھی ہونی چاہیے، یہ حرص و لالچ کی علامت نہیں ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ کی سنت اور آپ کا طریقہ ہے۔

بَاب مَا يَقُولُهُ مَنْ حَضَرَ الطَّعَامَ
وَهُوَ صَائِمٌ إِذَا لَمْ يَفْطُرْ
و

بَاب مَا يَقُولُهُ مَنْ دُعِيَ إِلَى طَعَامٍ
فَتَبِعَهُ غَيْرُهُ

کسی کو کھانے کی دعوت دی گئی، اور کوئی دوسرا بھی

اس کے ساتھ ہو گیا، تو وہ کیا کہے؟

دعوت میں حاضر ہونے والا اگر روزہ دار ہے

تو کیا کہے؟

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

دعوت قبول کرنا سنت ہے

۷۳۸:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: إِذَا دُعِيَ أَحَدُكُمْ فَلْيَجِبْ، فَإِنْ كَانَ صَائِمًا فَلْيُصَلِّ، وَإِنْ كَانَ مُفْطِرًا فَلْيُطْعَمْ.

قَالَ الْعُلَمَاءُ: مَعْنَى ((فَلْيُصَلِّ)) : فَلْيُتَدَّعُ، وَمَعْنَى ((فَلْيُطْعَمْ)) : فَلْيَأْكُلْ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جب تم میں سے کسی کو کھانے کے لیے دعوت دی جائے تو قبول کرنی چاہیے (روزہ ہو تب بھی دعوت قبول کرو اور اس کے مکان پر تشریف بھی لے جاؤ) اگر آپ روزہ دار ہیں تو اس کے گھر جا کر (چاہے کھانا مت کھانا، لیکن) اس کے لیے دعا کر دیجئے۔ اور اگر روزہ نہیں، تو کھانا بھی کھا لیجئے۔

افادات:- اگر میزبان کا کھانے کے لیے اصرار ہو، اور مہمان کے نہ

کھانے سے میزبان کی دل شکنی کا اندیشہ ہو، تو میزبان کی دلجوئی کے واسطے اس مہمان کے لیے نفل روزہ توڑنے کی اجازت ہے، پھر بعد میں اس کی قضا کر لے۔ یہ بات صرف نفل روزہ کی ہے، فرض یا قضا روزہ رکھا ہو تو نہیں توڑنا چاہیے۔ ویسے اس کے مکان پر جا کر کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں، اور دعا کر دے۔

ایک مؤمن کے دوسرے مؤمن پر جو حقوق ہیں ان میں سے ایک یہ حق بھی ہے کہ اگر کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے تو دعوت قبول کرنی چاہیے۔ دعوت کے قبول کرنے کے لیے کچھ شرائط بھی ہیں (اس موضوع کی تفصیل [جلد: ۴/ص: ۲۵۷ تا ۲۶۵] پر دیکھیے۔ مرتب) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مہمان اگر دعوت دینے پر اکتفاء کرتا ہے تو میزبان کو اس پر بھی راضی ہو جانا چاہیے، بلا وجہ کھانے پر اصرار نہ کرے، خاص کر کھانے کی وجہ

سے مہمان کو تکلیف ہوتی ہو تو پھر کیوں اصرار کیا جائے۔ مقصد تو مہمان کو خوش کرنا اور دعا لینا ہے، اور جب دعا مفت میں مل رہی ہے تو پھر آپ کیوں فیس دینا چاہتے ہیں؟

طفیلی کے احکام

۴۹:- عن أبي مسعود البدری رضي الله عنه قال: دعا رجل النبي ﷺ ليطعاه صنعته له خامس خمسة، فتبعه رجل، فلما بلغ الباب، قال النبي ﷺ: إِنَّ هَذَا تَبِعَنَا، فَإِنْ شِئْتَ أَنْ تَأْذَنَ لَهُ، وَإِنْ شِئْتَ رَجَعَ. قَالَ: بَلْ أَذْنُ لَهُ يَا رَسُولَ اللَّهِ. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ پانچ آدمیوں کی دعوت کی (گویا اس نے یوں کہا: اے اللہ کے رسول! آپ کے ساتھ مزید چار آدمیوں کی یعنی کل پانچ کی میں دعوت کرتا ہوں، ان چار کی آپ ہی تعیین فرما لیجئے) جب آپ ﷺ تشریف لے جا رہے تھے تو مزید ایک آدمی ساتھ ہو گیا (کل چھ ہو گئے) جب میزبان کے دروازہ پر پہنچے تو نبی کریم ﷺ نے میزبان سے کہا: یہ ایک زائد آدمی ہمارے ساتھ آ گیا ہے، اب اگر تم اس کو اجازت دو تو آئے گا، ورنہ چلا جائے گا۔ میزبان نے کہا:

اے اللہ کے رسول! میں اس کو اجازت دیتا ہوں (بے تکلفی کی بات تھی تو وہ بھی شریک ہو گیا)

افادات:- ویسے بلا اجازت چپکے سے کسی کی دعوت میں شریک ہو جانا،

جیسے: بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ شادیوں کے کھانوں میں چپکے سے پہنچ جاتے ہیں اور دعوت وصول کر کے آ جاتے ہیں؛ یہ جائز نہیں ہے۔ پرانے زمانہ میں مستقل ایک طبقہ تھا جن کو طفیلی کہا جاتا تھا۔ علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ کا مستقل ایک رسالہ ہے، جس میں انہوں نے طفیلیوں کے اس قسم کے قصہ بیان کئے ہیں کہ وہ مختلف حیلے بہانوں سے

لوگوں کے یہاں دعوتوں میں پہنچ جاتے تھے، ایسوں کے لیے تو حدیث پاک میں وعید آئی ہے، حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسا آدمی جو بغیر دعوت کے کہیں چلا جائے اور کھا کر آجائے وہ چور بن کر گھستا ہے اور غاصب وڈا کو بن کر نکلتا ہے (ابوداؤد شریف: باب مَا جَاءَ فِي إِجَابَةِ الدَّعْوَةِ) اس لیے ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کیا جائے۔

جہاں وہ برا ہے؛ وہاں یہ بھی برا ہے

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اگر میزبان کی طرف سے اجازت دی جائے تب بھی کھانے سے انکار کیا جائے۔ جہاں وہ برا ہے وہاں یہ بھی برا ہے، جیسے: بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ اتفاق سے ان کو دعوت نہیں دی گئی تھی، اور وہ پہنچ گئے، اب صاحب خانہ بڑے شوق اور رغبت سے ان کو دیکھ کر خوش ہو کر کہتا ہے: آئیے، تشریف لائیے، لیکن یہ یوں سوچتا ہے کہ مجھے پہلے سے دعوت کیوں نہیں دی تھی، اس لیے میں نہیں کھاتا۔ اب ساری دنیا سمجھا رہی ہے کہ آجاؤ، بھائی! آجاؤ۔ صاحب خانہ بھی اس کا پیر پکڑ رہا ہے، تب بھی یہ جناب کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ بھی بہت برا ہے۔ شریعت اس کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ دعوت کے لیے ایسا کوئی اصول نہیں ہے کہ پہلے سے کہا جائے تو ہی دعوت؛ اور اگر وقت پر کہا جائے تو عداوت۔ ایسا کسی حدیث میں نہیں آیا ہے۔ جو لوگ ایسا مزاج رکھتے ہیں انہوں نے اگر کہیں کسی حدیث میں دیکھا ہو تو ہمیں بھی بتادیں تاکہ ہم دوسروں کو بتا سکیں۔

گم راہ طفیلی کا قصہ

ایک طفیلی کا قصہ ہے کہ چند شعراء کسی بادشاہ کی خدمت میں جا رہے تھے، ایک طفیلی نے دیکھا تو یوں سمجھا کہ دعوت ہوگی، اس لیے وہ بھی ساتھ ہو گیا، اس کو پتہ نہیں تھا

کہ یہ شاعر لوگ ہیں، اور بادشاہ کی شان میں قصیدہ کہنے کے لیے جا رہے ہیں، اب ان کے ساتھ اندر داخل تو ہو گیا، جب وہ سب دربار میں پہنچے تو بادشاہ کی طرف سے اجازت ملی اور تمام شاعروں نے اپنا اپنا قصیدہ پیش کیا اور انعام پایا۔ یہ اخیر میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ میں تو دعوتِ سمجھ کر آیا تھا، یہاں تو میں پھنس گیا؛ اب کیا کروں۔ جب اس کی باری آئی تو پوچھا گیا: آپ کون ہیں؟ اس نے کہا: ”وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ وَأَنْكَامِ الْغَاوِينَ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ“ میں ان گمراہوں میں سے ہوں جو شعراء کی اتباع کرتے ہوئے یہاں پہنچ گئے ہوں۔

دعاء

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ

کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی بِعَدَمَاتِحِبُّ وَتَرْضٰی

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگزر فرما۔ نبی کریم ﷺ نے زندگی کے جو آداب تعلیم و تلقین فرمائے ہیں، اے اللہ! ایک ایک ادب کو پورے عظمت و احترام کے ساتھ اختیار کرتے ہوئے اپنی زندگیوں میں اپنانے کی تو ہمیں توفیق و سعادت نصیب فرما۔ اے اللہ! تو ہم سے راضی ہو جا، اپنی مرضیات پر زیادہ سے زیادہ چلا کرنا مرضیات سے پوری پوری حفاظت فرما۔ نبی کریم ﷺ کی سنتوں اور طریقوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ نفس و شیطان کی شرارتوں سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ اے اللہ! جو مقروض ہیں ان کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما، جو پریشان حال ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما۔ جو حاجت مند ہیں ان کی حاجتوں کو پوری فرما۔

اے اللہ! تمام مصائب، آفات و بلاؤں سے تیری پوری مخلوق کی پوری حفاظت فرما۔
 اے اللہ! جس آندھی اور طوفان کے خطرے بتائے جاتے ہیں، اس سے تیری مخلوق کی
 پوری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! ان بلاؤں کو تو محض اپنے فضل سے ہٹالے۔ ہمارے
 گناہوں کو معاف فرما۔ ہماری جن بد اعمالیوں کی وجہ سے یہ بلائیں آسکتی ہیں، محض اپنے
 فضل سے ان بد اعمالیوں کو معاف فرما۔ اپنی شانِ کریمی سے معاف فرما۔ تمام شرکاءِ مجلس
 کی اور جنہوں نے بھی دعاؤں کی درخواستیں کی ہیں ان کی بھی جائز مرادوں کو پورا فرما۔
 نبی کریم ﷺ نے جتنی خیر و بھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہمیں اور پوری امت کو عطا فرما،
 اور حضور اکرم ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی، ان سے ہماری اور پوری
 امت کی حفاظت فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ لِي مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ اللَّهُ مَنَّاعُ الْعَلِيمِ وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ
 اللَّهُ وَابُّ الرَّحِيمِ. وَصَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ
 وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ. بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ

بَابُ الْأَكْلِ حَمَائِلُهُ
وَوَعْظُهُ وَتَأْدِيبُهُ مِنْ يَسِيءِ أَكْلِهِ
اپنے سامنے سے کھانا
اور خلافِ ادب کھانے والے کو نصیحت کرنا
اور ادب سکھانا

کھانے کے آداب کی نصیحت

۷۴۰:- عن عمر بن أبي سلمة رضي الله عنهما قال: كُنْتُ غَلامًا في حَجْرٍ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَكَانَتْ يَدِي تَطِيشُ فِي الصَّحْفَةِ، فَقَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: يَا غَلامُ، سَمِعَ اللَّهُ تَعَالَى، وَكُلْ بِمِيزَانِكَ، وَكُلْ مِنْ حَيْثُ أَيْلَيْكَ. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت عمر بن ابوسلمہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں چھوٹا بچہ تھا اور حضور اکرم ﷺ کی تربیت و نگرانی میں تھا، ایک مرتبہ کھانے کے دوران میرا ہاتھ پیالہ میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا تو نبی کریم ﷺ نے مجھے فرمایا: اے بچے! اللہ کا نام لے کر کھاؤ، اور دائیں ہاتھ سے کھاؤ، اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔ (یہ روایت پہلے بھی کئی مرتبہ آچکی ہے)۔

۷۴۱:- عن سلمة بن الأكوع رضي الله عنه أَنَّ رَجُلًا أَكَلَ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَقَالَ: كُلْ بِمِيزَانِكَ. قَالَ: لَا أَسْتَطِيعُ. قَالَ: لَا أَسْتَطِيعُ! مَا مَنَعَهُ إِلَّا الْكِبَرُ! فَمَارَ فَعَهَا إِلَى فِيهِ. (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھ کر بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے اس سے فرمایا: دائیں ہاتھ سے کھاؤ (تو حق بات کو قبول نہ کرتے ہوئے) اس نے جواب میں کہا: میں دائیں ہاتھ سے کھا نہیں سکتا (حالاں کہ ایسی بات نہیں تھی۔ وہ دائیں ہاتھ سے کھا سکتا تھا لیکن اس نے تکبر کی وجہ سے انکار کیا تھا اور بات نہیں مانی) تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے! اب نہیں کھا سکو گے (حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں) اس کے بعد کبھی وہ اپنا دایاں ہاتھ اٹھا ہی نہیں سکا (ہمیشہ کے لئے اس کا دایاں ہاتھ بیکار ہو گیا۔)

(نوٹ:- یہ روایت پہلے بھی کئی مرتبہ آچکی ہے۔ جلد: ۸ / روایت نمبر ۶۱۳ پر بھی گزری ہے۔ مرتب:-)

النَّهْيُ عَنِ الْقِرَانِ بَيْنَ تَمَرَتَيْنِ
وَنَحْوَهُمَا إِذَا أَكَلَ جَمَاعَةٌ
إِلَّا بِإِذْنِ رَفِيقَتِهِ

مجمع کے ساتھ کھاتے وقت کھجور وغیرہ دو، دو نہ لے

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

کھانے کے آداب میں ایک اور ادب بتلا رہے ہیں کہ جب کئی آدمی مل کر کھانا کھا رہے ہوں اور سب کے لیے مشترک طور پر کھانا رکھا گیا ہو، مثلاً: اگر کھائی جانے والی چیز کھجوریں ہیں؛ تو کھانے والے ان کھجوروں کو دودو دانے نہ اٹھائیں، بلکہ ایک ایک دانہ اٹھا کر استعمال کریں۔ مطلب یہ ہے کہ کھانے کے دوران کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کرنا چاہیے جس کی وجہ سے ساتھ میں کھانے والوں کی حق تلفی ہوتی ہو۔ یہ ایک بہت اہم تعلیم ہے جو نبی کریم ﷺ نے ہمیں دی ہے۔

ساتھ بیٹھ کر کھانے کے اہم آداب

۷۴۲:- عَنْ جَبَلَةَ بْنِ سُحَيْمٍ قَالَ: أَصَابَنَا عَامٌ سَنَةِ مَعَ ابْنِ الزُّبَيْرِ، فَرَزَقْنَا تَمْرًا، وَكَانَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا يُرْبِنَا وَنَحْنُ نَأْكُلُ، فَيَقُولُ: لَا تُقَارِنُوا، فَإِنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنِ الْقِرَانِ، ثُمَّ يَقُولُ: إِلَّا أَنْ يَسْتَأْذِنَ الرَّجُلُ أَخَاهُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت جبلہ بن سُحَیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت میں ایک مرتبہ قحط پڑا (قحط کے زمانہ میں ویسے بھی کھانے پینے کی چیزوں کی قلت ہو کر رہتی ہے) تو ہمیں حکومت کی طرف سے کچھ کھجوریں مل گئی اور ہم سب ساتھ بیٹھ کر کھا رہے تھے، جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہمارے پاس سے گزرے تو فرمایا: کھانے کے دوران دودو کھجوریں ایک ساتھ نہ اٹھاؤ، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے دو کھجوریں ساتھ اٹھانے سے منع کیا ہے، البتہ اگر آدمی اپنے بھائی سے اجازت سے لے لے (اور وہ بہ رضا و رغبت اجازت دیدے، تو دودو کھجوریں بھی ایک ساتھ اٹھا سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر انگور

کھارہے ہیں، تو دودانہ انگور کے ایک ساتھ نہ اُٹھائے جائیں۔)

افادات:- یہاں ایک خاص تعلیم دی گئی ہے کہ ہر وہ چیز جس میں سب کا حق ہو۔ جیسے کہ یہاں جو کھانا رکھا گیا تھا اس میں سب برابر کے شریک تھے، اور سب کا برابر کا حق تھا۔ تو اس چیز میں سے اپنا حق وصول کرتے ہوئے ہر آدمی کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ کسی دوسرے کی حق تلفی نہ ہو، کوئی بھی دوسرے سے زیادہ وصول نہ کر لے، یہ بہت ضروری تعلیم ہے۔ جب سب ساتھ مل کر کھا رہے ہوں تو ایک ساتھ دو کھجوریں اُٹھانے سے نبی کریم ﷺ نے جو منع فرمایا اس کی بنیاد یہی ہے۔

ہاں! اگر آپ اپنی ذاتی کھجوریں خرید کر لائے ہیں، تو پھر وہاں دو کیا، چار بھی ایک ساتھ اُٹھا کر کھا سکتے ہیں۔ لیکن اگر سب نے مل کر خریدی ہیں، یا کسی اور نے سب کے لیے رکھی ہیں، مثلاً: کسی کے یہاں دعوت ہے، اور وہاں سب کے سامنے کھانا رکھا گیا ہے، تو اس صورت میں جتنے بھی کھانے والے ہیں ان تمام کا اس کھانے میں برابر کا حق ہے، گویا سب شریک ہیں اور یہ چیز مشترک ہے، اب آپ کو اس میں سے اپنا حق وصول کرنا ہے، اور اس میں اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ اپنا حق وصول کرتے ہوئے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس کی وجہ سے دوسروں کے حق میں کمی آجائے اور حق تلفی ہو جائے۔ دو کھجوریں ایک ساتھ اُٹھانے سے جو منع فرمایا ہے اس کی وجہ یہی ہے۔

آپ کسی کے یہاں دعوت میں جائیں تو ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ داعی کی جانب سے ہر ایک کے سامنے الگ الگ پلیٹ رکھی گئی ہے، جیسے: آئس کریم ہر ایک کو الگ الگ پلیٹ میں دی گئی ہے، تو اس صورت میں چیچ میں آپ زیادہ لیں، یا کم لیں، اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے، کیوں کہ پلیٹ میں آپ کو جو حصہ دیا گیا ہے وہ آپ پورا کر رہے ہیں، کسی دوسرے کے حصہ میں آپ ہاتھ نہیں مار رہے ہیں۔ لیکن اگر

ایک ہی پلیٹ میں آئس کریم رکھی گئی ہے اور کہا گیا کہ سب اس میں سے کھاؤ، تو اس صورت میں آپ اپنے چچچ میں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ اٹھائیں، جس سے دوسروں کے حق میں کمی آتی ہو؛ اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ آپ اس انداز سے کھائیے کہ دوسرے کے حق کو ضائع کرنے والے نہ بنیں۔

یا جیسے آج کل عام طور پر دعوتوں میں ایک بڑے برتن میں سالن لا کر رکھ دیا جاتا ہے، دوسرے برتن میں چاول رکھ دیے جاتے ہیں، اور ہر ایک کے سامنے حنالی پلیٹ ہوتی ہے، تاکہ ہر ایک اپنے طور پر نکال کر کھائے، تو اس میں بھی یہ بات ملحوظ رہے کہ جو چیز آپ نکال رہے ہیں اس میں کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ سالن والا بڑا برتن ہاتھ میں آگیا تو ساری بوٹیاں پہلے ہی اپنی پلیٹ میں نکال لیتے ہیں اور بعد والے صرف شور بے پر قناعت کرتے ہیں؛ ایسا نہ کریں۔ آپ کو دیکھنا ہے کہ برتن میں یہی ایک سالن آیا ہے، اور اس میں اتنی بوٹیاں ہیں کہ اگر سب کو برابر تقسیم کی جائے تو میرے حصہ میں ایک یا دو بوٹیاں ہی آئیں، تو جب آپ پہلے نکال رہے ہیں تو اپنی پلیٹ میں ایک یا دو سے زیادہ بوٹیاں نہ نکالیں، تاکہ ہر ایک کو اس کے حصہ کے بقدر مل جائے۔ بعضوں کی جو عادت ہوتی ہے کہ پہلے برتن ہاتھ میں آ جانے کی صورت میں پورا اپنی پلیٹ میں ہی اتار لیتے ہیں، یہ بالکل غلط طریقہ ہے، اس میں دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اس صورت میں تو آپ زیادہ وصول کر کے گویا اپنے بھائی کا حق مار رہے ہیں، یہ گناہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے یہی نقل فرماتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ جب بھی کسی کے دسترخوان پر جائیں تو یہ چیز ہمیشہ ملحوظ رہنی چاہیے، اپنی پلیٹ میں زیادہ اتار لینا عار کی چیز سمجھی جاتی ہے، اور اس کو بدتہذیبی پر محمول کیا جاتا ہے۔

مہذب گیر تعلیم

ایک مؤمن کو اللہ تعالیٰ اور آپ ﷺ کی طرف سے جو بھی آداب تعلیم دیئے گئے ہیں وہ سب ایسے ہیں کہ جس سے آدمی مہذب اور باادب بنتا ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں یہی تعلیم ہے کہ آپ اپنا حق وصول کرنے میں ایسا کوئی طریقہ اختیار نہ کریں جس سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہو۔

مثلاً: ٹرین میں آپ کو سفر کرنا ہے، آپ نے سورت سے بمبئی کا ٹکٹ لیا، جب اسٹیشن پر پہنچے اور ٹرین میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ دوسرے پینجر بھی آئے نہیں ہیں، اب آپ نے سیٹیں خالی دیکھ کر اپنا بستر بچھا لیا اور ایک کے بجائے چار سیٹوں پر قبضہ کر کے لیٹ گئے، حالاں کہ آپ نے جو کرایہ ادا کیا ہے جس کی وجہ سے آپ کا حق تو صرف ایک سیٹ کا بنتا ہے، لیکن آپ دوسری تین سیٹوں پر جو قبضہ کر رہے ہیں، تو اس طرح ظاہر ہے کہ آپ بعد میں آنے والوں کی حق تلفی بھی کر رہے ہیں اور دوسروں کو تکلیف میں بھی ڈال رہے ہیں، پھر ہوتا یہ ہے کہ بعد میں آنے والے تو کھڑے ہیں اور آپ آرام سے لیٹے ہوئے ہیں، یہ بالکل گناہ کا کام ہے، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ ایک تو آپ نے اپنے حق سے زیادہ وصول کیا اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کی حق تلفی بھی کی، یعنی دوسرے لوگ اگر موجود نہ ہوتے تب بھی آپ ایک سے زیادہ سیٹ پر بیٹھ کر ایک سیٹ سے زیادہ وصول کرنے والے قرار دیئے جاتے۔

ترقی کا راز

کسی زمانہ میں پڑھا تھا کہ ایک صاحب یورپ کے کسی سفر پر گئے تھے، انہوں نے بتلایا کہ فرانس میں ٹرین میں سفر کر رہا تھا، دیکھا کہ ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے اور اس پر

خوب نیند طاری ہے، باقی سیٹیں خالی تھیں، پورا ڈبہ خالی تھا لیکن وہ بیٹھے بیٹھے اپنی نیند پوری کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا: باقی سیٹیں خالی ہیں، لیٹ جاؤ۔ تو اس نے کہا: میں نے کرایہ ایک ہی سیٹ کا دیا ہے، اس لیے مجھے ایک ہی سیٹ استعمال کرنے کا حق ہے، چاہے باقی سیٹیں خالی ہیں لیکن مجھے اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں۔ یورپ والوں کی ترقی کا راز یہی ہے، اس لیے کہ دنیا تو دارالاسباب ہے۔

اسی لیے ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے زندگی گزارنے کا جو طریقہ ہمیں تعلیم فرمایا ہے اس میں ایسی تعلیمات ہیں جس میں دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی، راحت اور فائدہ موجود ہے۔ معاشرت یعنی زندگی گزارنے اور آپس کے تعلقات کو نبھانے کا جو طریقہ بتلایا ہے اس میں اگر ہم شریعت کے احکام کا لحاظ کریں گے تو ہماری دنیوی زندگی بھی راحت و آرام، سکھ، چین و اطمینان والی بن جائے گی۔ اور اگر ہم شریعت کا لحاظ صرف عبادات، نماز، روزہ وغیرہ میں کریں، اور معاشرت، اخلاق و معاملات میں نہ کریں؛ تو دنیوی اعتبار سے پریشانیوں کا شکار ہوں گے۔ یورپ والے اگرچہ ایمان نہیں رکھتے جس کی وجہ سے آخرت کی نجات یعنی جہنم سے بچاؤ تو نصیب نہیں ہوگا، لیکن معاشرت کے اندر ان چیزوں کو وہ اپنائے ہوئے ہیں جن کی نبی کریم ﷺ نے ہمیں تعلیم دی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیوی اعتبار سے وہ راحت، چین و اطمینان سے ہیں۔

اسی طرح وہ لوگ معاملات کے اندر دیانت و امانت کا پورا پورا لحاظ کرتے ہیں کسی چیز میں کوئی عیب ہے، اور دیکھنے میں چاہے وہ چیز معمولی ہو لیکن وہ فوراً بتا دیتے ہیں کہ اس میں یہ نقص ہے۔ استعمال شدہ چیز کے بارے میں بتا دیتے ہیں کہ یہ چیز استعمال شدہ ہے۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ خریدنے والا چاہے کتنا ہی ماہر ہو لیکن اس کو

پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ چیز استعمال شدہ ہے مگر وہ بتا دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تجارت بھی برابر ترقی کر رہی ہے، کاروبار میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمارے یہاں یہ ہے کہ ہم اپنے کاروبار میں غبن اور دھوکہ بازی سے کام لیتے ہیں، تو اچھا خاصہ کاروبار چل رہا ہوتا ہے، لیکن تھوڑی سی دھوکے بازی کے نتیجہ میں سارا اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور ہمیشہ کے لیے آدمی نقصان اٹھاتا ہے۔

شرعی قانون پر عمل کا ایک کافر کو فائدہ

کسی رسالہ میں پڑھا تھا کہ جنوب کے کسی علاقہ میں ایک صاحب تھے، وہاں بارش نہیں ہوئی پھر بھی ان کی کھیتی باڑی کو نقصان نہیں ہوا، دوسروں کی کھیتوں کو روگ لگتے، لیکن اس کی کھیتی کو کبھی کوئی روگ بھی نہیں لگتا تھا، بارش کی کمی کی وجہ سے دوسروں کی پیداوار میں کمی آتی تھی لیکن اس کو کبھی کمی نہیں ہوتی تھی۔ کسی نے پوچھا: بھائی! کیا بات ہے؟ اس نے کہا: میں نے پڑھا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں یہ حکم ہے کہ اگر بارش کے پانی سے کھیتی ہو تو دسواں حصہ، اور اگر خود پانی پلایا ہو تو بیسواں حصہ نکال کر اس کا صدقہ کیا جائے، میں جب سے اس پر عمل کرتا ہوں تو آج تک کبھی میری کھیتی کو نقصان نہیں ہوا۔ تو شریعت کا قانون بہت قیمتی ہے، وہ بھلے ہی کافر تھا لیکن اس نے دنیا میں اس حکم پر عمل کیا تو دنیوی طور پر اس کا جو فائدہ ہے وہ اس کو حاصل ہوا، اگرچہ ایمان نہ ہونے کی وجہ سے آخرت کا فائدہ نہیں ملے گا۔

معاملہ کتنا سنگین ہے

خیر! میں یہ بتلا رہا تھا کہ مشترک چیزوں کے استعمال کے لیے شریعت نے ہمیں باقاعدہ یہ طریقہ بتایا ہے کہ ایسا کوئی طرز اختیار نہ کیا جائے جس میں کسی کا حق مارا

جائے، یا کسی کو تکلیف ہو۔ مثلاً: ہم ٹرین میں سفر کر رہے ہیں، اور دوسروں کی سیٹوں پر قبضہ کر کے سو گئے اور دوسرے لوگ کھڑے رہے تو مترآن پاک میں آیا ہے:

﴿وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ﴾ جو ساتھی تھوڑی دیر کے لیے ساتھ ہو گیا اس کا بھی حق ہے، لیکن اس طرح ہم نے اس کی حق تلفی کی۔ دو چار گھنٹے کے بعد وہ اور ہم جدا ہو گئے، پھر چند سالوں کے بعد کسی کے بتانے سے ہمیں احساس ہوا کہ ہم نے یہ جو کیا تھا وہ غلط تھا اور گناہ کا کام تھا، اب توبہ کی توفیق ہوئی تو جو لوگ موجود ہیں اور جن کو جانتے بھی ہیں ان سے تو معافی مانگ لیں گے، لیکن وہ ساتھی جو سفر میں ہنگامی طور پر ساتھ ہو گیا تھا جس کو تو ہم جانتے بھی نہیں ہیں، اور نہ اس کا کوئی ایڈریس ہے، ہم نے اس کی جو حق تلفی کی ہے اس کی تلافی کا کیا راستہ ہوگا! اب چاہے راتوں کو اللہ تعالیٰ کے سامنے ہم کتنا ہی روئیں، لیکن جب تک وہ معاف نہ کرے وہاں تک معاف ہونے والا نہیں ہے، اس لیے سوچو کہ معاملہ کتنا سنگین ہے!۔

معمولی سی غفلت سے حرام کا ارتکاب

اسی لیے جو چیزیں مشترک ہوا کرتی ہیں اس میں سے اپنے حق کی وصول یا بی کے لیے شریعت نے ہمیں باقاعدہ یہ طریقہ بتلایا ہے کہ ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ جس سے کسی کو تکلیف بھی نہ ہو، اور کسی کا حق بھی مارا نہ جائے۔ مثلاً: گھر میں یا دارالاقامہ (Boarding) میں چند لوگ ساتھ میں رہتے ہیں، تو سب کے غسل کے واسطے ایک ہی بالٹی ہوتی ہے، یا بیت الخلاء میں لوٹا ہوتا ہے، تو اس کو مشترک سمجھ کر استعمال کیا جائے، اور پھر استعمال کر کے اسی جگہ رکھا جائے جہاں اس کی جگہ متعین ہوتی ہے۔

آج کل ایک مزاج ایسا بن گیا ہے کہ ایسی چیزوں کو استعمال کے بعد جہاں جی

چاہا ڈال دیتے ہیں، جب دوسرے آدمی کو ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اس کی مقررہ جگہ پر تلاش کرتا ہے، اور جب اس کو وہ نہیں ملتی تو تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حرام ہے۔ ایک معمولی سی غفلت کی بنا پر ہم حرام کام کا ارتکاب کر لیتے ہیں، اور دوسروں کو تکلیف میں ڈال دیتے ہیں۔

اسی طرح بیت الخلاء مشترک استعمال کی چیز ہے، تو آپ اس کو استعمال کر کے اس کی صفائی کا جو طریقہ ہے وہ اپنائیے، اس میں پانی ڈالنے اور فلش کرنے کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ فراغت کے بعد نجاست کو ویسا ہی چھوڑ کر نکل آتے ہیں، اگر ہم کبھی جاتے ہیں اور ایسی صورت پیش آتی ہے تو ہماری طبیعت اس کا بڑا برا اثر لیتی ہے اور اس سے ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے، ہم سوچتے ہیں کہ کیسے نامعقول آدمی نے اس کو استعمال کیا ہے؟ پھر اگر ہم بھی ایسی ہی شکل اختیار کریں تو اس کا نتیجہ بھی تو یہی نکلے گا؛ حالاں کہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ تو جب آپ بیت الخلاء کو استعمال کر رہے ہیں تو فراغت کے بعد اس کی صفائی کا جو طریقہ ہے اس کو عمل میں لاتے ہوئے اس کو صاف کر کے نکلیے، ایسا نہیں کہ ویسا ہی چھوڑ کر نکل آئے۔ اسی طرح چھوڑ دینے کی شکل میں دوسروں کو جو تکلیف ہوگی اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔

اہل یورپ کے یہاں اصول کی پابندی

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں انگلینڈ میں ٹرین کے اندر سفر کر رہا تھا، مجھے استنجاء کا تقاضہ ہوا تو میں بیت الخلاء کے پاس گیا، وہاں دیکھا کہ ایک خاتون کھڑی ہوئی تھی تو میں یوں سمجھا کہ اندر کوئی ہے، اس کے نکلنے کے انتظار میں یہ کھڑی ہے، میں واپس جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا، تھوڑی

دیر کے بعد پھر دیکھا تو وہ عورت وہیں کھڑی تھی، میں بیت الخلاء کے پاس گیا تو دیکھا کہ دروازہ پر لکھا ہوا تھا کہ خالی ہے، تو میں نے اس خاتون سے کہا: اگر آپ اندر جانا چاہتی ہیں تو جائیں، ورنہ میں جاؤں؟ اس نے کہا: میں ایک خاص وجہ سے یہاں کھڑی ہوں، دراصل میں اپنی ضرورت کے لیے اندر گئی تھی، فراغت کے بعد فلش کرنا چاہتی تھی کہ ٹرین اسٹیشن پر آ کر کھڑی ہوگئی، اب چوں کہ اندر لکھا ہے کہ جب گاڑی اسٹیشن پر کھڑی ہو تو بیت الخلاء کو استعمال بھی نہ کیا جائے اور فلش بھی نہ کیا جائے، اب میں اس انتظار میں ہوں کہ گاڑی چلتے تو میں فلش کر کے اس کو صاف کروں۔

دیکھئے! یورپ والے اصول کی پابندی کا کتنا زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ڈابھیل میں

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ جس زمانہ میں ڈابھیل میں قیام تھا، تو جہاں آج بھی اساتذہ کی قیام گاہ ہے، اس کے سامنے اس وقت بیت الخلاء تھے، آج کل تو وہ بند کر دیئے گئے ہیں، انہی بیت الخلاء میں حضرت شاہ صاحب تشریف لے جاتے تھے، پانی باہر سے لے کر جانا پڑتا تھا، اور اس کا قدمچہ جو بنا ہوا تھا وہ فلش کے انداز کا بنا ہوا تھا، اور ایسے انداز کا جو بیت الخلاء بنا ہوا ہوتا ہے اس میں پانی زیادہ ڈالنے کی ضرورت پیش آتی ہے، تو حضرت شاہ صاحب فراغت کے بعد بار بار باہر سے لوٹے میں پانی بھر کر لے جاتے اور ڈالا کرتے تھے، تاکہ اندر بدبو بھی باقی نہ رہے اور کسی کے استعمال کے نتیجہ میں جو بدبو پیدا ہوتی ہے اس بدبو سے بھی بعد میں جانے والے کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

دیکھو! ہمارے اکابر اس کا بھی کتنا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ تو کسی بھی مشترک

چیز کو اس طرح استعمال کرنا جس سے دوسروں کو تکلیف ہو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

مشترک کاروبار کی بد نظمی

اسی طرح ہمارے یہاں جو کاروبار عام طور پر مشترک ہوتے ہیں، اس کے اندر بھی ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ سب کو برابر کا حق ملے، یعنی سب کے حقوق اور حصے معلوم ہونے چاہئیں۔ آج کل ہمارے سماج میں یہ بھی ایک مصیبت ہے کہ باپ کے ساتھ کاروبار میں جب بیٹے وغیرہ شریک ہوتے ہیں تو ہر ایک کا کتنا حصہ رہے گا وہ متعین نہیں کیا جاتا، کسی بھی تعین کے بغیر ساتھ میں کام کرتے ہیں۔ اگر شروع میں کہا جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ ایک باپ کی اولاد ہے، اس کی کیا ضرورت ہے؟ اور ایسی بھی کیا غیریت دکھلائی؟ لیکن پھر ہوتا یہ ہے کہ جب بڑوں کی شادی ہو جاتی ہے اور ان کی اولاد ہوتی ہے، تو ایک کے یہاں چار اولاد ہوئی اور دوسرے کے یہاں ایک ہی ہے، تیسرے کے یہاں دس ہے، اب چتھم شروع ہوتی ہے کہ دس والا تو بہت کھاتا پیتا ہے، اس کے یہاں زیادہ پیسہ استعمال ہوتا ہے، اور اس کے یہاں زیادہ چیزیں جاتی ہیں۔ اب اگر کسی کے یہاں شادی کی نوبت آئی تو کہا جاتا ہے کہ اس کے یہاں تو زیادہ خرچ کیا گیا، میرے یہاں کے موقع پر کم خرچ کیا گیا۔ ایک زمانہ تک یہ سلسلہ چلتا ہے، لیکن یہی چیزیں دھیرے دھیرے آگے بڑھتی رہتی ہیں، اور دلوں کے اندر میل پیدا ہوتا رہتا ہے، پھر یہی لاوا کسی دن جب باہر آتا ہے، تو ایسا آتا ہے کہ زندگی بھر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ اسی بد نظمی کی وجہ سے ہوتا ہے جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ شریعت تو یہ کہتی ہے کہ پہلے ہی سے سب کے حصے متعین کر دئے جائیں۔ والد کو بھی چاہیے کہ سب کے حصے ان کی حیثیت

کے مطابق طے کر دے کہ منافع (Profit) میں سے ہر ایک کو اتنا اتنا حصہ دیا جائے گا؛ تاکہ بعد میں پریشانی کی نوبت ہی نہ آئے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل

گھر کی چیزیں بھی متعین کر دی جانی چاہئیں، ایک ہی گھر میں سب ساتھ رہتے ہیں تو کون کس چیز کا مالک ہے، اس کا بھی خصوصی اہتمام ہونا چاہیے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: آج اگر میرا انتقال ہو جائے تو میری چیزوں کے معاملہ میں کسی کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی، اس لیے کہ حضرت کی دواہلیہ تھیں، اور حضرت فرماتے تھے کہ: میں نے لکھ دیا ہے کہ بڑی اہلیہ کے گھر میں جو بھی ہے وہ ان کا ہے، اور چھوٹی اہلیہ کے گھر میں جو بھی ہے وہ ان کا ہے، اور میری چیزیں خانقاہ کے میرے کمرے میں رکھی ہوئی ہیں۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصیت نامہ

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولانا محمد تقی صاحب فرماتے ہیں کہ: آخری زمانہ میں جب صاحب فراش تھے تو ان کا یہ حال تھا کہ اگر پانی منگاتے اور ہم گلاس میں پانی لاتے تو پانی پی لینے کے بعد تقاضہ فرماتے کہ یہ گلاس لے جاؤ، اگر کبھی وہیں رکھ کر ہم کسی دوسرے کام میں مشغول ہو جاتے تو بہت ناراض ہوتے۔ ایک مرتبہ ہم نے پوچھا کہ: اباجان! اگر کسی کام میں مشغول ہونے کی وجہ سے گلاس یا برتن لے جانے میں ذرا دیر ہو جاتی ہے؛ تو آپ اتنا زیادہ ناراض کیوں ہوتے ہیں؟ تب فرمایا: بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اپنے وصیت نامہ میں یہ لکھا ہے کہ میرے اس کمرے میں جتنی چیزیں ہیں اس کا مالک میں ہوں، اور گھر میں دوسری جگہوں میں جو

چیزیں ہیں اس کی مالک تمہاری والدہ ہیں، اب اگر تم وہاں سے میرے لیے کوئی چیز برتن وغیرہ لائے اور فراغت کے بعد میں فوراً بھیجنا چاہتا ہوں لیکن تم لے جانے میں دیر کرتے ہو تو مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ خدا نہ کرے اس دوران اگر میری موت آگئی اور یہ برتن میرے کمرے میں رہا تو میرے وصیت نامہ میں لکھے ہوئی تحریر کے مطابق لوگ یوں سمجھیں گے کہ یہ میرے کمرے میں ہے، اس لیے اس کا مالک میں ہوں، اور اس کو بھی میراث میں شمار کر لیں گے۔

خلاصہ روایت

بہر حال! یہ ساری چیزیں ہیں جس کا لحاظ بہت ضروری ہے۔ مشترک چیزوں میں دوسروں کی حق تلفی نہ ہو، یہ بھی بہت ضروری ہے، اور اپنا حق بھی اپنی حد کی مقدار میں ہی وصول کرنا چاہیے، اس کا بھی ہمیں پورا خیال رکھنا چاہیے۔

اسی کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے دو کھجوریں ساتھ لینے سے منع فرمایا۔ ہاں! ساتھی اگر اجازت دیں تو اس صورت میں کوئی بات نہیں۔ یا دوسری شکل یہ ہے کہ میزبان نے کھانے کا اتنی وافر مقدار میں انتظام کیا ہے کہ اگر آپ دو دو چار چار کھجوریں ایک ساتھ اٹھائیں گے تب بھی کسی دوسرے کا حق ضائع ہونے والا نہیں ہے، جس کو جتنا چاہیے اتنا ملے گا، تو اس صورت میں بھی گنجائش ہے۔

بَاب مَا يَقُولُهُ وَيَفْعَلُهُ مَنْ يَأْكُلُ

وَلَا يَشْبَعُ

کھانے سے سیری نہیں ہوتی، کیا کرے؟

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

نیا باب قائم کیا ہے کہ جو آدمی کھانا کھائے پھر بھی اس کا پیٹ نہ بھرتا ہو؛ تو وہ کیا طریقہ اختیار کرے؟ اور اس بے برکتی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کیا کہے؟

الگ الگ کھانے کی نحوست

۷۴۳:- عَنْ وَحْشِيِّ بْنِ حَرْبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ أَصْحَابَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، إِنَّا نَأْكُلُ وَلَا نَشْبَعُ؟ قَالَ: فَلَعَلَّكُمْ تَفْتَرِقُونَ. قَالُوا: نَعَمْ. قَالَ: فَاجْتَنِبُوا عَلَى طَعَامِكُمْ، وَادْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ، يُبَارِكْ لَكُمْ فِيهِ. (رواه أبو داود)

ترجمہ:- حضرت وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کچھ لوگوں نے آ کر نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم کھاتے ہیں اور پیٹ نہیں بھرتا (کھاتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بھوکے ہی ہیں) حضور ﷺ نے فرمایا: ایسا معلوم ہوتا ہے تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو؟ (ساتھ میں مل بیٹھ کر نہیں کھاتے) انہوں نے کہا: جی ہاں! ایسا ہی ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ساتھ مل کر کھایا کرو (الگ الگ مت کھاؤ) اور کھاتے وقت اللہ کا نام لیا کرو، اس میں تمہیں برکت دی جائے گی۔

افادات:- پہلے بھی آچکا ہے کہ اگر آدمی شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھتا، اللہ کا نام نہیں لیتا تو شیطان کھانے میں شریک ہو جاتا ہے اس کی وجہ سے برکت ختم ہو جاتی ہے۔ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ دو کام کرنے ہیں، ایک تو شروع میں بسم اللہ پڑھو، اور دوسرا یہ کہ ساتھ میں مل کر کھاؤ، الگ الگ مت کھایا کرو، گویا بے برکتی سے بچنے کا یہ ایک طریقہ بتلایا۔

الأمر بالأكل من جانب القصعة والنهي عن الأكل من وسطها برتن کے ایک طرف سے کھانے کا حکم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

کھانے کا ایک اور ادب

یہ بھی آداب میں سے ہے کہ برتن کے بیچ میں سے نہ کھائے، یا چاروں طرف ہاتھ نہ مارے؛ اس لیے کہ اگر سب طرف سے کھائے گا اور کھانا بچے گا تو وہ اس قابل نہیں رہے گا کہ دوسرا آدمی اس کو استعمال کرے۔ اور بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ ایسے کھانے کو استعمال کرنے سے کراہیت اور ناگواری محسوس کرتے ہیں اگر ایک طرف سے کھایا ہوگا تو جو کھانا بچا ہوا ہوگا وہ ایسا محسوس ہوگا کہ کسی نے اس کو کھایا نہیں ہے، اور دوسرے لوگ اس کو استعمال کرنا چاہیں گے تو کریں گے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ درمیان میں برکت نازل ہوتی ہے اب اگر برکت اترنے کی جگہ ہی آپ نے اُڑادی؛ تو پھر برکت کہاں آئے گی؟ جیسے: ہیلی کوپٹر کا جو ہیلی پیڈ ہوتا ہے، وہی اگر آپ نے نکال دیا تو اب ہیلی کوپٹر کہاں اُترے گا؟ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ: برکت بیچ میں اترتی ہے، اس لیے اس جگہ کو باقی رکھو، ورنہ برکت نہیں اترے گی۔ اور یہ حضور اکرم ﷺ کی بتلائی ہوئی بات ہے، اس لیے اس بحث میں پڑنے

کی ضرورت نہیں ہے کہ بیچ میں ہی کیوں اترتی ہے، دوسری طرف کیوں نہیں اترتی؟

برکت برتن کے بیچ میں اترتی ہے

۷۴۴:- وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبی ﷺ قَالَ: الْبَرَكَةُ تَنْزِلُ وَسَطَ الطَّعَامِ؛ فَكُلُوا مِنْ حَافَتَيْهِ، وَلَا تَأْكُلُوا مِنْ وَسْطِهِ. (رواہ أبو داود و الترمذی)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: برکت؛ کھانے کے بیچ میں اترتی ہے، اس لیے اس کے کناروں سے کھاؤ، بیچ میں سے مت کھاؤ۔

۷۴۵:- وعن عبد الله بن بُسْتَمٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ لِلنَّبِيِّ ﷺ قِصْعَةٌ يُقَالُ لَهَا: الْغُرَاءُ، يَحْمِلُهَا أَرْبَعَةُ رَجَالٍ؛ فَلَمَّا أَضْحَوْا وَسَجَدُوا الطُّهْمُ حَتَّى أَتَى بِتِلْكَ الْقِصْعَةِ، يَعْنِي وَقَدْ ثَرَدَ فِيهَا، فَالْتَقُوا عَلَيْهَا، فَلَمَّا كَثُرُوا جَثَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ. فَقَالَ أَعْرَابِيٌّ: مَا هَذِهِ الْجَلْسَةُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: إِنَّ اللَّهَ جَعَلَ لِي عَبْدًا كَرِيمًا، وَلَمْ يَجْعَلْ لِي جَبَّارًا عَنِيدًا، ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: كُلُوا مِنْ حَوَالَيْهَا، وَدَعُوا ذُرْوَتَهَا؛ يُبَارِكُ فِيهَا. (رواہ أبو داود و بیہقی)

((ذُرْوَتِهَا)): اَعْلَاهَا بِكَسْرِ الذَّالِ وَضَمِّهَا.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ایک بڑا پیالہ تھا جس کا نام ”غُرَاءُ“ تھا، وہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں کھانا رکھنے کے بعد اس کو چار آدمی چار طرف سے اٹھاتے تھے، اور کوئی آدمی ایک ساتھ بیٹھ کر اس میں کھالیا کرتے تھے۔ ایک روز صبح لوگوں نے چاشت کی نماز ادا کر لی تو وہ پیالہ لایا گیا اور اس میں شریذ تیار کیا گیا تھا ”شریذ“ یعنی گوشت کے شوربہ میں روٹیاں توڑ کر ڈال دی جائیں اور وہ نرم ہو جائیں؛ یہ شریذ کھلاتا ہے، جس کو ہم ”لحم“ کہتے ہیں اور لوگ اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ جب زیادہ آدمی ہو گئے تو

نبی کریم ﷺ روزانہ سرسری نشست سے بیٹھ گئے (جب لوگ زیادہ ہو جاتے ہیں تو جگہ بھی تنگ پڑتی ہے اور لوگوں کو کھل کر جم کر بیٹھنے کی نوبت نہیں آتی۔ تو آپ ﷺ بھی سرسری نشست سے بیٹھ گئے) ایک دیہاتی نے نبی کریم ﷺ کو اس طرح بیٹھا ہوا دیکھا تو کہنے لگا: یہ بیٹھنا کیسا ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے شریف غلام بنایا ہے، مستکبر و سرکش نہیں بنایا ہے (یعنی جم کر بیٹھنے والی اور زیادہ جگہ روکنے والی نشست اور بیٹھک سرکش اور متکبر لوگوں کی ہے) پھر حضور ﷺ نے فرمایا: اس کے کناروں پر سے کھاؤ، اور بیچ کا حصہ چھوڑ دو؛ وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت نازل ہوتی رہتی ہے۔

کراہیۃ الأکل متکءاً

ٹیک لگا کر کھانے کا ناپسندیدہ ہونا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کھانے کے آداب کا بیان چل رہا تھا، ایک اور عنوان قائم کیا ہے کہ ٹیک لگا کر کھانے کا ناپسندیدہ اور مکروہ ہونا۔ چنانچہ روایت لائے ہیں۔

کھانے کے لیے حضور اکرم ﷺ کی پسندیدہ بیٹھک

۷۴۶: - عن أبي جحيفة وهب بن عبد الله بن أبي جحيفة قال قال رسول الله

ﷺ: (لا أكل متكئاً). (رواه البخاری)

قَالَ الْخَطَّابِيُّ: الْمَتَكِيُّ هَاهُنَا: هُوَ الْجَالِسُ مُعْتَدِلاً عَلَى وَطْءٍ تَحْتَهُ، قَالَ: وَأَرَادَ أَنَّهُ لَا يَقْعُدُ عَلَى الْوِطْءِ وَالْوَسَائِدِ كَفَعْلٍ مَنْ يُرِيدُ الْإِكْثَارَ مِنَ الطَّعَامِ، بَلْ يَقْعُدُ مُسْتَوْفِزاً لَا مُسْتَوْطِئاً، وَيَأْكُلُ بُلْغَةً. هَذَا كَلَامُ الْخَطَّابِيِّ. وَأَشَارَ غَيْرُهُ إِلَى أَنَّ الْمَتَكِّيَّ هُوَ الْبَائِلُ عَلَى جَنْبِهِ. وَاللَّهُ أَعْلَمُ.

ترجمہ:- حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔

افادات:- ٹیک لگانے سے کیا مراد ہے؟ بعض حضرات نے ٹیک لگانے

کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ کوئی آدمی کھانے کے لیے دائیں طرف یا بائیں طرف جھک کر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تو اس کو ”ٹیک لگانا“ کہیں گے، جس کو عربی میں ”اِتِّكَاء“

کہتے ہیں۔ لیکن علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے ایک مطلب ذکر کیا ہے کہ آدمی نیچے کوئی چیز بچھا کر جم کر بیٹھ کر کھائے۔ جس آدمی کا ارادہ پہلے ہی سے زیادہ کھانے کا ہوتا ہے، وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ ذرا اچھی طرح جم کر بیٹھے تاکہ برابر کھا سکے۔

دیکھو! پہلے سے زیادہ کھانے کی جو نیت ہوتی ہے اس کو اسلام پسند نہیں کرتا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم بھی یہ نہیں ہے، بلکہ ہمیں تو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کھانا تو زندگی باقی رکھنے کے لیے بقدرِ ضرورت ہوتا ہے، اس لیے آدمی کھانے کو اپنی زندگی کا مقصود نہ بنائے۔ جو لوگ کھانے کو زندگی کا مقصود بنائے ہوئے ہوتے ہیں ان کا مزاج اور سوچ ہی یہ ہوا کرتی ہے کہ اس طرح کھانے کے لیے بیٹھو کہ خوب اطمینان سے برابر جم کر کھانا وصول کر سکیں۔ یہاں علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اپنے نیچے کوئی اچھا بچھونا بچھا کر اور نرم چیز رکھ کر جم کر بیٹھنے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور اس کو پسند نہیں کیا۔ بلکہ کھانے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست اور بیٹھک سرسری ہوا کرتی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جم کر نہیں بیٹھتے تھے، بلکہ ایک آدمی کوئی کام عجلت اور جلدی میں انجام دینا چاہتا ہو تو وہ جس طرح بیٹھتا ہے، اسی طرح بیٹھتے تھے۔ جیسے: آپ کسی کے ساتھ عجلت میں بات کرنے کے لیے بیٹھتے ہیں تو اکڑ و بیٹھ جاتے ہیں، یا ایسی بیٹھک ہوتی ہے کہ بس جلدی سے فارغ ہو کر اٹھ جاؤں گا۔ معلوم ہوا کہ کھانے کے لیے بھی اسی انداز کی بیٹھک ہونی چاہیے کہ جس میں آدمی جم کر نہ بیٹھے، بلکہ سرسری نشست ہو۔ سرسری بیٹھک کو عربی میں ”اِسْتِیْفَازٌ“ کہتے ہیں کہ اگر اٹھنے کے لیے کہا جائے تو دیر نہ لگے۔ جب آدمی جم کر بیٹھتا ہے تو اٹھنے میں ذرا تکلف ہوتا ہے اور دیر لگتی ہے، اور جو سرسری نشست ہوتی ہے اس میں اٹھنے میں دیر نہیں لگتی، بلکہ آدمی فوراً کھڑا ہو جاتا ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے لیے اسی طرح کی ہیئت، اور بیٹھک و نشست کو پسند فرماتے تھے کہ جس میں جم کر نہ

بیٹھا جائے، اور زیادہ کھانے کا ارادہ بھی نہ ہو۔ اور آپ ﷺ بقدرِ ضرورت یعنی اتنا تھوڑا سا کھانا کھاتے تھے کہ جس سے آدمی کی جان بچ جائے اور ضرورت پوری ہو جائے، جس کو بقدرِ سِدِّ رَمَق کہا جاتا ہے۔ ہمیں بھی یہی تعلیم دی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کھانے کے لیے اس نوع کی بیٹھک اختیار کرنا جس میں پہلے ہی سے زیادہ کھانے کا ارادہ ہو اس کو نبی کریم ﷺ نے پسند نہیں فرمایا، اور اس سے آپ ﷺ نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”لَا أَكُلُ مُتَّكِعًا“ میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا، یعنی جم کر بیٹھ کر نہیں کھاتا، بلکہ میرا کھانا سرسری نشست کے ساتھ بڑی عجلت میں ہوا کرتا ہے۔

ویسے بھی کھانا ایک طبعی ضرورت ہے جس کو آدمی پورا کرتا ہے، اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اس میں اپنا زیادہ وقت صرف نہ کرے، بلکہ کم سے کم وقت میں اپنی اس ضرورت کو پوری کر لے۔

بیٹھک کا اصولی طریقہ

۷۴۷:- وعن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ جَالِسًا مُقْعِيًا يَأْكُلُ تَمْرًا. (رواه مسلم)

((المُقْعِيُّ)): هُوَ الَّذِي يُلْصِقُ أَلْيَتَيْهِ بِالْأَرْضِ، وَيَنْصَبُ سَاقِيَهُ.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ آپ اُکڑو بیٹھے ہوئے کھجور تناول فرما رہے تھے۔

افادات:- ”مُقْعِيًا“ کا مطلب یہ ہے جیسا کہ خود علامہ نووی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی تشریح فرمائی ہے کہ: آدمی اپنی سرین زمین کے ساتھ ملا کر پاؤں کی پنڈلیاں

کھڑی کر کے بیٹھے، اس کو عربی میں ”إِقْعَاء“ کہتے ہیں، اسی کو ہم ”اُکڑو بیٹھنا“ کہتے ہیں۔ اب کھانے کے لیے بیٹھک کون سی ہونی چاہیے؟ تو اصولی طور پر علماء نے لکھا ہے کہ: آدمی کھانے کے لیے ایسی نشست اختیار کرے جس میں کھانے کا اکرام ظاہر ہوتا ہو۔ اگر ایک آدمی کرسی پر ٹیک لگا کر پیچھے ہو کر اس طرح بیٹھتا ہے کہ گویا کھانے کی طرف سے استغناء اور بے فکری معلوم ہوتی ہے کہ وہ محتاج نہیں ہے بلکہ کھانا اس کی طرف آ رہا ہے؛ اس کو پسند نہیں کیا گیا، بلکہ آدمی اس انداز سے بیٹھے جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت یعنی کھانے کا محتاج ہے، اور جس ہیئت میں زیادہ سے زیادہ تواضع و انکساری معلوم ہوتی ہو، ایسی ہی بیٹھک پسندیدہ ہے۔

اب بیٹھنے والوں اور جو کھانا رکھا جاتا ہے دونوں کی سطح اگر یکساں ہو تو زیادہ پسندیدہ ہے۔ چنانچہ زمین پر کوئی دسترخوان - چاہے وہ چمڑے، پلاسٹک، یا کپڑے کا ہو - بچھا کر اس پر کھانا رکھا جائے اور آدمی بھی زمین پر ہی بیٹھے، یعنی کوئی نرم بچھونا نہ بچھائے؛ یہ زیادہ پسندیدہ ہے۔ ہاں! کوئی باریک بچھونا بچھایا جائے جس سے آرام مقصود نہ ہو، بلکہ زمین کی گرد سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایسی بیٹھک جس میں آدمی کی تواضع و انکساری کا پتہ چلتا ہو اور کھانے کی تعظیم و احترام معلوم ہوتی ہو، اس کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے زمین پر بیٹھ کر کھانے، اور کھانے اور کھانے والے کی سطح دونوں کے یکساں ہونے کو زیادہ پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق

اب کھانے والے کی تواضع والی بیٹھک اور ہیئت کیا ہو؟ تو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ

نے شامی میں تین طرح کی بیٹھکیں ذکر کی ہیں:-

[۱]: ”اُکڑو“ یعنی آدمی سرین پر بیٹھے اور گھٹنوں کو کھڑا رکھے؛ اسی کو انہوں

نے پہلا درجہ دیا ہے۔

[۲]: ”دوزانو“ یعنی جیسے ہم نماز میں قعدہ کے اندر بیٹھتے ہیں، لیکن اس میں

یہ ہے کہ نماز میں بیٹھنے کے دوران تو بائیں پاؤں کو بچھا کر دائیں پاؤں کو کھڑا رکھتے ہیں، اور کھانے کے لیے بیٹھنے میں دونوں پاؤں کو بچھایا جائے گا، اور ایک کی پشت دوسرے پر رکھ کر اور آگے کی طرف جھک کر بیٹھیں گے۔

[۳]: ”اور تیسری ہیئت یہ ہے کہ بائیں پاؤں نیچے موڑ کر، اور دایاں پاؤں

کھڑا رکھ کر بیٹھے۔

یہ تین ہیئیں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ترتیب سے ذکر کی ہیں کہ یہ تینوں ہیئیں گویا عاجزی و انکساری والی ہیں، ان میں سے کوئی بھی اختیار کرے۔

ٹیبل کرسی پر کھانا کیسا ہے؟

اب یہ بات آتی ہے کہ ٹیبل کرسی پر کھانا کیسا ہے؟ تو پہلے زمانہ کے اندر وہ متکبرین کا شعار سمجھا جاتا تھا، لیکن اب وہ بات باقی نہیں رہی، اس لیے نفیس جائز ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہے۔ اسی لیے علماء فرماتے ہیں کہ کرسی ٹیبل پر کوئی آدمی کھائے گا تو وہ جائز ہے، البتہ اگر زمین پر بیٹھ کر کھائے گا تو یہ نشست سنت سے زیادہ قریب ہے، اور اس میں انکساری پائی جاتی ہے اور ثواب کا حق دار زیادہ ہوگا، اس لیے کبھی اگر ٹیبل کرسی پر بیٹھ کر کھانے کی نوبت آجائے تو اس کو منع نہیں کریں گے، بلکہ اس کی گنجائش ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طرز

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ ٹیبل کرسی پر بیٹھ کر کھایا، اور چوں کہ اُس زمانہ میں ٹیبل کرسی کا اتنا زیادہ چلن نہیں تھا جتنا آج کل ہے، اور اُس وقت یہ متکبرین کا شعار سمجھا جاتا تھا، اس لیے حضرت نے ان کے تشبہ سے بچنے کے لیے ٹانگیں اوپر لے لیں، یعنی کرسی کے اوپر دونوں ٹانگیں لے لیں اور کھانا کھایا۔ لیکن اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں ہے، بلکہ جواز کی حیثیت سے اس کی بھی پوری گنجائش ہے۔ باقی یہ ہے کہ سنت سے زیادہ قریب یہی ہے کہ آدمی زمین پر بیٹھ کر کھائے۔

باب استحباب الأكل بثلاث أصابع
 واستحباب لعق الأصابع، وكره
 مسحها قبل لعقها واستحباب لعق
 القصعة وأخذ اللقمة التي تسقط منه
 وأكلها وجواز المسحه بعد اللعق بالساعد
 والقدم وغيرها

کھانے کا ایک ادب: تین انگلیوں سے کھانا

اس باب میں کھانے کے چند اور آداب بتا رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آدمی کھانا تین انگلیوں سے کھائے، نبی کریم ﷺ عام طور پر تین انگلیوں سے ہی کھانا کھاتے تھے ویسے چار سے بھی آپ کا کھانا ثابت ہے، اور ایک موقع پر آپ ﷺ نے پانچ انگلیاں بھی استعمال فرمائی ہیں، لیکن عام طور پر آپ تین انگلیوں سے ہی کھاتے تھے، بیچ کی انگلی، شہادت کی انگلی اور انگوٹھا۔ اور طبی اعتبار سے بھی اس کو اس لیے پسند فرار دیا گیا ہے کہ اس میں لقمہ اتنا ہی بنتا ہے جو منہ میں جا کر اچھی طرح چبے گا اور ہاضمہ میں بھی سہولت رہے گی، جب کہ پانچ انگلیوں میں لقمہ بڑا ہوگا اور چبانے میں دیر لگے گی اور ہضم میں

بھی پریشانی ہوگی، لیکن اس کے باوجود کسی آدمی کو پانچ انگلیوں کے بغیر چلتا ہی نہیں تو جائز ہے، لیکن اولیٰ یہ ہے کہ آدمی تین انگلیوں سے کھانے کی کوشش کرے۔

آج کل ہمارے زمانہ کے کھانے ایسے ہوتے ہیں جو اس زمانہ کے کھانے جیسے نہیں رہے، ہمارے زمانہ کے کھانے ذرا نرم قسم کے بنتے ہیں کہ اس کا لقمہ بنانے کے لیے پانچ انگلیاں استعمال میں لانی پڑتی ہیں۔ ویسے روٹی کا لقمہ اگر آپ تین انگلیوں سے لیں گے تو آسانی سے لقمہ بن جائے گا، اور کھچڑی تین انگلی سے لینے میں ذرا دشواری ہو جاتی ہے، اس لیے اگر کوئی آدمی پانچ انگلیاں استعمال کرتا ہے تو جواز میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

چھوٹے چھوٹے لقمے لینا

دوسرا یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے لقمہ اگر لیں گے تو سیری جلدی ہو جائے گی یعنی آپ کی بھوک کا تقاضہ جلدی ختم ہو جائے گا، اسی طرح پانی پینے میں بھی اگر آپ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیں گے تو سیری جلدی ہو جائے گی۔ گویا کم کھانے سے ضرورت پوری ہو جائے گی، اس لیے بھی یہ طریقہ پسندیدہ ہے۔

انگلیاں چاٹ لینا

ایک اور ادب یہ بتلایا ہے: انگلیاں چاٹنا۔ اس لیے کہ جب آدمی کھانے سے فارغ ہوتا ہے تو انگلیوں پر بھی کچھ کھانا لگا ہوا رہ جاتا ہے، اگر ہاتھ دھونا ہے تو دھونے سے پہلے، یا اگر کسی وجہ سے ہاتھ دھوتے نہیں ہیں، بلکہ ٹیشو پیپر یا کسی اور چیز سے پونچھ رہے ہیں، تو اس صورت میں بھی پہلے انگلیوں کو چاٹ لینا مستحب اور پسندیدہ ہے۔ دھونے یا پونچھنے سے پہلے انگلیاں نہ چاٹنے کی صورت میں کھانے کے وہ احبزاء جو

انگلیوں پر رہ گئے ہیں، ان کو دھونے میں نکال دینا، یا پونچھنے میں ضائع کر دینا ناپسندیدہ ہے، کھانے کے ادب کے خلاف ہے۔ تو انگلیوں کا چاٹنا بھی آداب میں سے ہے۔

پرانا عیب؛ آج کا فیشن / لطیفہ

جولوگ جدید فیشن کے حامی ہوتے ہیں اور جنہوں نے اپنی زندگی کو فیشن ہی کے تابع بنا رکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ انگلیاں چاٹنا بظاہر کچھ ناشائستگی سی معلوم ہوتی ہے۔ تو پہلی بات تو یہ ہے کہ فیشن کیا چیز ہے؟ تو ذہن میں بٹھا لیجئے کہ فیشن کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ فیشن کا حال تو یہ ہے کہ وہ بدلتا رہتا ہے، پہلے زمانہ میں جس کو عیب سمجھا جاتا تھا؛ آج وہی فیشن سمجھا جاتا ہے۔

حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب 'مذہب اور سائنس' نامی ہے، اس میں انہوں نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ انسان کا مزاج تغیر پسند ہے، پھر لکھا ہے کہ ایک آدمی نے کپڑا خریدا اور دوڑتا ہوا گھر جا رہا تھا۔ کسی نے پوچھا: اتنی تیزی سے کیوں دوڑ رہے ہو؟ تو کہنے لگا: اس لیے دوڑ کر جا رہا ہوں کہ جلدی سے اس کو پہن لوں تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس کو پہننے سے پہلے ہی فیشن بدل جائے۔

تو فیشن کا حال یہ ہے کہ بدلتا رہتا ہے۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ بتلایا ہے اسی پر ہمیں فخر کرنا چاہیے۔ جولوگ فیشن کو اور جدید طور و طریق کو پسند کرتے ہیں اس میں انہوں نے اپنے آپ کو ختم کر دیا ہے، اپنا لباس بھی بدل دیا، اپنے آداب و اطوار بدل دیئے، اپنا چہرہ مہرہ اور شکل و صورت تک بدل دی، اس کے باوجود یہ لوگ تو راضی ہونے والے ہیں ہی نہیں: ﴿وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ (البقرة: ۱۲۰) باری تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرما دیا ہے کہ یہود و نصاریٰ

کبھی آپ سے خوش ہونے والے نہیں ہیں، یہاں تک کہ آپ اپنا مذہب چھوڑ کر ان کا مذہب اختیار نہ کر لیں، آپ اپنے مذہب پر باقی رہتے ہوئے کبھی ان کو خوش نہیں کر پائیں گے اس لیے ہمارے لیے تو نبی کریم ﷺ کا طریقہ ہی فخر کی چیز ہے۔ جیسے وہ لوگ فیشن پر فخر کرتے ہیں، ہمیں سنتوں پر فخر کرنا چاہیے۔

فیشن کا حال!

اور فیشن کا حال تو یہ ہے کہ پہلے جس چیز کو برا سمجھا جاتا تھا وہی چیز آج کل فیشن سمجھی جاتی ہے، جیسے: پہلے زمانہ میں کھڑے کھڑے کھانے کو عیب سمجھا جاتا تھا، لیکن آج کل بونے فیسٹم ایسا نکلا ہے کہ ہاتھ میں پلیٹ لے کر کھڑے رہو۔ اور جب کھانا کھولا جاتا ہے تو سب ٹوٹ پڑتے ہیں اور چھینا جھپٹی ہوتی ہے، اور ایک ہی پلیٹ میں ساری چیزیں ایک ساتھ لے کر کھڑے کھڑے جانوروں کی طرح کھاتے ہیں، اور اسی کو فیشن سمجھا جا رہا ہے۔ یہ کون سا طریقہ ہے! پہلے اسی کو برا سمجھا جاتا تھا، لیکن آج یہی چیز اچھی سمجھی جا رہی ہے۔

لباس کے معاملہ میں بھی دیکھ لیجئے کہ مرد جتنا زنانہ بنتا جائے گا، وہ اچھا سمجھا جاتا ہے اور عورت جتنی مردانی بنتی جائے اسی کو پسندیدہ سمجھتے ہیں۔ یہ فیشن کا حال ہو گیا ہے۔ امریکہ جانا ہوا تھا تو وہاں دیکھا کہ لوگ بھڑوں میں سوراخ کرواتے ہیں، اور بالی جیسا لگاتے ہیں، زبان کے اندر سوراخ کروا کر اس کے اندر کڑا ڈالتے ہیں۔ رخسار کے اوپر سوراخ کر کے بالی ڈالتے ہیں، اور یہ سب مرد کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا: یہ کیا مصیبت ہے؟ تو بتلایا کہ: آج کل یہی فیشن ہے۔

آنکھوں دیکھا واقعہ

اور یہ فیشن اپنانے والے کیسے مست ہوتے ہیں! مجھے خوب یاد ہے، بہت سال پہلے کا قصہ ہے کہ ایک مرتبہ میں دہلی گیا تھا، وہاں فتح پوری مسجد کے پاس چاندنی چوک ہے، میں وہاں گیا تو میں نے دو چار یورپین کو دیکھا جنہوں نے بالکل عورتوں جیسا لباس پہنا ہوا تھا، کان میں بالیاں ڈالی ہوئی تھیں، گلے کے اندر کچھ دانے والی تسبیح وغیرہ لٹکائی ہوئی تھیں، وہ بازار میں سے گزر رہے تھے اور تمام دوکان والے ان کو دیکھ کر ہنس رہے تھے، لیکن ان کے اوپر ذرہ برابر بھی کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میں دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ سب لوگ ان کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں لیکن ان کو کوئی پرواہ نہیں ہے، بلکہ اپنے لباس پر اور اس ہیئت پر ان کو اتنا اطمینان اور شرح صدر ہے کہ ساری دنیا ہنس رہی ہے پھر بھی وہ اپنے حال میں مست ہیں۔ اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کا طریقہ اپنارہے ہیں اور کسی ایک نے کوئی بات کہہ دی تو اس کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، حالاں کہ سنتوں کو اپنانے کے معاملہ میں ہمارا مزاج یہ ہونا چاہیے کہ کوئی کچھ بھی کہے ہمیں اس کی بالکل پرواہ ہی نہ ہو۔

یہ دل و دماغ میں نوٹ کر لو

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ معروف ہے کہ وہ کسریٰ کے دربار میں تشریف لے گئے تھے، وہاں کھانا کھا رہے تھے، کھانے کے دوران لقمہ نیچے گر گیا، تو جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: لقمہ اگر گر جائے تو اس کو شیطان کے لیے نہ چھوڑو، بلکہ اس کو اٹھا کر صاف کر کے کھا لو۔ چنانچہ جب انہوں نے اٹھا کر صاف کر کے کھانا چاہا تو آپ کے ساتھ آپ کا جو ایرانی خادم و غلام تھا، اس نے کہا کہ آقا! یہ

چیزیں یہاں معیوب سمجھی جاتی ہیں، لوگ آپ کو ایسا کرتے ہوئے جب دیکھیں گے تو سوچیں گے کہ انہوں نے کبھی کھانا دیکھا بھی ہے یا نہیں؟ آپ کو نادیہ کہیں گے۔ تو حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو جواب دیا تھا وہ ہمیں اپنے دل و دماغ میں نوٹ کر لینا چاہیے، فرمایا:

”أَتَرَكْتُ سُنَّةَ حَبِيبِي لَهُوَ لَاءِ الْحَمَقَاءِ؟“ ان بے وقوفوں کے لیے میں اپنے حبیب کی سنت کو چھوڑ دوں گا؟ نبی کریم ﷺ کی ہر ہر سنت کو ہمیں اس تصور کے ساتھ اپنانا ہے کہ جس وقت ہم وہ سنت ادا کر رہے ہوں تو یہ سوچیں کہ ہم اللہ تبارک و تعالیٰ کی نگاہوں میں محبوب ہیں ﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، میرے طریقوں پر چلو، میری سنتیں اپناؤ؛ تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ جس وقت ہم نبی کریم ﷺ کی سنت پر عمل کر رہے ہوں تو یہی تصور اپنے دل و دماغ میں تازہ رکھنا چاہیے کہ ہم حضور ﷺ کے طریقے کو اپنا رہے ہیں، تو اس وقت ہم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ تو جب اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں محبوب ہیں تو اب ساری دنیا ہمیں کچھ بھی سمجھتی ہو اور کچھ بھی کہتی ہو، ہمارا مذاق اڑاتی ہو؛ اس سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے! ۱۔

لوگ سمجھیں مجھے محسوس و متاثر نہ ہوں ❁ پروہ نہ سمجھیں کہ مری بزم کے قابل نہ رہا

ہمیں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں عزت چاہیے، ان دنیا داروں کی عزت کا کیا ہے، آج اگر کسی نے واہ واہ کر بھی دی، تو اس سے ہماری کون سی دنیا بن جانے والی ہے، اور کون سی دولت گھر میں آ جانے والی ہے! اس لیے اس کا خاص اہتمام ہونا چاہیے۔

ایک بزرگ کا عمل

انگلیوں کو چاٹنے سے پہلے دھولینا، یا پونچھ لینا ناپسندیدہ ہے، اس لیے کہ اس

میں غذا ضائع ہوتی ہے۔ ہمارے اکابر میں سے حضرت قاری فتح محمد صاحب پانی پتیؒ تھے ان کے متعلق لکھا ہے کہ کھانے کے بعد کلی کے لیے پانی منہ میں لے کر اس کو بھی نگل لیتے تھے، تاکہ غذا کے جو اجزاء منہ کے اندر ہیں وہ بھی ضائع نہ ہوں۔ ہم لوگ تو پہلی کلی کا پانی منہ سے باہر نکال دیتے ہیں، اور وہ پہلی کلی کا پانی باہر نہیں نکالتے تھے بلکہ پی جاتے تھے؛ تاکہ غذا کے وہ اجزاء بھی بے کار نہ جائیں۔

پلیٹ صاف کرنے والے ادب کی تفصیل

اسی طرح کھانے کے برتن کو بھی صاف کر لینا اور چاٹ لینا پسندیدہ ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ آپ نے غذا پوری کر لی ہو۔ پہلے تو یہ ہے کہ آدمی شروع ہی سے اپنی پلیٹ کے اندر اندازہ لگا کر کھانے کی اتنی ہی مقدار نکالے جس کے متعلق اس کا خیال یہ ہو کہ میں اس کو آسانی سے پورا کر لوں گا۔ پھر جب کھانا پورا ہو جائے تو اب پلیٹ کے اندر کھانے کے جو اجزاء چپکے ہوئے ہیں، ان کے متعلق شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ان کو ضائع ہو جانے دے، بلکہ ان کو بھی صاف کر لو۔ اس کی وجہ آگے حدیث کے اندر آرہی ہے، لیکن اگر پلیٹ میں پہلے ہی سے کھانا زیادہ ہے اور اسی میں سے کھانے کے لیے کہا گیا ہے تو اس صورت میں پہلا طریقہ جو بتلا چکا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے سے کھانا چاہیے، تو اب اپنے سامنے کی جگہ کو اچھی طرح صاف کر لیا جائے اور باقی کھانا اس انداز سے چھوڑا جائے کہ دوسرا آدمی اگر اس کو کھانا چاہے تو اس کی طبیعت کو ناگواری محسوس نہ ہو۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ پلیٹ میں جتنا کھانا ہو وہ سب پورا ہی کیا جائے۔ حالاں کہ ایسا ضروری نہیں ہے، بلکہ اصل سنت یہ ہے کہ اگر آپ پلیٹ کا کھانا پورا

کر چکے ہیں، تو اب کھانے کے جواز پلٹ کے اندر چپکے رہتے ہیں اس کو صاف کر لیجئے۔ ایسا نہیں ہے کہ اگر پلٹ میں ایک کلو ہے تو ایک کلو کھانا ہی پڑے گا، چاہے آپ کی طاقت ہو یا نہ ہو۔

ایک قصہ

کئی سال پہلے کا قصہ ہے، ایک مرتبہ گنگوہ جانا ہوا، ہم لوگ رات میں دیر میں پہنچے تھے، وہاں معلوم کیا کہ کوئی ہوٹل ہے؟ ایک پرانا ہوٹل ملا، وہاں کھانے کے لیے گئے۔ ہم سب بھوکے تھے، کھانے کے لیے بیٹھے۔ جب کھانا آیا تو اس کو پورا نہیں کر سکے، پلٹ میں کھانا بچ گیا۔ وہاں کے دیہاتی لوگ بیٹھے ہوئے تھے، وہ یوپی کی دیہاتی انداز میں کہنے لگے: اجی مولوی جی! تم نے پلٹ کو صاف نہیں کیا؟ میں نے کہا: یہ کھانا ہی ہم سے پورا نہیں ہوا؛ تو صاف کرنے کا کیا مطلب! اس لیے کہ پلٹ صاف کرنے کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ پلٹ کا کھانا اگر ہم پورا کر لیتے اور چند دانے بچ جاتے تو ان کو صاف کرنا مستحب ہے، باقی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پلٹ کے اندر جتنا کھانا آیا ہے وہ سب پورا ہی کیا جائے۔ اس پر ایک دیہاتی کہنے لگا: اجی یہ مولوی تو باتیں بناوے ہے۔ خیر! تو اصل مسئلہ اپنی جگہ پر یہی ہے کہ جب پلٹ کا بڑا حصہ کھا چکے ہیں تو اب اس کے اندر جواز اءرہ گئے ہیں ان کو صاف کر لیا جائے، اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ اسی میں برکت ہو۔

”وَأَخِذْ اللَّقْمَةَ الَّتِي تَسْقُطُ مِنْهُ وَأَكْلُهَا“ اسی طریقہ سے وہ لقمہ جو کھانے کے درمیان ہاتھ سے گر جائے، تو اس کو اٹھالینا اور صاف کر کے کھا لینا بھی مستحب ہے۔

”وَجَوَّازُ مَسْحِهَا بَعْدَ اللَّعْقِ بِالسَّاعِدِ وَالْقَدَمِ“ اور آدمی کھانے سے

فارغ ہو کر اپنی انگلیاں چاٹ چکا ہے، اور دھونے کے لیے پانی موجود نہیں ہے، یا ہاتھ بہت زیادہ ملوث نہیں ہوئے ہیں، جیسے: کبھی ہم کسی ہوٹل میں ناشتہ کرتے ہیں، چائے بسکٹ وغیرہ کھالیے، تو ہاتھ دھونے کی ضرورت نہیں ہوتی، تو ایک ہاتھ کو دوسرے میں مل کر صاف کر لیتے ہیں، یا پیر سے صاف کر لیں، تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے

انگلیاں چاٹنا اور چٹوانا

۷۴۸:- عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: إِذَا أَكَلْتَ أَحَدُكُمْ طَعَامًا، فَلَا يَمْسُحُ أَصَابِعَهُ حَتَّى يَلْعَقَهَا أَوْ يُلْعِقَهَا. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی آدمی کھانا کھا چکے، تو اپنی انگلیوں کو نہ پونچھے جب تک اس کو خود چاٹ نہ لے، یا کسی کو چٹوانہ لے۔

افادات:- بچے، بڑوں کی انگلیاں چاٹنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں، جیسے: چھوٹے بچوں کو ماں اپنی انگلیاں چاٹنے کے لیے دیتی ہے، تو وہ بڑی خوشی سے چپاٹتے ہیں، تو آپ خود اپنی انگلیاں چاٹ لیجئے، یا پھر کوئی ایسا ہو جو آپ کی انگلیاں چاٹنا اپنی سعادت سمجھتا ہو؛ اس سے چٹوا لیجئے۔ یا کوئی پالتو جانور بلی وغیرہ ہے، اور وہ آپ کے ساتھ رلی ملی ہوئی ہے، اگر اس کو دیں گے تو وہ صاف کر لے گی، تو اس سے صاف کروا لیجئے مطلب یہ ہے کہ انگلی کے اوپر کھانے کے جو اجزاء لگے ہوئے ہیں، ان کو آپ بے کار نہ جانے دیں، بلکہ ان کو خود کام میں لے لیں، یا کسی اور کے کام میں آجائیں۔

۷۴۹:- وعن كعب بن مالك رضي الله عنه قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ

يَأْكُلُ بِثَلَاثِ أَصَابِعَ، فَإِذَا فَرَغَ لَعَقَهَا. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ تین انگلیوں سے کھا رہے تھے، اور جب آپ کھانے سے فارغ ہوئے تو آپ نے تین انگلیوں کو چاٹ لیا۔

افادات:- چاٹنے میں ترتیب یہ ہے کہ پہلے درمیان کی انگلی کو، پھر شہادت کی انگلی کو، اور پھر انگوٹھے کو چاٹیں گے۔

حصول مقاصد کا نام برکت ہے

۷۵۰:- وعن جابر رضي الله عنه أنَّ رسول الله ﷺ أمر ببلعق الأصابع والصفحة، وقال: إِنَّكُمْ لَا تَدْرُونَ فِي أَيِّ طَعَامِكُمُ الْبَرَكَةُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے انگلیوں کو بھی چاٹنے کا حکم دیا اور پلٹ کو صاف کرنے کا بھی حکم دیا (یہ دونوں ادب پہلے بتا چکا ہوں۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی) اس لیے کہ تمہیں معلوم نہیں کہ برکت کھانے کے کون سے حصے میں ہے۔

افادات:- ہوسکتا ہے کہ کھانے کا وہ حصہ جو تمہاری انگلیوں کے اوپر لگا ہوا ہے اسی میں برکت ہو۔

برکت کیا چیز ہے؟ اور برکت کا مطلب کیا ہے؟ برکت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس مقصد کے لیے کھانا کھا رہا ہے وہ مقصد اس کو حاصل ہو۔ ہر چیز میں یہی قاعدہ ہے۔ جیسے: ایک آدمی کماتا ہے، محنت مزدوری کرتا ہے، اور پیسے اس لیے لاتا ہے تاکہ محنت مزدوری سے حاصل کی ہوئی کمائی سے اس کی ضرورتیں پوری ہوں۔ اگر اس کی ضرورتیں پوری نہیں ہو رہی ہیں تو وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ میری کمائی میں برکت نہیں ہے۔ بھائی! کیسے معلوم ہوا کہ برکت نہیں ہے؟ تو کہتا ہے کہ: میری ضرورتیں پوری

نہیں ہوتیں۔ تو جو کام جس مقصد کے لیے کیا جاتا ہے، اگر وہ مقصد اس سے پورا حاصل ہو جائے؛ اسی کا نام برکت ہے۔

جیسے: آپ ملازمت کرتے ہیں اور آپ کو تنخواہ پانچ ہزار روپے ملتی ہے، لیکن ان سے آپ کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں، یہ پانچ تو ختم ہو جاتے ہیں اور آپ لوگوں سے مانگتے پھرتے ہیں، اور آپ کی ضرورتیں باقی رہتی ہیں، تو یوں سمجھا جائے گا کہ آپ کی کمائی میں برکت نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ پانچ سو تنخواہ لاتے ہیں لیکن اس سے آپ کی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں، تو اس صورت میں یوں کہا جائے گا کہ آپ کی کمائی میں برکت ہے۔ اس فرق کو اچھی طرح سمجھنا اور دل نشین کرنا چاہیے۔

تو کھانے کی برکت کا مطلب یہ ہے کہ کھانا جن مقاصد کے لیے کھایا جاتا ہے اس میں نمبر اول پر یہ ہے کہ آدمی اپنی بھوک مٹائے، اس کے بعد دوسرا مقصد یہ ہے کہ کھا کر لذت حاصل کرے اور راحت پائے، پھر یہ کھانا پیٹ میں جائے اور اس سے خون بنے، اور اس کو طاقت حاصل ہو، اور پیٹ میں جا کر وہ ہضم ہو۔ تو یہ ساری چیزیں کھانے کے مقاصد میں سے ہیں، لہذا اگر یہ ساری چیزیں حاصل ہوں تو کہا جائے گا کہ کھانے میں برکت ہے۔

لیکن کوئی آدمی کھا رہا ہے اور اس سے اس کو شکم سیری ہو ہی نہیں رہی ہے، پیٹ بھر ہی نہیں رہا ہے، تو یوں کہیں گے کہ اس کے کھانے میں برکت نہیں ہے۔ یا پیٹ تو بھر گیا لیکن بد ہضمی ہو گئی، اس کھانے سے خون بننا چاہیے تھا لیکن نہیں بنا، تب بھی کہا جائے گا کہ برکت نہیں ہوئی۔ اس سے جو راحت پہنچنی چاہیے تھی وہ نہیں پہنچی، بلکہ کھانے کے بعد پیٹ میں درد ہو گیا، کوئی بیماری ہو گئی، تو یہ بے برکتی ہی ہے۔ یا اس سے جو طاقت حاصل ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی، ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تمہارے پیٹ میں

جو کھانا جاتا ہے وہ ویسے ہی نکل جاتا ہے، اس سے بدن کو جو فائدہ ملنا چاہیے وہ نہیں ملتا، تو یہ بے برکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ کھانا جن مقاصد کے لیے کھایا جاتا ہے، وہ مقاصد پورے طور پر حاصل ہوں؛ اسی کا نام برکت ہے۔

حصول اسباب اصل نہیں

آج کل ہم مادیت اور اسباب کے ایسے غلام بن گئے ہیں کہ ہماری نگاہوں میں مادہ ہی مادہ اور اسباب ہی سب کچھ ہیں، اسی کے ارد گرد ہماری سوچ گھومتی رہتی ہے، چیزوں کے جو حقائق ہیں اس کی طرف سے ہم غفلت برتتے ہیں، حالاں کہ اسباب مقصود نہیں ہیں، بلکہ اسباب جس چیز کے لیے مہیا کیے جاتے ہیں، وہ اصل مقصود ہے۔ اگر آپ نے اسباب مہیا کیے لیکن اصل مقصود حاصل نہیں ہوا، تو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جیسے: آپ نے مکان بنوالیا، اور اس میں کمرہ بھی بہترین اور شاندار بن گیا، اور اس کے اندر شاندار مسہری بھی آپ نے چھوادی، اس کے اوپر اچھا سا گڈالگوادیا، بہترین چادر اور نیکے بھی لگوادیئے، کمرے کا پورافرینچر بھی ایسا شاندار ہے جس کو دیکھ کر کمرہ میں جی لگتا ہے، A.C. بھی لگا لیا، یہ سب انتظامات کیے؛ لیکن رات کو سوتے ہیں تو نیند ہی نہیں آتی، اب نیند کا کیا کریں گے؟ حالاں کہ یہ سب اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ ہمیں راحت ملے اور نیند پوری حاصل کر کے ہم اپنے جسم میں نشاط کی کیفیت پائیں، اپنی اس ضرورت کو پورا کریں، اب یہ سارے اسباب تو مہیا کر لیے، لیکن نیند ہمارے اختیار میں نہیں ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اپنی یہ نعمت عطا فرمائے گا، ورنہ سارے اسباب کے ہوتے ہوئے بھی وہ چیز آپ کو حاصل نہیں ہوگی۔

آپ نے مال خوب کما لیا اور شاندار سے شاندار چیزیں خریدیں، اچھا باورچی

لائے، اچھا سے اچھا کھانا پکوا یا، دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے لگوادینے، یہ سب کر کے جب کھانے کے لیے بیٹھے تو بھوک ہی نہیں لگتی؛ اب بھوک کہاں سے لاؤ گے؟ بھوک تو اللہ تعالیٰ ہی ڈالتا ہے۔ یا بھوک تو لگی اور کھانا بھی کھایا، لیکن ہضم نہیں ہوتا اور اس سے خون نہیں بنتا۔

تو معلوم ہوا کہ ان چیزوں کے جو مقاصد ہیں وہ حاصل ہوں؛ اسی کا نام برکت ہے۔ اگر آدمی ملازمت یا تجارت و کاروبار کر کے خوب مال و دولت اور پیسے کمائے، تو یہ سب اسباب ہوئے، ان سب کے بعد جو اصل چیز ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے، ان سب کے بعد بھی اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو وہ چیز حاصل ہوگی؛ ورنہ نہیں ہوگی۔

یہ بے برکتی نہیں تو اور کیا ہے؟

تو حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ تمہیں معلوم نہیں کہ برکت کس میں ہے؟ تم چاہتے ہو کہ اس کھانے کے ذریعہ سے تمہارا مقصد حاصل ہو؟ اس کھانے سے تمہیں قوت ملے؟ خون بنے؟ اور اس سے تمہاری صحت مضبوط ہو؟ یہ سب چاہتے ہو تو حضور ﷺ کی اس ہدایت پر عمل کرو کہ اگر تمہاری انگلیوں پر کھانے کے ذرات لگے ہوئے ہیں تو ان کو چاٹ لو، ضائع نہ جانے دو۔ پلیٹ کے اندر کھانے کے ذرات بچے ہوئے ہیں، اس کو صاف کر لو، ہو سکتا ہے کہ برکت اسی میں ہو۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطاے برکت کا جو فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اس کھانے پر اس کے اثرات اور مقاصد کا مرتب ہونا؛ وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدر دانی پر ہوتا ہے، جو آدمی ان ذرات کو ضائع کرتا ہے، گویا وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری کرتا ہے،

اور جو ناقدری کرے گا تو قاعدہ ہے ﴿وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾ (ابراہیم: ۷) اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔ تو اس سے بڑا سخت عذاب اور کیا ہوگا کہ آدمی کھانا کھائے اور اس سے جو مقصد ہے وہ حاصل نہ ہو۔ یہ بے برکتی نہیں تو اور کیا ہے؟

اگر برکت حاصل کرنا چاہتے ہو تو.....

اس لیے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ تمہیں معلوم نہیں کہ کھانے کے کون سے حصے میں برکت ہے۔ اور یہ برکت حضور اکرم ﷺ کے طریقہ کو اپنانے ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اگر فیشن کے پیچھے پڑا رہے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سب کچھ ہوگا لیکن برکت نہیں ہوگی۔ پھر وہ ڈاکٹروں کے چکروں میں پڑا رہتا ہے، اور کہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب! کھانا ہضم نہیں ہوتا، خون نہیں بنتا، جسم میں قوت و طاقت نہیں آتی۔ ارے بھائی! پہلے یہ سب کرلو، نبی کریم ﷺ نے جو ہدایتیں دی ہیں، کھانے کی برکت جس چیز سے حاصل ہوتی ہے، وہ کرلو، تو پھر ان شاء اللہ کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔

لقمہ گر جائے تو اٹھا لو

۷۵۱:- وعنه أن رسول الله ﷺ قَالَ: إِذَا وَقَعَتْ لُقْمَةٌ أَحَدِكُمْ، فَلْيَأْخُذْهَا فَلْيَبِطْ مَا كَانَ يَمِينُ أَذْيً، وَلْيَأْكُلْهَا، وَلَا يَدْعُهَا لِلشَّيْطَانِ، وَلَا يَمْسَحَ يَدَهُ بِالْمِنْدِيلِ حَتَّى يَلْعَقَ أَصَابِعَهُ، فَإِنَّهُ لَا يَدْرِي فِي أَيِّ طَعَامِهِ الْبَرَكَةُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لقمہ اگر گر جائے تو اس کو اٹھا لو، اور جو کچھ گرد و غبار لگا ہو اس کو صاف کر لو اور کھا لو، شیطان کے لیے نہ

چھوڑ دو، اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد رومال سے ہاتھ نہ پونچھو یہاں تک کہ انگلیوں کو چاٹ لو، اس لیے کہ معلوم نہیں کہ کھانے کے کون سے حصے میں برکت ہے۔

۵۲:- وعنه أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: إِنَّ الشَّيْطَانَ يَحْضُرُ أَحَدَكُمْ عِنْدَ كُلِّ شَيْءٍ مِنْ شَأْنِهِ، حَتَّى يَحْضُرَهُ عِنْدَ طَعَامِهِ، فَإِذَا سَقَطَتْ لُقْمَةٌ أَحَدِكُمْ فَلْيَأْخُذْهَا فَلْيُمِطْ مَا كَانَ بِهَا مِنْ أَذَى، ثُمَّ لِيَأْكُلْهَا وَلَا يَدَعُهَا لِلشَّيْطَانِ، فَإِذَا فَرَغَ فَلْيَلْعَقْ أَصَابِعَهُ، فَإِنَّهُ لَا يَدْرِي فِي أَيِّ طَعَامِهِ الْبَرَكَةُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

شیطان تمہاری ہر ہر چیز میں حصہ لگانے کے لیے تمہارے پاس آ جاتا ہے، یہاں تک کہ کھاتے وقت بھی تمہارے پاس آتا ہے، لہذا جب کوئی لقمہ گر جائے تو اس پر سے مٹی وغیرہ کو صاف کر کے پھر اس کو کھالیا کرو، اس لقمہ کو شیطان کے لیے مت چھوڑ دو، اور جب کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو اپنی انگلیوں کو چاٹ لو، اس لیے کہ معلوم نہیں کہ کھانے کے کون سے حصے میں برکت ہے۔

افادات:- جو لقمہ گرا ہے وہ اگر اتنا زیادہ خراب اور گرد و غبار میں ملوث ہو گیا ہو کہ صاف کر کے بھی کھانا ممکن نہیں ہے، تو اس کو چھوڑ دینے کی اجازت ہے، لیکن پھر بھی کوشش یہ ہو کہ وہ کسی جانور چینی وغیرہ کو کھلا دیا جائے، اس کو ویسے ہی چھوڑ دینا کہ اس سے کسی کو بھی فائدہ نہ پہونچے، یہ گویا شیطان کے لیے چھوڑنا ہوا؛ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

یا کوئی ایسی چیز گری ہے جس کو اٹھا کر کھانا ممکن ہی نہیں، جیسے: شوربہ گر گیا تو اس کو کیسے اٹھایا جاسکتا ہے، لہذا وہاں تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر صاف کر کے فائدہ اٹھانا ممکن ہے، جیسے: روٹی کا ٹکڑا ہے کہ اس کو آسانی سے اٹھا کر صاف کر سکتے ہیں؛ تو صاف کر کے کھالینا چاہیے۔ اگر اٹھا کر نہیں کھائے گا تو یہ تکبر کی علامت اور اللہ تعالیٰ کی

نعمت کی ناقدری ہے، گویا اسے شیطان کے لیے چھوڑنا ہے؛ تو پھر برکت نہیں رہے گی۔

حصولِ برکت کے لیے ان چیزوں کا اہتمام کرو

۷۵۳:- عن أنس بن مالك قال: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَكَلَ طَعَامًا، لَعِقَ أَصَابِعَهُ الثَّلَاثَ، وَقَالَ: إِذَا سَقَطَتْ لُقْمَةٌ أَحَدِكُمْ فَلْيَأْخُذْهَا، وَلْيَبِطْ عَنْهَا الْأَذَى، وَلْيَأْكُلْهَا، وَلَا يَدْعُهَا لِلشَّيْطَانِ. وَأَمَرَنَا أَنْ نَسْلُتَ الْقِصْعَةَ، وَقَالَ: إِنَّكُمْ لَا تَدْرُونَ فِي أَيِّ طَعَامِكُمُ الْبَرَكَةُ. (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ

جب کھانا تناول فرما لیتے تھے تو (کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھ دھونے سے پہلے یا رومال وغیرہ سے پونچھنے سے پہلے) اپنی تینوں انگلیوں کو چاٹ لیا کرتے تھے (تاکہ کھانے کے بچے ہوئے اجزاء ہاتھ پر لگے نہ رہ جائیں، اور دھونے کی وجہ سے ضائع نہ چلے جائیں، اس کی وجہ وہی ہے کہ کھانے کے کون سے حصہ میں برکت ہے یہ ہمیں معلوم نہیں، لہذا آدمی کو اس بات کا حریص ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے دانہ دانہ پر جو برکتیں رکھی ہیں ان کو حاصل کرے) اور حضور اکرم ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: کھانے کے دوران اگر لقمہ گر جائے، تو اس کو اٹھا لو، اور اس پر جو بھی گرد وغیرہ لگی ہے اس کو دور کر لو، اور اس کو کھا لو، اس کو شیطان کے لیے نہ چھوڑ دو (اگر اس کو ویسے ہی چھوڑ دیں گے تو وہ ضائع ہو جائے گا، گویا شیطان اس سے فائدہ اٹھالے گا) اور حضور اکرم ﷺ نے ہمیں یہ بھی حکم دیا کہ پیالے کو صاف کر لو (پھر آخر میں آپ ﷺ نے اس کی وجہ بھی بتلائی کہ اوپر جتنے بھی احکام و آداب بتائے گئے وہ اس لیے ہیں کہ) کھانے کے کون سے حصے میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے یہ ہمیں معلوم نہیں ہے (تو اس برکت کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں ان

چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

”وُضُوءٌ مِّمَّا مَسَّتِ النَّارُ“ کا مسئلہ

۷۵۴:- وعن سعيد بن الحارث: أَنَّهُ سَأَلَ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ عَنِ
الْوُضُوءِ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ، فَقَالَ: لَا. قَدْ كُنَّا زَمَنَ النَّبِيِّ ﷺ لَا نَجِدُ مِثْلَ ذَلِكَ
الطَّعَامِ إِلَّا قَلِيلًا، فإِذَا اخْتَنُ وَجَدْنَاهُ، لَمْ يَكُنْ لَنَا مَدِيدٌ إِلَّا أَكْفَنَّا،
وَسَوَّعِدْنَا، وَأَقْدَمْنَا، ثُمَّ نَصَلِّي وَلَا نَتَوَضَّأُ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت سعید بن حارث نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے جو چیز آگ پر
پکائی گئی ہو اس کو کھانے کے بعد وضو کرنے کے متعلق پوچھا۔ تو انہوں نے کہا: اب ایسا نہیں ہے،
نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ایسا کھانا ہمیں بہت کم میسر ہوتا تھا (مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں
عام طور پر کھجوروں پر گزارہ ہوتا تھا، یا دودھ پی لیا اور کھجور استعمال کر لی۔ پکا ہوا کھانا،
گوشت یا روٹی وغیرہ چیزیں بہت کم میسر ہوتی تھی) اور جب کبھی ہمیں یہ ملتا تھا تو کھانے سے
فارغ ہونے کے بعد ہاتھ پر اس کھانے کا جو اثر لگا ہوتا تھا اس کو صاف کرنے کے لیے بھی ہمارے
پاس رومال نہیں ہوتے تھے، بس یہی ہماری ہتھیلیاں اور بازو اور پیر ہوتے تھے، اسی پر ہم اپنے
ہاتھ کی چکنائی کو صاف کر لیتے تھے (پہلے بتا چکا ہوں کہ کوئی ایسی چیز کھائی ہے کہ جس کی وجہ
سے ہاتھ زیادہ ملوث نہیں ہوئے ہیں تو اس صورت میں کوئی آدمی ہاتھ نہ دھوئے، اور
رومال سے، یا ہتھیلی پر، یا بازوؤں پر، یا پاؤں کے تلوؤں پر مل لے، تو اس میں کوئی حرج
نہیں ہے) اور اسی حالت میں ہم نماز پڑھ لیتے تھے، نیا وضو نہیں کرتے تھے۔

انفادات:- شروع اسلام میں یہ حکم تھا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کو اگر آدمی
کھائے تو اس کے بعد اس کو وضو کرنا پڑتا تھا، گویا اس سے اس کا وضو ٹوٹ جایا کرتا تھا،

اس لیے شریعت کا یہ حکم تھا کہ آدمی دوبارہ وضو کرے، پھر نماز پڑھے، لیکن بعد میں یہ حکم باقی نہیں رہا۔ اب اگر آگ پر پکی ہوئی چیز کوئی آدمی استعمال کرتا ہے تو اس کے بعد پانی وغیرہ سے اپنا منہ صاف کر لے، تاکہ کھانا کھانے کی وجہ سے منہ میں کھانے کی چکنائی اور جو اثرات ہیں وہ دور ہو جائیں، اور نماز کے دوران اس کھانے کا مزہ اور اثر باقی نہ رہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تکثیر الأیدی علی الطعام

کھانے میں جتنے کھانے والے زیادہ ہوں گے اتنی ہی اس کھانے میں برکت زیادہ ڈالی جائے گی۔

دو کا کھانا تین کو، تین کا چار، چار کا آٹھ کو کافی ہو جائے گا

۷۵۵:- عن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: طَعَامُ

الاثْنَيْنِ كافي الثلاثَةِ، وطَعَامُ الثَّلاثَةِ كافي الأربعة. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد

فرمایا: دو آدمیوں کا کھانا تین کو کافی ہو جاتا ہے، اور تین کا چار کو کافی ہو جاتا ہے۔

۷۵۶:- وعن جابر رضي الله عنه قال: سمعتُ رسول الله ﷺ يقول: طَعَامُ

الوَاحِدِ يَكْفِي الاثْنَيْنِ، وطَعَامُ الاثْنَيْنِ يَكْفِي الأربعة، وطَعَامُ الأربعة يَكْفِي

الثمانيَّة. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد

فرماتے ہوئے سنا: ایک کا کھانا دو کے لیے کافی ہے، اور دو کا چار کے لیے کافی ہے اور چار کا آٹھ

کے لیے کافی ہے۔

افادات:- ایک خاص مقصد کو اس طرح تعبیر کیا گیا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ

مثلاً: ہم نے اپنے حساب سے کھانا تیار کیا، کھانے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں کہ دو چار مہمان

آگئے، تو ایسے موقع پر صاحب خانہ اور مالک مکان یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ مہمان آگئے،

اب کیا ہوگا؟ اس کی وجہ سے اس کی طبیعت کے اندر آنے والوں کی طرف سے جھجک سی پیدا ہوتی ہے، اور وہ یوں سوچنے لگتا ہے کہ ان کو کھانے میں شریک کیا جائے یا نہیں۔

اب یہ جو سوچ آرہی ہے کہ کھانا تو کم لوگوں کے حساب کا بنایا ہے، یہ آدمی بڑھ گئے، تو اب کیا ہوگا؟ تو نبی کریم ﷺ ہمیں بتلاتے ہیں کہ بھائی! آپ کیوں فکر کرتے ہو، تین کا کھانا چار کے لیے کافی ہو جائے گا، یعنی جتنا کھانا دو آدمی کے لیے پکا یا تھا اور دونوں آدمی پیٹ بھر کر ڈکار لے کر کھا سکتے تھے، اسی کھانے میں تین آدمی اپنی ضرورت پوری کر لیں گے، بھلے ہی وہ دو آدمی ڈکاریں نہیں لے سکیں گے، لیکن تینوں کی بھوک تو اس سے مٹ جائے گی، اور کھانے کا تقاضہ باقی نہیں رہے گا، اور اصل تو یہی ہے۔

دوسری روایت میں اور زیادہ وسعت کر دی گئی۔ کافی ہونے کا مطلب وہی ہے کہ جس کھانے کو ایک آدمی پیٹ بھر کر اور شکم سیر ہو کر کھاتا ہے، اگر دو آدمی کھائیں گے تو دونوں کی ضرورت اس سے پوری ہو جائے گی۔ اسی طرح دو کا چار کے لیے اور چار کا آٹھ کے لیے کافی ہے۔

ہم کسے مہمان سمجھتے ہیں؟

مہمان کے لیے بھی ہم نے اپنے ذہنوں میں ایک معیار بنایا ہے کہ کوئی رشتہ دار ہو، یا کوئی ملنے والا ہو، کوئی دوست ہو، یا ہماری سطح کا ہو، ہمارے اسٹیٹس کا آدمی ہو؛ تو اس کو تو ہم مہمان سمجھتے ہیں۔ اور اگر کوئی اجنبی ہے جس کے ساتھ کوئی جان پہچان نہیں ہے، رشتہ داری اور دوستی نہیں ہے، یا وہ ہماری سطح کا نہیں ہے، ذرا غریب آدمی ہے؛ تو اس کو ہم مہمان نہیں سمجھتے۔ حالاں کہ شریعت کی نگاہوں میں مہمان عام ہے، جو آدمی بھی آپ کے گھر آیا ہو، چاہے وہ غریب ہو، وہ آپ کا مہمان ہے اور

قابلِ اکرام ہے، اس کی عزت کرنا ضروری ہے۔ اب آنے والے کے کپڑے پھٹے پرانے ہیں تو کیا ہوا، وہ بھیک مانگنے تو نہیں آیا ہے۔ ہمارا مزاج ایسا بن چکا ہے کہ اگر ایسی ہیئت کا کوئی آدمی آگیا تو اس کو بھکاری ہی سمجھتے ہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ وہ مہمان ہے، اس کی عزت کرو، کھانے کا وقت ہے تو اس کو بھی کھانے میں شریک کر لو۔ خیر! اچانک آنے والے کی وجہ سے آدمی کے دل میں کوئی کدورت اور ناراضگی نہیں ہونی چاہیے، اور کسی کو جھڑکنا تو بالکل ہی نہیں چاہیے۔

نہایت عبرت آموز واقعہ

کتابوں میں ایک قصہ لکھا ہے جو کسی زمانہ میں پیش آیا تھا ”المستطرف فی کل فن مستطرف“ میں موجود ہے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ میں بھی ہے کہ ایک آدمی ایک مرتبہ اپنی بیوی کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا، مرغی پکی ہوئی تھی، کوئی اجنبی آگیا اور اس نے کہا: میں بھوکا ہوں، مجھے کچھ کھانا کھلاؤ۔ تو بجائے اس کے کہ اس کا اکرام کیا جاتا، اس کو کھانے میں بھی شریک کر لیا جاتا؛ وہ آدمی غصہ ہو گیا اور اس کو جھڑک کر وہاں سے بھگا دیا۔ اب جس نے یہ کیا تھا وہ صاحبِ حیثیت اور مالدار آدمی تھا، اتفاق کی بات کہ اس کے برے دن آئے، مال بھی ہاتھ سے نکل گیا، اور اتنی بھی حیثیت نہیں رہی کہ بیوی کا نفقہ ادا کر سکے اور اس کی ضرورتیں پوری کر سکے، مجبور ہو کر کہ بیوی کو طلاق دینی پڑی۔ اس کے بعد اس عورت نے ایک اور آدمی سے نکاح کر لیا جو مالدار اور صاحبِ حیثیت تھا، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ عورت اپنے اس دوسرے شوہر کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہی تھی، مرغی پکائی گئی تھی، باہر کوئی مانگنے والا آیا تو اس نے بیوی سے یوں کہا: یہ پورا تھاں اٹھا کر اس مانگنے والے کو دے دو۔ یہ عورت مانگنے والے کو دینے کے

لیے باہر گئی اور دے کر جب واپس آئی تو رو رہی تھی، شوہر نے پوچھا: کیوں رو رہی ہو؟ اس نے بتلایا کہ یہ مانگنے والا میرا سابق شوہر تھا اور جس زمانہ میں میں اس کے نکاح میں تھی تو ایک مرتبہ ایسا قصہ پیش آیا تھا کہ ہم دونوں میاں بیوی کھانا کھا رہے تھے، اسی دوران ایک آدمی آیا، اس نے اپنی ضرورت ظاہر کی کہ میں بھوکا ہوں، لیکن اس نے اس سائل کو دھمکا کر اور جھڑک کر وہاں سے نکال دیا تھا، پھر اس کے حالات برے ہو گئے، تو وہ مجھے طلاق دینے پر مجبور ہو گیا، پھر میرا تمہارا رے ساتھ نکاح ہو گیا، اور آج وہ اس حالت میں آیا، اس کو دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ تو اس شوہر نے کہا: وہ آدمی جس کو جھڑک دیا تھا، میں ہی تھا۔

یہ بات تو دل میں بٹھا ہی لو

بہر حال! میں پہلے بھی بار بار یہ عرض کر چکا ہوں کہ جس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر نہیں ہے، اس لئے کوئی آدمی یہ نہ سوچے کہ میرے پاس علم ہے، دولت ہے، صلاح و تقویٰ، نیکی اور دینداری ہے، جس کو جو بھی نعمت اللہ تعالیٰ نے دی ہے، وہ سب محض اس کا فضل ہے، ہماری کسی صلاحیت اور قابلیت کو اس میں بالکل دخل نہیں ہے۔ یہ چیز ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے۔ یہ بات تو دل میں بٹھا ہی لو کہ میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ میری صلاحیت اور قابلیت کی بنیاد پر نہیں ہے، سب کچھ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، وہ جب چاہے لے لے، اس سے کوئی بعید نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر یہی ہے کہ ہمیں جو تعلیمات دی گئی ہیں ان کا اہتمام کیا جائے۔

حدیث میں آتا ہے: ”لَا تُظْهِرِ الشَّمَاتَةَ لِأَخِيكَ فَيَعَاذِيَهُ اللَّهُ وَيَبْتَلِيكَ“ (المعجم الكبير للطبرانی: ۱۷۵۹۳) اپنی کسی بھائی کی کسی بھی مصیبت کے اوپر خوشی کا اظہار مت کرو، کہیں

ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو تو اس مصیبت سے نجات دیدے اور تم کو اس میں مبتلا کر دے۔

خلاصہ کلام

تو حضور اکرم ﷺ کی یہ تعلیم ہے کہ دو کھانا تین کے لیے کافی ہو جائے گا، یا تین کا کھانا چار کے لیے کافی ہو جائے گا؛ وہ دراصل ایسے مواقع کے لیے ہی ہے۔ ایسے مواقع پر عام طور پر لوگ اگر نبی کریم ﷺ کی اس تعلیم کو مد نظر رکھیں تو کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی، دل بڑا کرتے ہوئے کہے: بھائی سب آ جاؤ، اللہ تعالیٰ اس کھانے میں برکت دیدیں گے۔ آدمی دل میں جھجک محسوس نہ کرے کہ کیا ہوگا۔ اگر کھانا ختم ہو جائے تو کہہ دو کہ بھائی! جو کھانا تھا وہ پیش کر دیا گیا، اب کھانا ختم ہو گیا ہے۔ اس میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

باب أدب الشرب

پینے کے آداب

واستحباب التنفس ثلاثاً خارج
الإناء و كراهة التَّنَفُّس في الإناء
واستحباب إدارة الإناء على
الأيمن فالأيسر بعد البتداء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پینے کے آداب

اس عنوان میں کئی چیزیں بتاتے ہیں:-

ایک تو یہ ہے کہ پینے کی کوئی بھی چیز ہو، پانی، دودھ یا اور کوئی مشروب ہو، اس کو ایک سانس میں نہ پیے، بلکہ تین سانس سے پیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب سانس لینے کا وقت آئے تو برتن کے اندر سانس نہ لے، بلکہ برتن سے منہ ہٹا کر سانس لے۔ برتن کے اندر سانس لینا مکروہ ہے۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ پینے کی چیز پی کر بچا ہو کسی دوسرے کو دینا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ دائیں طرف سے ابتداء کی جائے۔

۷۵۷:- عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَتَنَفَّسُ فِي الشَّرَابِ ثَلَاثًا. (متفق علیہ)
یعنی: یتنفس خارج الإِنَاءِ.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ پینے کے دوران (برتن کو منہ سے ہٹا کر) تین مرتبہ سانس لیتے تھے۔

۷۵۸:- وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: لَا تَشْرَبُوا وَاحِدًا كَشْرَبِ الْبَعِيرِ، وَلَكِنْ اشْرَبُوا مَشْنَى وَثَلَاثَ، وَسَمَةً وَإِذَا أَنْتُمْ شَرِبْتُمْ، وَاحْمَدُوا إِذَا أَنْتُمْ رَفَعْتُمْ. (رواه الترمذی)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک سانس میں اونٹ کی طرح نہ پیو (اونٹ کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ پانی پینے کے لیے منہ ڈالتا ہے تو پورا پینے کے بعد ہی منہ اونچا کرتا ہے) بلکہ پینے کے دوران دو

یائین مرتبہ سانس لو۔ اور جب پینا شروع کرو تو بسم اللہ پڑھو، اور جب پانی پی چکو تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، حمد بیان کرو (الحمد للہ کہو)

افادات:- اگر پی جانے والی چیز کی مقدار قلیل ہے، مثلاً ایک ہی گھونٹ ہے، تو اس صورت میں ایک سانس میں پینے میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے، لیکن پھر بھی کوئی آدمی سنت پر عمل کی حرص میں اس کو بھی تقسیم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس جذبہ پر اس کو ثواب عطا فرمائیں گے۔ اور نبی کریم ﷺ نے ایک سانس میں پینے کی جو ممانعت فرمائی ہے وہ حرمت کے لیے نہیں ہے، بلکہ آداب کے قبیل سے ہے، اگر کوئی آدمی ایک ہی مرتبہ میں پی لیتا ہے، تو فقہاء نے لکھا ہے کہ وہ بھی جائز ہے لیکن خلافِ اولیٰ ہے، اور پینے کے دوران برتن کو منہ سے ہٹا کر دو یا تین سانس لینا مستحب اور آداب میں سے ہے

نبی ارشاد اور نبی تحریم

دیکھو! نبی کریم ﷺ کی شانیں مختلف ہیں، کبھی تو آپ ﷺ اپنے رسول ہونے کی حیثیت سے کسی چیز سے منع فرماتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب اس چیز کا کرنا حرام اور ممنوع ہے، اگر کوئی آدمی اس کو کرے گا تو گنہگار ہوگا۔ اور نبی کریم ﷺ کی ایک حیثیت شفیق باپ اور مہربان مربی کی ہے، اس لیے کبھی آپ ﷺ کسی چیز سے اسی حیثیت سے منع فرماتے ہیں اور اس ممانعت کا تعلق حلت و حرمت سے نہیں ہوتا؛ اسی کو فقہاء کی اصطلاح میں نبی ارشاد کہتے ہیں، کتابوں میں یہ جملہ آتا ہے کہ آپ ﷺ کی اس ممانعت کا تعلق از قبیل نبی ارشاد ہے، یعنی نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو اچھے آداب سکھانے کی غرض سے کسی کام کو کرنے سے منع فرمایا۔ تو ایک سانس میں پینے سے جو ممانعت فرمائی ہے وہ بھی از قبیل نبی تحریم نہیں، بلکہ از قبیل نبی ارشاد ہے، یعنی ایک

فائدہ کی چیز ہے جس کی نبی کریم ﷺ اپنی امت کو تاکید فرما رہے ہیں، جیسے ایک شفیق باپ اور مہربان مربی اپنے ماتحتوں کی تربیت کرتے ہوئے ایسی چیزوں کی بھی تلقین کرتا ہے جو ان کے لیے مفید اور کارآمد ہوتی ہیں، یعنی وہ کام کوئی واجب اور ضروری نہیں ہوتے، پھر بھی وہ کہتا ہے کہ ایسا کرو اور ایسا مت کرو۔ تو یہ ”ایسا مت کرو“ جو کہا گیا وہ اس لیے نہیں کہ وہ کام حرام اور گناہ ہے، بلکہ اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ اچھا نہیں ہے، نامناسب ہے، خلافِ اولیٰ ہے، بہتر نہیں ہے۔ اسی لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ ایک سانس میں پینا جائز تو ہے، لیکن بہتر نہیں ہے۔

میٹھے پانی کا عجیب و غریب قدرتی نظام

اور پینا شروع کرو تو بسم اللہ پڑھو یعنی اللہ کا نام لو، جس طرح کھانا شروع کرو تب بھی اللہ کا نام لینے کا حکم فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کرتے وقت جو اللہ کا نام لینے کا کہا گیا ہے وہ دراصل اس بات کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت ہے، لہذا جس ذات نے یہ نعمت ہمیں دی ہے اس کا نام لو اور اس کی قدر کرتے ہوئے اس کو استعمال کرو۔

اور ہمیں سوچنا چاہیے کہ یہ پانی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے! اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لیے پانی کا ذخیرہ سمندروں کے اندر رکھا ہے، لیکن وہ پانی تو کڑوا اور کھارا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے نمکیات رکھے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ میٹھا ہوتا تو وہ خراب ہو جاتا اور بگڑ جاتا، اس لیے کہ اس میں جانور مرتے رہتے ہیں اور میٹھے پانی میں جانور مرے تو وہ پانی بہت جلدی سڑ جاتا اور اس میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسے نمکیات رکھے کہ ساری دنیا کی گندگیاں وہاں جاتی ہیں اور مختلف قسم کے

جانور اس میں مر جاتے ہیں، اس کے باوجود وہ پانی انہیں نمکیات کی وجہ سے خراب نہیں ہوتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں فرمایا کہ اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سمندروں سے پانی لے آؤ، اس لیے کہ سمندر کا پانی تو کڑوا ہے، اس سے براہ راست اس کی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی۔ تو پانی کا ذخیرہ تو سمندر میں کیا، پھر اللہ کی مخلوق جہاں جہاں بسی ہے وہاں اس کے پہنچانے کا یہ انتظام کیا کہ سمندر کے اندر مانسون کے ذریعہ بادل تیار ہوتے ہیں، بادل سمندر کے اندر ہی سے اُٹھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ایسا فدرتی نظام بنادیا اور ایسی مشین بنادی ہے کہ مانسون کے ذریعہ بادل میں جب پانی بھرتا ہے تو ساری نمکیات سمندر ہی میں رہ جاتے ہیں اور خالص میٹھا پانی اس میں جمع ہوتا ہے، اور پھر وہ بادل اللہ تعالیٰ دنیا کی مختلف جگہوں پر۔ جہاں اللہ کی مخلوق بسی ہوئی ہے۔ پہنچاتے ہیں اور وہ وہاں پانی برساتے ہیں، اب بارش کا تو مخصوص زمانہ اور موسم ہوتا ہے، اگر یہ حکم ہوتا کہ سال بھر کی اپنی ضرورت کا پانی اسی موسم میں بھر لو، تو اتنی بڑی ٹنکی کہاں سے لاتے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے بھی نظام بنایا کہ پہاڑوں پر جہاں بارش برستی ہے وہاں اس پانی کو برف کی شکل میں جمادیا، گویا وہ فرج میں محفوظ ہے، جب گرمیوں کا زمانہ آتا ہے تو وہ پگھلتا ہے اور ندیوں، دریاؤں کے ذریعہ بستیوں میں پہنچتا ہے۔ اور دوسری شکل یہ بھی بنائی کہ بارش کا برسا ہوا پانی زمین کے اندر جذب کر دیا، زمین کے اندر پانی کے ذخیرے موجود ہیں، گویا زمین کے اندر نالیاں سی بنادیں اور ٹیوب لگادے ہیں، جب ہم زمین کو کھودیں گے تو اندر سے ہمیں پانی ملے گا۔ اس لیے آدمی سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو میٹھا پانی پہنچانے کے لیے کیسا عجیب و غریب نظام بنایا ہے؟ اس لیے کہا گیا کہ سوچو کہ یہ نعمت کس کی دی ہوئی ہے، پھر اسی کا نام لے کر اس کو استعمال کرو، اور اس کا شکر ادا کرو۔

شکر گزار بندہ کی دعائیں

جب پانی پی کر فارغ ہو تو الحمد للہ کہو۔ ”الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَوْثَقَنَا تَمَامَ تَعْرِيفِ اس ذات کے لیے ہے جس نے ہمیں سیراب کیا۔ حضرت نوح علی نبینا وعلیہ السلام کے متعلق قرآن پاک میں ہے: ”اِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا“ وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے تھے۔ ان کے متعلق لکھا ہے کہ جب بھی وہ کوئی نعمت استعمال کرتے تھے تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے۔ جیسے: کھانا کھاتے تو کہتے: ”الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَطْعَمَنِيْ، وَلَوْ شَاءَ اَجَاعَنِيْ“ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھے کھلایا، اگر وہ چاہتا تو بھوکا رکھتا۔ جب پانی پیتے تو کہتے: ”الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ سَقَانِيْ، وَلَوْ شَاءَ اَعْطَمَنِيْ“ اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے پانی پلایا، اگر وہ چاہتا تو پیاسا رکھتا۔ جب لباس پہنتے تو کہتے: ”الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَسَانِيْ، وَلَوْ شَاءَ اَعْرَانِيْ“ اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے لباس پہنایا، اگر وہ چاہتا تو بغیر لباس کے ننگا رکھتا۔ جوتا پہنتے تو کہتے: ”الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ حَدَّانِيْ، وَلَوْ شَاءَ اَحْفَانِيْ“ اللہ کا شکر ہے کہ جس نے مجھے جوتا پہنایا، اگر وہ چاہتا تو ننگے پیر رکھتا۔ اور قضائے حاجت کے بعد کہتے: ”الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَخْرَجَ عَيْنِيْ اَذَاہُ، وَلَوْ شَاءَ حَبَسَهُ“ اللہ کا شکر ہے جس نے تکلیف دہ چیز کو مجھ سے نکال دیا، اگر وہ چاہتا تو اس کو اندر ہی روک دیتا (جامع البیان فی تفسیر القرآن للطبری: سورۃ بنی اسرائیل) تو واقعہ یہ ہے کہ آدمی سوچے کہ اس میں میری کون سی محنت اور صلاحیت کو دخل ہے، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے یہ سب نعمتیں دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی نعمت کو آدمی جب استعمال کرے تو اس موقع پر جو دعائیں بتلائی گئی ہیں ان کا اہتمام کرے، اور وہ دعائیں اسی لیے بتلائی ہیں کہ شروع میں اللہ کا نام لیا جائے گا تو اس نعمت کے دینے والے کی طرف دھیان جائے گا، پھر استعمال کرنے

کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے تاکہ اس نعمت کا حق ادا ہو، اس کی ناقدری نہ ہو۔

برتن میں سانس نہ لے

۷۵۹:- وعن أبي قتادة رضي الله عنه: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ يَأْتِي بِأَنْ يَتَنَفَّسَ فِي

الْإِنَاءِ. (متفق عَلَيْهِ)

یعنی: یتنفس فی نفس الإناء.

ترجمہ:- حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے برتن کے اندر

سانس لینے سے منع فرمایا۔

افادات:- بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ پانی پینے کے دوران گلاس

منہ سے ہٹاتے ہی نہیں، اسی میں سانس لیتے ہیں؛ حالاں کہ اس سے منع کیا گیا ہے۔ برتن سے منہ ہٹا کر سانس لینا چاہیے، اس لیے کہ پانی بہت نازک اور صاف شفاف چیز ہے، آدمی جب اندر سانس لے گا تو سانس کے اثرات اندر آ جائیں گے۔ بیڑی سگریٹ پینے والا اگر اندر ہی سانس لے گا تو اس کی بدبو کا اثر اندر آ جائے گا، پھر اس بچے ہوئے پانی کو اگر کوئی دوسرا استعمال کرنا چاہے گا تو فوراً اس کی طبیعت گھن کرے گی، اس لیے اندر سانس لینے سے منع کیا گیا ہے کہ پانی کے اندر سانس لے کر اس کو آلودہ مت کیجئے، برتن کو منہ سے ہٹا کر سانس لیجئے۔

الْأَيْمَنَ فَلَا أَيْمَنَ

۷۶۰:- وعن أنس رضي الله عنه أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَمَرَ بِلَيْتٍ قَدْ شِيبَ بَمَاءٍ،

وَعَنْ يَمِينِهِ أَعْرَابِيٌّ، وَعَنْ يَسَارِهِ أَبُوبَكْرٍ رضي الله عنه، فَشَرِبَ، ثُمَّ أَعْطَى الْأَعْرَابِيَّ،

وَقَالَ: ((الْأَيْمَنَ فَلَا أَيْمَنَ)) (متفق عَلَيْهِ) قَوْلُهُ: ((شِيبَ)) أَيْ: خُلِطَ.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے پاس دودھ لایا گیا جس میں پانی کی ملاوٹ تھی، آپ کے دائیں طرف ایک دیہاتی بیٹھا ہوا تھا اور بائیں طرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیٹھے ہوئے تھے۔ جب آپ ﷺ دودھ پی کر فارغ ہوئے تو آپ نے بچا ہوا اس دیہاتی کو عطا فرمایا اور ارشاد فرمایا: ”أَلَا يَمْنَنُ قَالَ لَا يَمْنَنُ“

۷۶۱:- وعن سهل بن سعدٍ رضي الله تعالى عنه أن رسول الله ﷺ أتى بَشْرًا -ابٍ، فَشَرِبَ مِنْهُ وَعَنْ يَمِينِهِ غُلامٌ، وَعَنْ يَسَارِهِ أَشْيَاخٌ، فَقَالَ لِلْغُلامِ: أَتَأْذُنِي أَنْ أُعْطِيَ هَؤُلَاءِ؟ فَقَالَ الْغُلامُ: لَا وَاللَّهِ، لَا أُؤْثِرُ بِنَصِيبِي مِنْكَ أَحَدًا. فَتَلَّاهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي يَدِهِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

قَوْلُهُ: ((تَلَّاهُ)) أَيْ وَضَعَهُ. وَهَذَا الْغُلامُ هُوَ ابْنُ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت سهل بن سعد ساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس پینے کی کوئی چیز لائی گئی، جب آپ پی چکے تو آپ کی دائیں طرف ایک بچہ بیٹھا ہوا تھا اور بائیں طرف بڑی عمر کے بزرگ لوگ تھے، نبی کریم ﷺ نے اس بچہ سے کہا: کیا تم اس بات کی اجازت دیتے ہو کہ میں اپنا بچا ہوا ان بڑے لوگوں کو دوں؟ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ آپ کا بچا ہوا ہے جس میں میرا حصہ ہے، اور میں وہ کسی دوسرے کو دینا نہیں چاہتا، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ان کے ہاتھ میں زور سے تھما دیا۔

افادات:- عرب میں یہ رواج تھا کہ جب دودھ دوھتے تھے تو اس میں تھوڑا سا پانی میں بھی ملا دیتے تھے، اس کی وجہ سے دودھ میں ٹھنڈک بھی آ جاتی تھی اور پینے کے لیے مرغوب بھی ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ بات بھی یاد رہے کہ پینے کے لیے تو دودھ پانی کی ملاوٹ کی اجازت ہے، بیچنے کے لیے پانی کی ملاوٹ کی اجازت نہیں ہے، اگر اس میں پانی ملا یا گیا ہے تو گاہک سے کہہ دیا جائے کہ اندر پانی ملا یا گیا ہے۔

اس باب میں ایک ادب یہ بھی بتلایا ہے کہ کسی نے کوئی چیز پی، اور وہی برتن کسی دوسرے کو پینے کے لیے دینا چاہتا ہے تو دائیں طرف والے کو دے۔ اس روایت میں دیکھو کہ دائیں طرف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیٹھے ہوئے تھے جن کا مقام و مرتبہ حضرات انبیاء کے بعد انسانوں میں سب سے افضل ہیں، اس کے باوجود چوں کہ وہ بائیں طرف تھے، اور آداب میں سے یہ ہے کہ جو دائیں طرف ہو اس کو دیا جائے، تو نبی کریم ﷺ نے اس ادب کی رعایت فرمائی۔

دوسری روایت میں جو آیا تو وہ بچے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تھے، نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت ان کی عمر دس سال تھی، تو ظاہر ہے اس وقت چھوٹے لڑکے تھے۔ چوں کہ ”الایمن فالایمن“ والا اصول بتلایا گیا ہے۔ حالاں کہ پینے کی جو چیز لائی گئی تھی اس کے مالک خود حضور اکرم ﷺ تھے، آپ اپنی مرضی سے جس کو چاہتے دے سکتے تھے، لیکن اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ دینے کی شروعات داہنی طرف سے کرو، اس لیے خود حضور اکرم ﷺ نے بھی اس کا اہتمام فرمایا کہ بائیں طرف بڑے لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور دائیں طرف ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا، اور اصول کا تقاضہ یہ ہے کہ اس لڑکے ہی کو دیا جائے، ادھر بڑے لوگ تھے جس کی وجہ سے خیال یہ ہوا کہ ان کا اکرام کیا جائے۔ جب نبی کریم ﷺ نے ان سے اجازت مانگی تو ان کو چاہیے تھا کہ اجازت دیدیتے، لیکن چوں کہ وہ بھی حضور ﷺ کے بچے ہوئے کے حریص تھے تو انہوں نے سوچا کہ اگر آپ ﷺ اپنی مرضی و اختیار سے دینا چاہتے تو دے سکتے تھے، لیکن جب حضور ﷺ اجازت ہی مانگ رہے ہیں تو میں ہی فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں؛ اس لیے انہوں نے کہا: میں تو اپنا حصہ کسی کو نہیں دوں گا۔

ایک مسئلہ

اور یہ ادب اس وقت ہے جبکہ وہ چیز ہمیں پینے کے لیے مالک بنا کر دی گئی ہو، لیکن اگر پینے کی جو چیز ہمیں دی وہ کسی اور کی ہے، تو پھر اس صورت میں پی کر بچا ہوا اسی کو دے دیا جائے جو لایا ہے، پھر وہ جس کو چاہے دے، اگرچہ اس کو چاہیے کہ دائیں طرف والے کو دے، لیکن ہم تو پی کر اسی کو دیں۔

ان دونوں روایتوں میں یہی ادب سکھایا گیا ہے کہ کسی نے کوئی چیز پی، اور بچا ہوا آگے دینا چاہتا ہے، تو اس کا دَورِ داہنی طرف سے چلانا چاہیے۔

کراهة الشرب من فم القربة ونحوها

وبیان أنه کراهة تنزیه لا تحریم

مشیکیزہ اور بڑے برتن سے منھ لگا کر پینے کی ممانعت اور اس کی وجہ مشیکیزہ یا اس جیسی کوئی بڑی چیز، یا کوئی بڑا برتن جس میں پانی رکھا ہوا ہو، جیسے: آج کل پلاسٹک کے گوط، یا کیرے ہوتے ہیں، تو اس سے براہ راست منھ لگا کر پینا کیسا ہے؟ باب کا عنوان لا کر بتلانا چاہتے ہیں کہ ایسے بڑے برتن سے منھ لگا کر پینا منع ہے، نبی کریم ﷺ نے اس کو پسند نہیں کیا ہے۔ ورنہ جو چھوٹے برتن ہوتے ہیں، جیسے: گلاس، پیالہ وغیرہ؛ وہ تو پینے کے واسطے ہی ہوتے ہیں، اس کی ممانعت نہیں ہے۔ اور یہ ممانعت بھی آداب کے قبیل سے ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بڑے برتن میں جو پانی ہے اس میں کوئی مضر چیز ہے، جیسے پانی خراب ہو گیا ہے، یا اندر کوئی سپولیا ہے، یا کوئی چھوٹا سا جانور گھس گیا ہے، اب اگر آپ منھ لگا کر پیئیں گے تو ہو سکتا ہے کہ وہ پیٹ کے اندر آجائے اور نقصان ہو جائے جیسا کہ روایتوں میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے مشیکیزہ سے براہ راست پیا، تو اندر ایک چھوٹا سا سپولیا تھا وہ ان کے پیٹ میں چلا گیا۔ تو اگر اس برتن میں سے کسی چھوٹے برتن گلاس وغیرہ میں نکالیں گے تو ہمیں نظر آجائے گا کہ اندر کیا ہے، اس لیے یہ ادب بتلایا ہے۔ اور یہ ممانعت بھی از قبیل تحریم نہیں، بلکہ اس طرح پینا خلاف اولیٰ ہے۔

۷۶۲:- عن أبي سعيدٍ الخدريِّ رضي الله عنه قال: نهى رسول الله ﷺ عن

اُخْتِنَاتِ الْأَسْقِيَةِ. يَعْنِي: أَنْ تُكْسَرَ أَفْوَاهُهَا، وَيُشْرَبَ مِنْهَا. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ مشکیزہ کا منہ توڑ کر اس سے پیا جائے، یا اس کو موڑ کر پیا جائے۔

۶۳:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: نهى رسول الله ﷺ أَنْ يُشْرَبَ مِنْ فِي السَّقَاءِ أَوْ الْقِرْبَةِ. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بڑے برتن یا مشکیزہ سے منہ لگا کر پینے سے منع فرمایا۔

افادات:- دو شکلیں ہیں، ایک تو یہ ہے کہ چمڑے کا بڑا مشکیزہ ہوتا ہے اس میں پانی زیادہ ہوتا ہے، تو اس سے براہ راست پینے میں آگے کا جو منہ ہوتا ہے، اس کو موڑ دیتے ہیں، اس لیے کہ اس کے منہ پر ہاتھ لگنے کی وجہ سے میل کچیل لگا ہوا ہوتا ہے، جب آدمی اسی سے منہ لگا کر پینا چاہتا ہے تو اس کی طبیعت چاہتی ہے کہ صاف جگہ سے پیوں، اس لیے بعض لوگ ایسا کرتے تھے کہ اس مشکیزہ کے سرے کو اس طرح موڑتے ہیں کہ اندر کا حصہ باہر آ جاتا ہے، اور چوں کہ اندر کا حصہ بالکل صاف شفاف ہوتا ہے تو اس کو منہ لگا کر پیتے ہیں۔ اب اگر سب ہی اس طرح اس کا منہ موڑ کر پسیں گے تو چند مرتبہ کے بعد مشکیزہ کا منہ کٹ جائے گا اور پھر وہ مشکیزہ استعمال کے قابل نہیں رہے گا، اس لیے نبی کریم ﷺ نے مشکیزہ کے منہ کو اس طرح موڑ کر پینے سے منع فرمایا اس سے ایک اصول معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کو استعمال کرنے کے لیے ایسا طریقہ اپنانا، جس کے نتیجے میں آئندہ چل کر وہ چیز بے کار ہو جائے؛ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

اس میں دوسرا نقصان یہ بھی ہے کہ بڑا برتن ہونے کی وجہ سے اس میں پانی

زیادہ ہوتا ہے، تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پانی زیادہ مقدار میں حلق کے اندر چلا جاتا ہے، اور یہ چیز آدمی کے لیے مضر ہوتی ہے۔

حضور ﷺ نے مشکیزہ سے منہ لگا کر پیا

۷۶۳:- وعن أم ثابتٍ كَبْشَةَ بِنْتِ ثَابِتٍ أُخْتِ حَسَّانِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَشَرِبَ مِنْ فِي قَرْبَةٍ مُعَلَّقَةٍ قَائِمًا، فَقُمْتُ إِلَى فِيهَا فَقَطَعْتُه. (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

وَأَمَّا قَطَعْتُهَا: لِيَحْفَظَ مَوْضِعَ فَمِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَتَتَبَرَّكَ بِهِ، وَتَصُونَهُ عَنِ الْإِثْمَالِ. وهذا الحديث محمولٌ عَلَى بَيَانِ الْجَوَازِ، وَالْحَدِيثَانِ السَّابِقَانِ لِبَيَانِ الْأَفْضَلِ وَالْأَكْمَلِ. وَاللَّهُ أَعْلَمُ.

ترجمہ:- حضرت ام ثابت کبشہ بنت ثابت رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ان کے یہاں تشریف لائے، ایک مشکیزہ لٹکا ہوا تھا اس کو منہ لگا کر کھڑے کھڑے پانی پیا (وہ فرماتی ہیں کہ جس جگہ نبی کریم ﷺ نے منہ لگا کر پانی پیا تھا) اس جگہ کو میں نے کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا۔

افادات:- اس حصہ کو برکت کے واسطے کاٹ ڈالا کہ نبی کریم ﷺ کا منہ جہاں لگا ہے وہ چیز اپنے پاس برکت کے لیے رہے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نیک بندوں کی استعمال کی ہوئی چیز کو آدمی برکت کے واسطے اپنے پاس رکھنا چاہے؛ تو اس کی اجازت ہے۔

برکت کے معاملہ میں بھی لوگوں میں افراط و تفریط ہے، بعض لوگ برکت کے معاملہ میں اتنے آگے بڑھے ہوئے ہیں کہ اسی کو کافی سمجھتے ہیں، دوسرے کسی عمل کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے؛ یہ صحیح نہیں ہے۔ اور بعض لوگ اس کو بالکل بدعت سمجھتے

ہیں؛ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

روایتوں میں تطبیق

اب دیکھئے! اوپر تو ممانعت آئی تھی اور یہاں آپ ﷺ نے خود اس طرح پیا؟ تو پہلے بتلا چکا ہوں کہ وہ ممانعت حرمت کے لیے نہیں ہے کہ اس طرح پینا حرام ہے، بلکہ اس طرح پینے کے مقابلہ میں کسی برتن میں نکال کر پینے میں فائدہ زیادہ ہے۔ اسی لیے ایک موقع پر خود نبی کریم ﷺ نے منہ لگا کر پی کر بتا دیا کہ اگرچہ اچھا نہیں ہے، لیکن جائز ہے۔

باب کراہۃ النفخ فی الشرب

پینے کی چیز میں پھونک نہ مارے

پینے کے آداب میں ایک ادب یہ بھی ہے کہ جو چیز پی جا رہی ہے تو پینے کے دوران اس میں پھونک نہ مارے۔ ایک تو ہے اندر سانس لینا اور ایک ہے پھونک مارنا، تو پینے کی چیز میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے۔

۷۶۵:- عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه أن النبي ﷺ نهى عن النفخ في الشراب، فقال رجل: القذاة أراها في الإناء، فقال: أهرقها. قال: إني لا أدوي من نفس واحد؛ قال: فأين القذح إذ أعن فيك.

(رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے پینے کی چیز میں پھونک مارنے سے منع فرمایا۔ اس پر ایک آدمی نے سوال کیا: اگر اس میں کوئی تنکا نظر آجائے، تو کیا کیا جائے؟ اس کو کیسے نکالے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اتنا پانی بہا دو (کہ اس کے ساتھ وہ چیز گر جائے، پھونک مارے بغیر بھی یہ مقصد حاصل ہو جائے گا) پھر اس آدمی نے کہا: میں ایک سانس میں شکم سیر ہو کر پانی نہیں پی سکتا؟ (یعنی تھوڑا سا پانی میرے لیے کافی نہیں ہوتا، مجھے زیادہ پانی پینا پڑتا ہے اور جب زیادہ پانی پیوں گا تو پینے میں دیر لگے گی اور اس دوران سانس لینے کی ضرورت پیش آئے گی، اور برتن میں پھونک مارنے سے اور ہوا چھوڑنے سے منع کیا گیا ہے؛ تو اب کیا کروں؟) حضور ﷺ نے فرمایا: جس برتن میں پی رہے ہو (گلاس، برتن یا پیالی وغیرہ) اس کو منہ سے الگ کر دو (پھر سانس لے لو، گویا

اس گلاس یا پیالہ کو منہ سے لگا ہوا رکھنے کی حالت میں سانس نہ لو، تاکہ سانس کا اثر اندر جانے نہ پائے۔

افادات:- کبھی تو وہ چیز گرم ہوتی ہے اس کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بعض لوگ اس میں پھونک مارتے ہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تنکا وغیرہ کوئی چیز اس میں گری ہوئی ہوتی ہے، اس کو دور کرنے کے لیے پھونک ماری جاتی ہے؛ تو چاہے پینے کی چیز پانی ہو، چائے ہو، یا اور کوئی چیز ہو؛ اس میں پھونک مارنے سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ پہلے بھی بتایا گیا تھا کہ یہ کراہت تنزیہی ہے، یعنی ادب کے خلاف ہے۔ ایسا نہیں کہ کوئی ایسا کام کرے گا تو اس نے حرام کام کر لیا اور گناہ کا ارتکاب ہو گیا۔ بلکہ کسی چیز کو پینے کا جو پسندیدہ انداز ہے اور ہمیں پینے کی جو تہذیب بتائی گئی ہے اس کے خلاف سمجھا جائے گا۔

۷۶:- وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ هَمَّيْ أَنْ يُتَنَفَّسَ فِي الْإِنَاءِ

أَوْ يُنْفَخَ فِيهِ. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس برتن میں پانی یا کوئی اور چیز پی جا رہی ہے اس میں سانس لینے اور پھونک مارنے سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔

افادات:- ویسے بھی پانی بڑی نازک چیز ہے، آدمی کے سانس لینے اور پھونک مارنے کی وجہ سے آدمی کے منہ کا اثر پانی میں آ جاتا ہے۔ اگر بدبو ہے تو بدبو کا اثر آ جاتا ہے، خاص کر کے اگر آدمی بیڑی سگریٹ پینے والا ہو تو اس کے اثرات پانی میں آ جائیں گے، اور اگر پانی بچ گیا تو دوسروں کے پینے کے قابل نہیں رہے گا، آدمی کی طبیعت اس سے کراہت اور گھن کرے گی۔

باب بیان جواز الشرب قائماً وبیان أَنَّ الْأَكْبَلَ وَالْأَفْضَلَ الشرب قاعداً

کھڑے ہو کر پینے کی تفصیل

ایک اور ادب بتلا رہے ہیں کہ پانی یا جو بھی پینے کی چیز ہو وہ اگرچہ کھڑے ہو کر پینا جائز تو ہے، لیکن اچھا اور بہتر یہ ہے کہ بیٹھ کر پیے، اس سلسلہ میں ایک روایت حضرت کبشہ بنت ثابت رضی اللہ عنہا کی پچھلے باب میں گزر چکی کہ نبی کریم ﷺ ان کے مکان پر تشریف لے گئے اور جو مشکیزہ لٹک رہا تھا اس کا منہ کھول کر آپ نے کھڑے کھڑے اس مشکیزہ سے منہ لگا کر پانی نوش فرمایا، اس سے کھڑے کھڑے پانی پینے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ایک اور روایت لا رہے ہیں۔

۷۶۷:- وعن ابن عباس رضي الله عنهما قال: سَقَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ مِنْ زَمْزَمَ،

فَشَرِبَ وَهُوَ قَائِمٌ. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم

ﷺ کو زمزم پلایا، تو آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر نوش فرمایا۔

۷۶۸:- وعن النُّزَالِ بْنِ سَبْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: أُنِيَ عَلَى بَابِ الرَّحْبَةِ، فَشَرِبَ

قَائِمًا، وَقَالَ: إِنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَعَلَ كَمَا رَأَيْتُمُونِي فَعَلْتُ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت نزال بن سبرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فہ کے چوک کے پاس تشریف لائے اور وہاں کھڑے ہو کر پانی پیا۔ اور فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا جیسا کہ تم لوگوں نے مجھے کرتے ہوئے دیکھا۔

افادات:- اس باب میں کھڑے ہو کر پینے کے سلسلہ میں دونوں قسم کی روایتیں لارہے ہیں۔ بعض روایتیں وہ ہیں جن میں نبی کریم ﷺ نے کھڑے ہو کر پینے سے منع فرمایا، جیسے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت پیش کریں گے: ”أَنَّهُ نَهَى أَنْ يَشْرَبَ الرَّجُلُ قَائِمًا“ آدمی کھڑے ہو کر پیے اس سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔ بلکہ مسلم کی ایک روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے پیش کی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لَا يَشْرَبُ بَنٌ أَحَدٌ مِنْكُمْ قَائِمًا، فَمَنْ نَسِيَ، فَلْيَسْتَقِ“ کوئی آدمی کھڑے ہو کر ہرگز نہ پیے، اگر بھول سے کھڑے ہو کر پیا ہو تو قے کر دے۔ بہر حال! ان روایتوں سے کھڑے ہو کر پانی پینے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے۔

اور کچھ روایتیں وہ پیش کریں گے جس میں آپ ﷺ نے پانی کھڑے ہو کر نوش فرمایا، جس سے کھڑے ہو کر پینے کی اجازت معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہی روایت اور حضرت علی والی روایت پیش کی ہے۔ تو اب دونوں طرح کی روایتوں کے پیش نظر اہل علم نے ان میں جوڑ پیدا کرنے کے لیے مختلف باتیں کہی ہیں۔

بعض حضرات کھڑے ہو کر پینے والی روایت۔ جس سے اجازت معلوم ہوتی ہے۔ اسی کو ترجیح دیتے ہیں کہ وہ زیادہ قوی ہیں اور عمل اسی پر ہے۔ اور ممانعت والی روایتوں کو اس درجہ کی قوی نہیں مانتے۔

بعضوں نے یہ کہا: پہلے کھڑے ہو کر پینے کی اجازت تھی، پھر ممانعت ہو گئی،

یعنی وہ حضرات ممانعت والی روایتوں کو ناخ مانے ہیں۔
بعضوں نے کہا: پہلے ممانعت تھی، پھر اجازت والا حکم آ گیا۔

چکی کا پاٹ

لیکن محققین اس طرف گئے ہیں کہ کھڑے ہو کر پینے کی جو روایتیں ہیں وہ بیانِ جواز کے لیے ہیں کہ آپ ﷺ اس کا جائز ہونا بتا رہے ہیں۔ اور ممانعت والی روایت سے اس کا ناپسندیدہ ہونا معلوم ہوتا ہے، یعنی ادب کے خلاف ہے کہ آدمی کھڑے ہو کر پیئے۔

دورِ حاضر کے ہمارے بعض اکابر فرماتے ہیں: اگر بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ موجود ہے تو پھر کھڑے ہو کر پینا مکروہ ہے۔ اور اگر بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ نہیں ہے، جیسے: اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ہیں، یا کوئی ایسی جگہ پر ہیں کہ بیٹھنا چاہیں تب بھی نہیں بیٹھ سکتے، تو پھر وہاں کھڑے ہو کر پانی پینے میں کوئی کراہت بھی نہیں، ایسی جگہوں پر کھڑے ہو کر پینا بلا کراہت درست ہے۔

اور بعضوں نے کہا ہے کہ کھڑے ہو کر پینا مضر ہے، اس وجہ سے شفقتاً منع فرمایا ہے، اس لیے کہ جب آدمی کھڑے ہو کر پیتا ہے تو سانس کی رگیں پوری طرح کھلی ہوئی ہوتی ہیں، اور پانی سیدھا معدہ میں پہنچتا ہے جس کی وجہ نقصان ہو سکتا ہے، بیٹھ کر پینے میں اس نقصان سے حفاظت ہو جاتی ہے۔

البتہ دو پانی ایسے ہیں جن کو کھڑے ہو کر پینے کی اجازت ہے۔ ایک تو زمزم، اور دوسرا وضو کا سچا ہوا پانی۔ نبی کریم ﷺ نے زمزم کھڑے ہو کر پیا، جیسا کہ ابن عباسؓ کی روایت پیش فرمائی کہ میں نے آپ ﷺ کو زمزم پلایا تو آپ نے کھڑے ہو کر نوش فرمایا۔

زمزم کو کھڑے ہو کر پینے کی تفصیل

اب زمزم جو کھڑے ہو کر پیا جاتا ہے، تو واقعہً زمزم کھڑے ہو کر پینا مستحب ہے؟ اس کے آداب میں سے ہے؟ یا صرف جائز ہے؟ تو بعض حضرات علماء اس طرف گئے ہیں کہ زمزم کو کھڑے ہو کر پینا مستحب ہے، چنانچہ احناف میں سے صاحب دُرِّ مختار علامہ علاء الدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ مستحب ہے۔ لیکن اس کی شرح جو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے، انہوں نے اسی موقع پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا صرف جائز ہے، مستحب نہیں۔ اور لکھا ہے کہ کم سے کم کراہت ہی ختم ہو جائے، وہی بڑی بات ہے، چہ جائیکہ علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ استحباب کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمزم جو کھڑے ہو کر نوش فرمایا اس کی وجہ بتلائی ہے کہ حج کے موقع پر جب آپ طواف سے فارغ ہوئے اور زمزم پینے کے لیے تشریف لے گئے تو چوں کہ پانی پلانے کی ذمہ داری حضرت عباس رضی اللہ عنہما - جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے، ان - کی اور ان کے خاندان کی تھی، وہی یہ خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس موقع پر جب میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو زمزم پلایا، تو آپ نے کھڑے ہو کر پیا۔ اس کی وجہ بھی لکھی جاتی ہے کہ وہاں بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں تھی، کنویں سے پانی نکالا جاتا تھا اور پوری جگہ پانی سے تر رہتی تھی، لوگوں کا مجمع بھی زیادہ تھا، اس وجہ سے بیٹھنے کا موقع نہیں ہوتا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر زمزم نوش فرمایا۔

بہر حال! علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ جن کی اسی کتاب سے عام طور پر ہمارے مفتیان کرام فتویٰ دیا کرتے ہیں، اور ہم بھی اسی کتاب کا حوالہ بار بار دیتے ہیں، انہوں نے تو

یہی لکھا ہے کہ زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا صرف جائز ہے، وہ مستحب کے قائل نہیں۔ اور مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ جو ہمارے اکابر میں ہیں، دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی بھی رہے ہیں، بعد میں پاکستان میں بھی مفتی اعظم رہے، ان کا بھی رجحان یہی تھا کہ زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا صرف جائز ہے، مستحب نہیں۔ اس لیے جو لوگ زمزم کو کھڑے ہو کر پینے کا اہتمام کرتے ہیں کہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور جب زمزم آتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کھڑے ہیں اور مل گیا تو کھڑے کھڑے پی لیجئے، لیکن بیٹھے ہیں تو خاص کھڑے ہونے کا اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہاں! جو لوگ اس کو مستحب کہتے ہیں ان کے اعتبار سے کوئی آدمی کھڑے ہو کر پئے؛ تو گنجائش ہے۔ لیکن اگر کوئی آدمی کھڑے ہو کر نہیں پیتا، تو ہمارے یہاں اس کا اتنا زیادہ رواج ہو گیا ہے کہ سارے لوگ اُسے گھورتے ہیں، جیسے اس نے کوئی بڑا حبرم کر دیا ہو؛ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ میں نے یہ پوری وضاحت اس لیے کر دی تاکہ مسئلہ کی نوعیت معلوم ہو جائے، اور مسئلہ صاف ہو کر سامنے آجائے۔

اور زمزم کو کھڑے ہو کر پینے کی دوسری وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ زمزم جتنا زیادہ پیا جائے گا؛ اتنا ہی پسندیدہ ہے، اور اس کی ترغیب بھی دی گئی ہے، اور کم پینا منافق کی علامت بتلایا گیا ہے، اس لیے کھڑے ہو کر پیئیں گے تو زیادہ پیا جائے گا۔ بہر حال! زمزم کو کھڑے ہو کر پینے کی اجازت کے اندر کوئی کلام نہیں۔

وضو کا بقیہ بھی کھڑے ہو کر پی سکتے ہیں

اور دوسرا وضو کا بچا ہوا پانی ہے۔ جیسا کہ روایت پیش کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ کوفہ کے چوک میں وضو کیا۔ پھر فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح

کرتے ہوئے دیکھا جیسا کہ تم نے مجھے کرتے ہوئے دیکھا۔
تو علماء لکھتے ہیں کہ وضو کے بچے ہوئے پانی میں اللہ تعالیٰ نے شفاء رکھی ہے۔
شیخ عبدالغنی نابلسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں جب کبھی بیمار ہوا اور میں نے اس کا اہتمام کیا
کہ وضو کے بچے ہوئے پانی کو کھڑے ہو کر اس نیت سے پیا کہ اللہ تعالیٰ مجھے شفاء
دے، تو مجھے شفاء ہو گئی۔

تو یہ دو پانی ہیں: زمزم اور وضو کا بچا ہوا؛ جن کو کھڑے ہو کر پی سکتے ہیں۔

کھڑے ہو کر کھانا پینا؟

۶۹:- وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: کُنَّا عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ نَأْكُلُ

وَنَحْنُ نُمِشِي، وَنَشْرَبُ وَنَحْنُ قِيَّامٌ۔ (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ

میں ہم چلتے ہوئے کھالیا کرتے تھے، اور کھڑے ہوئے پی لیا کرتے تھے۔

افادات:- کھڑے ہو کر پینے کے سلسلہ میں تو پوری وضاحت کے ساتھ

بتلا دیا کہ یہ جائز ہے، لیکن خلافِ اولیٰ ہے۔ اور اگر بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نہیں ہے
تو اس صورت میں اس کو خلافِ اولیٰ بھی نہیں کہیں گے۔

اور دوسری بات اس روایت میں بتلائی کہ چلتے ہوئے کھالیا کرتے تھے تو

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت آگے آنے والی ہے کہ ان سے کھڑے ہو کر کھانے کے
متعلق پوچھا گیا تھا تو انہوں نے اس کو برا عمل بتلایا ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ عام طور پر جو کھانا اہتمام کے ساتھ کھایا جاتا ہے کہ اس

کے لیے دسترخوان وغیرہ بچھاتے ہیں اور مقررہ اوقات کے کھانے ہوتے ہیں، تو وہ تو

کھڑے ہو کر کھانے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن کوئی ایسی چیز جس کو کھڑے ہو کر کھانا عیب نہیں سمجھا جاتا، جیسے چاکلیٹ، دانے چنے، پان وغیرہ؛ کہ آدمی چلتے چلتے کھالیا کرتا ہے؛ تو اس کی اجازت ہے۔ باقی اپنے مقررہ اوقات کا کھانا، جس کو ہم لُچ اور ڈنر، ”خُذْ آء“ اور ”عَشَاء“ کہتے ہیں تو وہ چلتے چلتے کھانے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔

آج کل ایک نیا سسٹم اور طریقہ بونے والا چلا ہے، شادیوں کے موقع پر ٹیبلوں کے اوپر سب کھانے رکھ دیئے جاتے ہیں، اور لوگ اپنی پلیٹ میں لے کر کھڑے کھڑے اور چلتے پھرتے کھا لیتے ہیں؛ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔

۷۷۰:- وعن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جَدِّهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ :

رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَشْرِبُ قَائِمًا وَقَاعِدًا. (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا یعنی حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو کھڑے کھڑے بھی اور بیٹھ کر بھی پیتے ہوئے دیکھا۔

۷۷۱:- وعن أنس بن مالك رضي الله عنه عن النبي ﷺ: أَنَّهُ نَهَى أَنْ يَشْرَبَ الرَّجُلُ

قَائِمًا قَلَّ قِتَادَةُ قُلُوبِ الْأَنْسِ بِالْأَكْلِ؛ قَالَ: بِذَلِكَ أَشْرُؤُا وَخَبَثُ (رواه مسلم)

وفي رواية له:- أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ زَجَرَ عَنِ الشُّرْبِ قَائِمًا.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کھڑے کھڑے پانی پینے سے منع فرمایا۔ اس روایت کو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرنے والے حضرت قتادہ جو تابعی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ کھڑے کھڑے کھانے کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: یہ تو اور زیادہ برا ہے (یعنی کھڑے ہو کر تو بالکل کھانا نہیں ہونا چاہیے)۔

اور دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر پانی پینے پر تنبیہ فرمائی، اور اس سے منع فرمایا۔

۷۷۲:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: لَا يَشْرَبُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْكُمْ قَائِمًا، فَمَنْ نَسِيَ فَلْيَسْتَقِءْ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی آدمی کھڑے کھڑے پانی نہ پئے، اور اگر کسی نے بھول سے کھڑے ہو کر پی لیا تو اس کو قے کر دے۔

افادات:- مسئلہ کی تفصیلی وضاحت کر چکا ہوں کہ کھڑے کھڑے پینا خلافِ اولیٰ ہے، جس کو مکروہِ تنزیہی کہتے ہیں یعنی ادب کے خلاف ہے۔

استحباب کون ساقی القوم آخر ہم شرباً

پلانے والا خود اخیر میں پئے

ایک اور ادب بتلار ہے ہیں کہ اگر کوئی آدمی پانی یا اور کوئی مشروب دوسروں کو پلارہا ہو، تو ادب یہ ہے کہ خود اخیر میں پئے۔ آج کل تو لوگ اپنا پہلے ہی نکال لیتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں کرنا چاہیے، ادب یہ ہے کہ پہلے سب کو پلا دو، اخیر میں خود پیو۔

۷۷۳: - عن أبي قتادة رضي الله عنه عن النبي ﷺ قَالَ: ساقِي القوم آخرهم شرباً. (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے نقل فرماتے ہیں کہ لوگوں کو پلانے والا اخیر میں ہوتا ہے (یعنی اخیر میں پیا کرتا ہے۔)

ایک واقعہ

افادات:- پہلے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت گزر چکی ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے ان کو راستہ میں پڑا ہوا دیکھا، انہوں نے کئی وقت سے کھانا نہیں کھایا تھا جس کی وجہ سے ایک دم نڈھال تھے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں سے گزرے تو انہوں نے ان سے کوئی آیت پوچھی۔ مقصد یہ تھا کہ سوال کے نتیجہ میں میرے حال کا ان کو کچھ پتہ چل جائے گا اور جواب دیتے ہوئے اپنے ساتھ لے جائیں گے اور کچھ کھلا بھی دیں گے، لیکن وہ تو جواب دے کر آگے بڑھ گئے۔ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گزرے تو ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ پھر نبی کریم ﷺ تشریف لائے۔ حضرت

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: مجھے دیکھ کر سمجھ گئے اور مسکراتے ہوئے فرمایا: ابو ہریرہ! میں نے کہا: جی ہاں۔ فرمایا: چلو۔ اپنے ساتھ لے چلے، آپ ﷺ گھر کے اندر تشریف لے گئے تو یہ بھی اجازت لے کر داخل ہوئے۔ گھر والوں سے پوچھا: کچھ ہے؟ بتلایا گیا کہ فلاں جگہ سے ہدیہ میں دودھ آیا ہے۔ آپ ﷺ کا معمول تھا کہ کوئی چیز اگر صدقہ کے طور پر آتی تو اس کو اصحاب صفہ کے پاس بھیج دیا کرتے، اور اگر ہدیہ کے طور پر کچھ آتا تو ان کو بلا لیا کرتے اور خود بھی شریک ہو جاتے۔ جب گھر والوں نے دودھ کا پیالہ دیا تو حضور ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: اصحاب صفہ کو بلا لاؤ۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں اپنے دل میں سوچنے لگا کہ پیالہ میں دودھ ہی کتنا ہے! یہ تو میرے لیے ہی کافی نہیں ہے، اور ان کو بلانے کے لیے بھیج رہے ہیں، پھر جب میں بلا کر لاؤں گا تو مجھے ہی کہیں گے کہ تقسیم کرو، پھر تو میرے حصے میں کیا بچے گا؟ لیکن جب حضور اکرم ﷺ کا ارشاد تھا تو اس پر عمل کیے بغیر چارہ کار بھی نہیں تھا، اس لیے گئے اور بلا کر لائے۔ جب اصحاب صفہ آ کر بیٹھے تو جیسا سوچا تھا اسی کے مطابق حضور ﷺ نے فرمایا: ابو ہریرہ! سب کو پلاؤ۔ اب وہ باری باری سب کو دے رہے ہیں اور وہ پی کر واپس کر رہے ہیں۔ جب سب کو پلا چکے تو اخیر میں انہوں نے وہ پیالہ نبی کریم ﷺ کے دست مبارک میں دیا، آپ ﷺ نے وہ پیالہ اپنے دست مبارک میں رکھ کر فرمایا: ابو ہریرہ! اب تو میرے اور تمہارے علاوہ کوئی باقی نہیں رہ گیا؟ حضرت ابو ہریرہ نے کہا: جی ہاں! اے اللہ کے رسول۔ تو پھر مجھ سے فرمایا: اچھا لو! اور اب تم پیو۔ میں نے خوب سیر ہو کر پیا۔ پھر فرمایا: اور پیو۔ میں نے پیا۔ پھر فرمایا: اور پیو۔ میں اور پیا۔ فرمایا: اور پیو، یہاں تک کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اب تو اندر جانے کا راستہ نہیں، پھر اخیر میں نبی کریم ﷺ نے نوش فرمایا۔ تو یہ بھی آداب میں سے ہے۔

باب جواز الشرب من جميع الأواني الطاهرة غير الذهب والفضة وجواز الكرع - وَهُوَ الشرب بالفم من النهر وغيره بغير إناء ولا يد - وتحريم استعمال إناء الذهب والفضة في الشرب والأكل والطهارة وسائر وجوه الاستعمال

ترجمة الباب

ہر قسم کے پاک برتن میں پینے کا جائز ہونا سوائے سونے اور چاندی کے۔ کوئی بھی برتن؛ چاہے لکڑی، مٹی، چینی، تانے، پیتل یا لوہے کا بنا ہوا ہو؛ اس کا استعمال جائز ہے۔ ہاں! سونے اور چاندی کے برتن میں کوئی چیز کھانے یا پینے کی اجازت نہیں ہے، اس کے علاوہ کوئی برتن اگر پاک ہے تو اس کے اندر کھانے اور پینے کی اجازت ہے۔

ایک بات تو یہ ہوئی۔

دوسری بات یہ بتلاتے ہیں کہ کوئی آدمی پانی میں منہ ڈال کر براہ راست پیئے۔ ایک طریقہ تو ہے کہ پانی کسی برتن میں لے کر پینا۔ دوسرا طریقہ ہے کہ پانی ہاتھ اور چٹو میں لے کر پینا۔ اور تیسری شکل یہ ہے کہ پانی کسی نہریا تالاب اور حوض میں ہے اور اس میں سیدھا منہ ڈال کر پینا، جیسے: جانور منہ ڈال دیتا ہے، جس کو عربی میں ”کَرَع“ کہتے ہیں؛ یہ بھی جائز ہے، اس طرح بھی پی سکتے ہیں، نبی کریم ﷺ سے اس طرح پینا ثابت ہے۔ اور تیسری بات یہ بتلاتے ہیں کہ کھانے پینے اور طہارت حاصل کرنے اور دوسرے تمام استعمالات میں سونے چاندی کے برتنوں کا حرام ہونا۔ یعنی سونے چاندی کے برتن نہ تو کھانے پینے کے لیے، اور نہ کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں، جیسے: استنجاء کا لوٹنا بنا کر اس میں پانی بھر کر استعمال کرنا، یا کسی اور کام میں استعمال کرنا، جیسے: سونا چاندی کی سرمہ دانی، قلم وغیرہ؛ تو یہ سب بھی جائز نہیں۔

یہ غلط فہمی نہ رہے

سونے اور چاندی کے زیور کا استعمال عورت کے لیے جائز ہے، مرد کے لیے نہیں۔ چاندی کی انگوٹھی اگر ساڑھے تین ماشہ سے کم کی ہے؛ تو مرد کے لیے اس کے پہننے کی اجازت ہے، لیکن سونے کی بالکل جائز نہیں۔ سونے چاندی کے زیورات کے علاوہ اور کوئی بھی چیز جیسے برتن وغیرہ ہو؛ تو اس کی نہ تو مردوں کے لیے استعمال کی اجازت ہے، نہ عورتوں کے لیے۔ عورتوں کو بھی جو اجازت ملی ہے وہ فقط زیورات کی ملی ہے۔ اس لیے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ عورتوں کو سونے چاندی کے زیورات کی اجازت ہے تو ان کے لیے دوسری چیزیں برتن وغیرہ کی بھی اجازت ہوگی، عورتیں بھی زیورات

کے علاوہ کسی اور استعمال میں نہیں لاسکتیں۔

پتھر کے برتن کا استعمال

۷۷۴:- وعن أنس رضي الله عنه قال: حضرَ بِلَالٌ مَلَأَهُ، فَقَامَ مِنْ كَانَ قَرِيبَ الدَّارِ إِلَى أَهْلِهِ، وَبَقِيَ قَوْمٌ، فَأَتَى رَسُولَ اللَّهِ ﷺ بِمُخَضَّبٍ مِنْ حِجَارَةٍ، فَصَغَرَ الْمُخَضَّبُ أَنْ يَبْسُطَ فِيهِ كَفَّهُ، فَتَوَضَّأَ الْقَوْمُ كُلُّهُمْ. قالوا: كَمْ كُنْتُمْ؟ قَالَ: ثَمَانِينَ وَزِيَادَةً. متفق عليه، هذه رواية البخاری.

وفی روایة لَهُ وَلِمسلم:- أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَعَا بِإِنَاءٍ مِنْ مَاءٍ، فَأَتَى بِقَدَحٍ رَحْوًا فِيهِ شَيْءٌ مِنْ مَاءٍ، فَوَضَعَ أَصَابِعَهُ فِيهِ. قَالَ أَنَسٌ: فَجَعَلْتُ أَنْظُرَ إِلَى الْمَاءِ يَنْبُعُ مِنْ بَيْنِ أَصَابِعِهِ، فَخَرْتُ مَنْ تَوَضَّأَ مَا بَيْنَ السَّبْعِينَ إِلَى الثَّمَانِينَ.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نماز کا وقت آیا، جن کے مکانات قریب تھے وہ تو اپنے گھروں پر وضو وغیرہ کی ضرورت پوری کرنے کے لیے پہنچ گئے، کچھ لوگ رہ گئے جن کے مکانات قریب نہیں تھے۔ نبی کریم ﷺ کے پاس پتھر کا ایک برتن لایا گیا جس میں بہت کم پانی تھا، اور وہ برتن اتنا بڑا بھی نہیں تھا کہ کوئی آدمی اس میں سے چلو بھر سکے۔ نبی کریم ﷺ نے اس میں ہاتھ ڈال دیا اور سب لوگوں نے اس پانی سے وضو کیا۔ پوچھا: کتنے آدمی تھے؟ تو بتلایا: اسی (۸۰) سے کچھ زیادہ آدمی تھے۔

دوسری روایت مسلم شریف میں ہے جس میں یہ ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے برتن میں پانی منگوا یا، تو ایک پیالہ لایا گیا جو زیادہ گہرا نہ تھا (جو برتن گہرا نہ ہو اس کو ”رَحْوًا“ کہتے ہیں) اس میں تھوڑا سا پانی تھا، نبی کریم ﷺ نے اپنی انگلیاں مبارک اس میں رکھ دیں، تو انگلیوں کے اندر سے پانی پھوٹنے لگا، اور ستر (۷۰) سے اسی (۸۰) کے درمیان لوگوں نے اس پانی سے وضو کیا۔

افادات:- گویا اس چھوٹے سے برتن میں جو پانی تھانی کریم ﷺ کا یہ معجزہ ہوا کہ آپ کی برکت سے اس میں اتنی زیادتی ہو گئی کہ سب نے اس سے وضو کر لیا یہاں تو صرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ: دیکھو! وہ برتن پتھر کا تھا۔ معلوم ہوا کہ پتھر کے بنے ہوئے برتن کو بھی استعمال کر سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ پاک ہو۔

پیتل کے برتن کا استعمال

۷۷۵:- وعن عبد الله بن زيد رضي الله عنه قال: أتانا النبي ﷺ فأخْرَجَنَا لَهُ مَاءً فِي تَوْرٍ مِنْ صُفْرٍ فَتَوَضَّأَ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہمارے یہاں تشریف لائے، ہم نے پیتل کے ایک پیالہ میں آپ کے لیے پانی نکالا، تو آپ ﷺ نے اس سے وضو فرمایا۔

افادات:- معلوم ہوا کہ پیتل کا برتن بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ البتہ فقہاء فرماتے ہیں کہ پیتل یا تانبے کا برتن ہو، خاص کر تانبے کا ہو: تو اس کو قلعی کرالینا زیادہ مناسب ہے، تاکہ غیروں کی مشابہت لازم نہ آئے۔

نہر میں منھ ڈال کر پینا

۷۷۶:- وعن جابر رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ دَخَلَ عَلَى رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ، وَمَعَهُ صَاحِبٌ لَهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: إِنْ كَانَ عِنْدَكَ مَاءٌ بَاتَ هَذِهِ اللَّيْلَةَ فِي شَنَّةٍ وَالْأَكْرَعُ غَنًا. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک انصاری صحابی کے یہاں تشریف لے گئے، آپ کے ساتھ آپ کے ایک صحابی بھی تھے۔ آپ نے ان سے پوچھا:

اگر تمہارے پاس رات بھر مشکیزہ میں رکھا ہوا پانی ہو تو لاؤ؛ ورنہ تو ہم تمہاری اس چھوٹی سی بہتی ہوئی نہر میں منہ ڈال کر پی لیتے ہیں۔

انادات:- یہ قصہ بخاری شریف اور شمائل میں کچھ تفصیل کے ساتھ موجود ہے، یہاں انہوں نے مختصر کر دیا ہے۔ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ کے اوپر بھوک کا تقاضہ تھا، کچھ وقت سے فاقہ تھا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی حال تھا، وہ باہر آئے تاکہ نبی کریم ﷺ کی زیارت کر کے کچھ تسلی حاصل کریں، حضور ﷺ بھی باہر تشریف لائے، حضور ﷺ نے فرمایا: چلو! فلاں صحابی کے پاس جائیں۔ ایک انصاری حضرت ابوالہشتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کھجوروں کا باغ تھا، وہاں پہنچے، ان کی گھر والی سے پوچھا: وہ کہاں ہیں؟ اس نے بتایا: وہ تو پانی لینے کے لیے گئے ہیں، اتنے میں وہ بھی پہنچ گئے، نبی کریم ﷺ کو تشریف لایا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بار بار عرض کرنے لگے: اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ تشریف لے آئے۔ آپ کو بٹھایا اور جلدی سے بکری کا دودھ دوہا اور پیش کیا۔ کھانے کے لیے بکری ذبح کرنا چاہتے تھے تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو دودھ دیتی بکری ہو وہ مت کاٹنا۔ اس کے بعد انہوں نے کھجوریں لا کر رکھیں۔ اسی موقع کا یہ قصہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: اگر تمہارے پاس رات بھر مشکیزہ میں رکھا ہوا پانی ہو تو لاؤ۔ اس لیے کہ رات بھر مشکیزہ میں رہا ہوا پانی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ ورنہ تو ہم تمہاری اس چھوٹی سی بہتی ہوئی نہر میں منہ ڈال کر پی لیتے ہیں۔ حالاں کہ اس کی نوبت نہیں آئی، لیکن اس سے یہ معلوم ہوا کہ منہ ڈال کر پینا بھی جائز ہے۔ یہاں آپ نے یہ ”کَرَّ عَنَّا“ جو فرمایا کہ ”منہ ڈال کر پی لیتے ہیں“ اسی مناسبت سے اس روایت کو اس باب میں پیش کیا ہے۔

یہ ان کے لیے دنیا میں؛ تمہارے لیے آخرت میں

۷۷۷:- وعن حذيفة بن اليمان رضي الله عنه قال: إن النبي ﷺ نهى أن تأخذ من الماء من تحت يدي يمينك، والشرب في آنية الذهب والفضة، وقال: هي لهم في الدنيا، وهي لكم في الآخرة. (متفق عليه)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ (ایک موقع پر انہوں نے پانی پینے کے لیے منگوا یا، تو آپ کا جو خادم اور غلام مجوسی تھا، وہ چاندی کے برتن میں پانی لے کر آیا، تو حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لے کر اس کے اوپر مارا، لوگوں کو تعجب بھی ہوا، تو حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں پہلے بھی اس کو منع کر چکا ہوں اس کے باوجود اس میں لایا، اس لیے میں نے اس کو مارا، پھر فرمایا: (میں کریم ﷺ نے ہم کو ریشم اور دیبا ج کے پہننے سے منع فرمایا ہے (دیبا ج؛ موٹے قسم کا ریشم ہوتا ہے) اور سونے چاندی کے برتن میں پانی پینے سے بھی منع فرمایا۔ اور فرمایا: یہ ان کے لیے (یعنی غیر مسلموں اور کفار کے لیے) دنیا میں ہے (اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں دنیا میں ان کو دی ہیں، اس لیے وہ استعمال کر لیں) اور تمہارے لیے آخرت میں ہیں۔

جہنم کی آگ اُنڈیل رہا ہے

۷۷۸:- وعن أم سلمة رضي الله عنها: أن رسول الله ﷺ قال: الذي يشرب في آنية الفضة، إنما يجرجر في بطنه نار جهنم. (متفق عليه)

وفی روایت لمسلم: إن الذي يأكل أو يشرب في آنية الفضة، والذهب. وفي رواية له: من شرب في إناء من ذهب أو فضة، فإمّا يجرجر في بطنه ناراً من جهنم.

ترجمہ:- حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی چاندی کے برتن میں پانی پئے؛ گویا وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ اُنڈیل رہا ہے۔

دوسری روایت میں ہے: جو آدمی چاندی اور سونے کے برتن میں کھائے یا پیے۔

ایک اور روایت میں ہے: جو آدمی سونے اور چاندی کے برتن میں پئے، گویا وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ اُنڈیل رہا ہے۔

افادات:- نبی کریم ﷺ نے اتنی سخت وعید ارشاد فرمائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سونے چاندی کے برتن میں کھانا پینا جائز نہیں ہے، اس کے استعمال سے آدمی اپنے آپ کو بچائے۔